مطبوعہ انجمن ترقی اردو

جلد ۶
شمارہ ۱، ۲
• جنوری، فروری سنہ [illegible]
زرِ سالانہ
۹ روپے
ششماہی
۵ روپے
•
عام پرچہ
۱۲ آنے
سالنامہ
دو روپے آٹھ آنے

سالنامہ

شاہراہ

ترتیب دینے والے:-

وامق جونپوری
محمد یوسف

مکتبہ شاہراہ، دہلی

شمارہ

نظمیں

گیت

رفتار

افسانے اور خاکے

زادِ راہ

مشاعرہ

کہانیاں

ڈرامے

غزلیں

مقالے

مکتوبات

پبلشر:۔ منشی عبدالقدیر
پرنٹر:۔ کوہ نور لیتھو پریس، دہلی

راہ نُما

● نئے سال کی نیک خواہشات اور دلی مبارکباد کے ساتھ ہم اپنا سالنامہ آپ کو پیش کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۳ء نے ہمارے ادب کو کیا دیا، اس کے آخری جُرعات یافتوں اور سنہ ۱۹۵۴ء اور اس کے بعد آنیوالا زمانہ ہم کو کیا دیں گے اس کا تشریحی جائزہ آنیوالے دَور کا سایہ آپ کو ان اوراق میں ملیگا۔ باوصف اس کے کہ ہم وہ سب کچھ جو چاہتے تھے آپ کے سامنے نہ لاسکے (جس میں کچھ تو ہمارے قلم پر پابندی اور کچھ ہمارے ادبی کرم فرماؤں کی بے نیازی کارفرما رہی ہے) تاہم اس خاص شمارے سے ہم غیر مطمئن نہیں ہیں۔

شاہراہ ادبی تخلیقات کا محض ماہواری ذخیرہ نہیں رہا ہے۔ بلکہ معرض وجود میں آنے کے بعد سے اب تک ایک اور بہت اہم رول ادا کرتا رہا ہے۔ شاہراہ کے دوسرے فرائض میں سے یہ بھی فرض رہا ہے کہ وہ اِن تربیت شدہ پرانے لکھنے والوں کے قلم کو جھنجھوڑتا رہے اور نئی پود کی مناسب رہنمائی اور ہمت افزائی کرتا رہے۔ راست طریقہ تربیت اختیار کرتے ہوئے ہم نے کبھی کبھی نظریہ مواد اور اسلوب کے معیار سے گری ہوئی چیزیں بھی ضروری نوٹ اور انتباہ کے ساتھ شائع کی ہیں۔ آج ہم اپنے پیش روؤں اور بالخصوص ساحر لدھیانوی کا نام بڑی عزت اور محبت کے ساتھ لے رہے ہیں جنھوں نے شاہراہ کی داغ بیل آج سے چھ سال پہلے رکھی تھی اور اس کو اپنے اس رول کو ادا کرنے کا راستہ دکھلایا تھا۔

● ہم اپنے ان معاصر رسائل اور جرائد کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے ہمارے ادارے کی موجودہ ترکیب کا خیر مقدم کیا ہے۔ ادارہ میں آئے دن کی تبدیلی اچھی نہیں مگر ایسا اگر ہو بھی جائے تو اس کو مالکان رسائل کی مجبوری اور دنیاوی مسائل کی پاسداری پر محمول کرنا بہتر ہوگا۔ ہم خود کسی رسالہ کے مالک کا تنہا ایڈیٹر رہنا جبکہ وہ کسی مکتبہ کا کشیر بھی ہو۔ مالک بھی ہو اس لئے نامناسب سمجھتے ہیں کہ وہ باوجود اچھے ادیب ہونے کے نہ تو ایڈیٹری کو اس کا ضروری وقت دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ اس کی ذمہ داریاں اور فرائض کو پوری طرح انجام دے سکتا ہے۔ اگر رسالہ کو اچھے ادبی معیار پر نکالنا ہے تو اس کا ایڈیٹر ایڈیٹری کے علاوہ دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ اس کا آدھے سے زیادہ وقت تو اس پریشانی اور ادھیڑ بن میں نکل جاتا ہے کہ فلاں ادیب نے باوجود حتمی وعدہ کے ابھی اپنی کہانی نہیں بھیجی، رسالہ مطبع کیونکر جائیگا فلاں ادیب نے جو مضمون بھیجا ہے وہ بیحد طویل ہے۔ کہانی کے لئے جگہ چھوٹی ہوئی ہے اور مضمون مناسب تخفیف کے ساتھ شائع ہوگا۔ چٹھیاں وچٹیاں اور یہ سب ذہنی الجھن پیدا کرنیوالی باتیں بڑی وقت خور ہوتی ہیں۔ ادارت کے پیاسے فرائض کو تگّے سے پانی نہیں پلایا جاسکتا اور ہم اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے والوں کا احترام کرتے ہیں۔

● گذشتہ دو مہینے ہندوستان کے تہذیبی ماحول کے لئے بہت خوشگوار اور امید افزا گذرے ہیں چینی ثقافتی وفد کی آمد نے ہمارے ملک کے ادیبوں، مصوّروں، صحافیوں اور دوسرے فنکاروں کو یکجا ہوجانیکا بڑا اچھا موقع دیا۔ اس وفد نے پورے ملک کا دورہ بھی کیا اور وہ فنکار جو دہلی نہ آسکے تھے چینی فنکاروں سے مل سکے۔ اس طرح ہندچینی دوستی ایک قدم اور آگے بڑھی اور ایک دوسرے کی تہذیب کو تبادلے کا موقع جو کسی بھی ملک کی تہذیبی ترقی کے لئے ضروری ہے ملا۔

ابھی یہ وفد چین واپس جا ہی رہا تھا کہ دہلی میں لالہ شنکر لعل مُرلی دھر میموریل ٹرسٹ کی طرف سے ایک ہندپاک مشاعرہ ہوا۔ دونوں ملکوں کے بچھڑے ہوئے ادیب ایک دوسرے سے ملے۔ نظم و نثر میں اپنے اپنے دل کے حالات ایک دوسرے سے کہے۔ چار پانچ دن میں بڑے چھوٹے چار کئی مشاعرے ہوگئے۔ ہندوستانی عوام نے اپنی اُردو دوستی کا بھرپور مظاہرہ کیا جن کے دیکھنے سے دو باتیں پوری طرح ثابت ہوگئیں کہ ہندوستان میں اردو کبھی نہیں مر سکتی اور دو پڑوسی ملکوں کے ناخوشگوار تعلقات کو ہموار کرنے کے لئے ان ملکوں کے ادیب اور فنکار ہی حکومتوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ بظاہر یہ دعویٰ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر جن کو یہ معلوم ہے کہ عوام اپنے ادیبوں سے کس قدر پیار کرتے ہیں اُن پر کتنا بھروسہ رکھتے ہیں اور

غدار قوم کی زبان mouth piece بن جاتا ہے ان کے لئے یہ بات محل استعجاب نہ ہوگی۔ اسی ضمن میں ایک بہت بڑی غلط فہمی بلکہ پریس کی غلط بیانی کا صاف کر دینا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دہلی کے اس بڑے مشاعرہ میں ہندوستان کے کسی شاعر پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ اس نے پاکستان کے خلاف کوئی مصرع بھی پڑھا تھا۔ اس الزام کی صفائی پاکستانی صفارت خانہ خود کر چکا ہے۔ ہم کو افسوس آتا ہے جب ہم اب بھی کبھی اردو جریدہ کو اس قسم کی بے بنیاد خبروں کو اچھال کر حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے اور عوام کے جذبات سے کھیلنے کی نازیبا کوشش میں مبتلا پاتے ہیں۔ رہا ادیب کا اپنی حکومت پر نکتہ چینی اور سخت سے سخت الفاظ میں اس کی غلطیوں پر اس کو ناکارہ کہنا تو ایک شہری کی حیثیت سے اس کا یہ پیدائشی اور آئینی حق ہے۔ کسی ادیب کے اس فعل پر اس کی حکومت یا کسی فرد کا اسے غدار کہنا سادہ لوحی یا لاعلمی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

اقوام اور ممالک کی تمدنی ترقی کے لئے جہاں اس قسم کے وفدوں کا آنا ضروری ہے وہاں کاروباری سطح پر کتابوں کی درآمد برآمد اس سے زیادہ اہم ہے۔ اس سلسلہ میں ہر دو حکومت کی بے اعتنائی نامناسب ہے۔ جب دوسرے کاروباری سمجھوتے ممکن ہیں تو کتابوں نے کیا قصور کیا ہے۔ شاید یہ خوف ہو کہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کی کتابیں پڑھکر زیادہ باشعور نہ ہو جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان حکومتوں کو اس طرف جلد از جلد توجہ کرنی چاہیئے۔

● ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ ادبی رسالے اور بالخصوص ترقی پسند رسالے حکومتوں کی بیجا سختی کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ قصور ان کا صرف اتنا ہے کہ ان میں ایسا ادب ہوتا ہے جس میں حکومتوں اور برسر اقتدار پارٹیوں کے خلاف کڑی تنقید ہوتی ہے۔ ابھی مغربی پنجاب کی حکومت نے معاصر "فنکار" دہلی پر اس لئے پابندی عاید کر دی ہے کہ اس میں ابراہیم جلیس کی "اوٹ پٹانگ" کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی میں حکمراں پارٹی اور حکمراں طبقہ پر طنزیہ انداز میں نکتہ چینی کی گئی ہے مگر حکومت یا حکمراں پارٹی پر تنقید کوئی جرم نہیں۔ برخلاف اس کے اگر کسی ملک یا قوم کے خلاف کچھ لکھا جائے تو لکھنے والا اس ملک و قوم کا غدار اور مجرم ہو سکتا ہے۔ مگر حکومت اور اسٹیٹ کو ایک ہی چیز سمجھ لینا فلسفۂ سیاسیات کے بنیادی اصولوں کو جھٹلانا ہے۔ اس لئے ہم حکومت مغربی پنجاب سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے "فنکار" دہلی کو اپنے عتاب سے بری فرمائیے۔

● یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اردو کے ادبی رسالوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے اور اس کی ضرورت بھی ہے مگر ادھر کچھ دنوں سے چند پرانے اور معیاری رسائل کے "ٹائٹل پیج" کو دیکھکر ذہن و نظر کو بڑی کوفت بھی ہوئی۔ نقش و نگار اور رنگ آمیزی اگر لطیف انداز میں ہو خواہ کیوبزم اور امپریشنزم کے لئے بھی بہت ضروری ہے تو تصویر حسین ہو جاتی ہے مگر ان نمونوں میں وہ مناسب توازن خد و خال کا احساس اور رنگ آمیزی کی لطافت بالکل مفقود ہے۔ بھدّے نقش و نگار اور گہرے رنگوں کی یکتائی ہرگز جدید فن مصوّری نہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل کتابوں کے گرد پوش کچھ گندے اور فحش قسم کے بنتے تھے۔ ادھر پھر اسی طرح کے ناقابل قبول گرد پوش آنے لگے ہیں جن سے آرٹسٹ میں علاوہ جنسی تلذذ کی خواہش کے اور کسی بات کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر چاہیں تو ناشرین اس کو یک لخت روک سکتے ہیں۔

● چند جلے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی ڈائجسٹوں کے متعلق کہ ایسے ماہواری یا دو ماہی انتخابات بہت مفید ہیں۔ کم پیسے والے قاری کے لئے ایسے رسالے تو نعمت ہیں۔ عام طور پر آج نچلے متوسط طبقہ کا آدمی مہینے میں ایک سے زیادہ رسالہ نہیں خرید سکتا اس لئے عوام کی اقتصادی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم ان سستے دام کے انتخابات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ان ادبی ڈائجسٹوں کو ان کی ایک کوتاہی کی طرف سے آگاہ بھی کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے انتخابات میں اعتراف Acknowledgement کو یکقلم ترک کر بیٹھے ہیں۔ ان کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ منتخب شدہ ادب پاروں کے سامنے ادیب کے ناموں کے ساتھ ان رسالوں کا بھی حوالہ دیا کریں جن سے وہ حاصل کئے گئے ہیں۔

● آخر میں ہم کو یہ اعلان کرتے ہوئے بیحد مسرت ہو رہی ہے کہ انجمن ترقی اردو کا وفد ساڑھے بیس لاکھ سے اوپر ہالنوں کے

دستخطوں کے ساتھ صدر جمہوریہ کے پاس چند ہی دنوں میں یہ توجہ نامہ کو لے کر جانے والا ہے کہ اُردو کو یو۔پی کی علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ ہم اس تحریک کے خوشگوار نتائج سننے کے لئے بہت بے چین ہیں۔ اس توجہ نامہ پر دستخطوں کو دیکھنے سے صدر جمہوریہ اور ارباب حکومت پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یو۔پی میں کم از کم ایک کروڑ یا کچھ اُس سے زیادہ ہی ہندوستانیوں کی تعداد ایسی ہے جو بغیر تفریق مذہب و ملت اُردو کو اپنی مادری زبان سمجھتی ہے اور بولتی ۔ مگر آج عدالتوں میں اور سرکاری دفتروں میں خود ان کو اور اسکولوں و کالجوں میں ان کے بچوں کو اپنی مادری زبان سیکھنے میں جو دشواریاں جھیلنی پڑ رہی ہیں اس کا اندازہ صرف وہی لگا سکتے ہیں جو موجودہ اُردو دشمنی کے شکار ہو رہے ہیں۔ ہندی سے اُردو کا کوئی بیر نہیں اور ہر شہری کو ہندی بحیثیت راشٹر بھاشا کے سیکھنی چاہیئے مگر کسی فرد سے اُس کی مادری زبان کے بولنے لکھنے اور پڑھنے کا حق چھینا بھی نہیں جا سکتا۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ صدر جمہوریہ غیر جمہوری اور تخریبی عناصر سے متاثر ہوئے بغیر یو۔پی میں اُردو کو اس کا آئینی حق دیں گے۔

○

زمیں محور پہ ٹھہری ہے نہ اپنی زندگی ٹھہری
اگر ٹھہری زمانے میں کوئی شے تو بُری ٹھہری

○

اس انجمن گل میں

● اس سالنامہ میں جو کچھ ہے وہ آپ کے سامنے ہے ـــــ اور پڑھنے والے اس کے متعلق خود اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ جو باتیں اس کو ممیز بناتی ہیں صرف انہی کی طرف یہاں اشارہ مقصود ہے۔ پہلے حصہ میں اٹھائیس نظمیں ہیں۔ جس میں تقریباً اٹھارہ جوش۔ ندیم اور جذبی ایسے کہنہ مشق شاعروں کی ہیں۔ باقی دس بالکل نوخیز شعرا کی تخلیقات ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں قاضی عبدالستار نے اپنی نظم "گومتی کی آواز" پیش کر کے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔ پردیز شاہدی پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں ان کی نظم "ہم جوان ہیں" ان کے زبان و بیان کی پاکیزگی اور اسلوب کے نکھ سکھ پر پوری طرح دلالت کرتی ہے۔ کیف بھوپالی اور حسن نعیم کی بھی نظمیں اپنی جانب توجہ مبذول کرتی ہیں۔ گیت سب کے سب اچھے ہیں اور نئے شاعروں کے ہیں۔ "بات سنو" رضیہ سجاد ظہیر کی شاید یہ تیسری کوشش ہے اس لئے ہم اس کی پختگی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

● رفتار کی تحت میں دو نظمیں اور دو منثور ترجمے شامل ہیں۔ چینی شاعر یوان شوئے پو اور سردار کی نظموں کی اہمیت منسلکہ نوٹ سے ظاہر ہے۔ ترکی اور بنگالی نظم کے ترجمے درآنحالیکہ نثر میں ہیں۔ مگر ان کی افادیت نے ہم کو اشاعت پر مجبور کر دیا۔

● افسانوں میں "سات پیسے" منگریں کہانی نئے لکھنے والوں کے لئے مواد اور ہیئت کے اعتبار سے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریاض روفی کا افسانہ "اپنا گھر" ریاض کے پختہ فنی اور سیاسی شعور کی بھرپور آئینہ داری کرتا ہے۔ نئے لکھنے والوں میں انجم رحمانی کا "سائے" اقبال احمد کا "تضاد" اور غیاث گدی کا "چٹان" کافی اچھے افسانے ہیں اور ان کے لکھنے والوں سے آئندہ ترقی کی توقعات پیدا ہوتی ہیں۔

● ڈرامہ "میاں بیوی" چینی عوامی تھیٹر کے ممبران کی مشترکہ کوشش (BETWEEN HUSBEND & WIFE) کا ترجمہ ہے۔ اس ڈرامے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بڑے سیدھے سادے گھریلو انداز میں پیش کیا گیا ہے نظریاتی اور زن و شو میں خوش گوار تعلقات پیدا کرنے کا پروپیگنڈا بڑے ([illegible]) اور فنکارانہ طریقہ سے کیا گیا ہے کئی لکھنے والوں کی مشترکہ کوشش جب کہ وہ کوئی بڑے ڈرامہ نویس نہ ہوں بالعموم ناکامیاب ہوتی ہے مگر یہ ڈرامہ بہت کامیاب ہے۔

● غزلوں میں بیشتر غزلیں اچھی ہیں اور ان میں نئے اور پرانے شعرا برابر کے حصہ دار ہیں۔

● ہمارا سب سے زیادہ کامیاب حصہ مقالوں اور مکتوبات کا ہے کہنے کو تو صرف چھ مقالے اور چار خط ہیں مگر ان میں کا ہر ایک اپنی تنقیدی اور افادی حیثیت سے بیحد اہم ہے۔ نیا سال نیا سوال میں ظ۔ انصاری اپنی پوری ناقدانہ اور صحافیانہ نگاہ کے ساتھ آتے ہیں ان کا مخصوص لہجہ اور اندازہ بیان و تجزیہ اس ادبی میمورنیڈم میں اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ آیا ہے۔ کہیں کہیں ہم کو ان سے اختلاف ہے۔ جہاں مختصراً کچھ کہنا تھا وہ فٹ نوٹ کی شکل میں دیدیا گیا ہے اور باقی باتیں آئندہ بحث کے لئے چھوڑ دی گئی ہیں۔ سید احتشام حسین کے "جوش کا نظریۂ شاعری" سے ہم کو پورا اتفاق ہے اسی موضوع پر سالنامہ مغرب کراچی میں سلیم احمد صاحب کا مختصر مضمون پڑھ کر افسوس ہوا کہ موصوف نے بغیر اصل کتاب کو پڑھے ہوئے اور بغیر جوش صاحب کی اس "عظیم" نظم کا پس منظر جانے ہوئے اس کو اس قدر سراہا ہے۔ بہرحال سید احتشام حسین کا مضمون ہم کو یقین ہے ہر سمجھ دار پڑھنے والے کو اپیل کرے گا ـــ

شاہراہ

• صابرہ زیدی نے عرصہ دراز کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ ناظم حکمت پر مضمون لکھنے کے بعد آج انھوں نے "اسپین کے عوامی شاعر" لورکا کو ہم سے متعارف کرایا ہے اور سارا اردو پڑھنے والوں میں لورکا اس تعارف کا مستحق ہے۔

• امید ہے کہ پکاسو پر عبید الحق کا مضمون بھی کافی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ عبید الحق خود ایک نوجوان آرٹسٹ ہے اور آرٹ کرٹیک بھی اور آج کل امریکہ میں ماڈرن آرٹ پر مزید تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ پکاسو کی تین بہت مشہور تصویروں کے چربے جو اس شمارے میں دیئے گئے ہیں مضمون سے متعلق ہیں۔

• ممتاز حسین کا مضمون "افسانوی کردار" اپنی نوعیت کا پہلا مضمون ہے اور تنقیدی ادب میں ایک اضافہ۔

• سردار جعفری کے لکچر میں ہندی اردو کے جھگڑے کو سمجھانے اور سلجھانے کا انداز بڑا عالمانہ ہے سردار نے جس تحقیق اور تدقیق سے یہ لکچر تیار کیا ہے اس کے لئے ہم ان کو مبارک باد دیتے ہیں۔

• مکتوبات کے سلسلہ میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کافی مفید اور دلچسپ ہیں۔ امید ہے کہ ہم اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔

• ہم ان ادیبوں مثلاً کرتار سنگھ دگل، نکر تونسوی، وارث حسین علوی وغیرہ سے شرمندہ ہیں جن کی تحقیقات ہم کاتب کی ستم ظریفی کی وجہ سے اس شمارے میں شامل نہ کر سکے۔ اس شرمندگی کو دور کرنے کے لئے ہم شاہراہ کے مارچ کے شمارے کو سالنامہ ہی کا ایک جز بنا کر پیش کرنے والے ہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ جنوری فروری اور آنے والے مارچ کے شماروں کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم سمجھیں۔

صرف ایک نظر

آپ کی خریداری کی مدت ماہ فروری ۵۴ء سے ختم ہو۔ آپ کے نام گشتی مراسلہ بھی روانہ کیا جا رہا ہے ذیل کے نمبروں میں اگر آپ کا خریداری نمبر بھی ہو تو اپنا سالانہ چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر شکر گزار فرمایئے۔ یا پھر اپنی خواہش سے مطلع کیجئے۔ اگر آپ نے خاموشی سے کام لیا تو ماہ مارچ ۵۴ء کا شمارہ بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ اور اس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منتظر کرم

مینجر۔ شاہراہ ۔ دہلی

۹ - ۱۱۰ - ۱۳۴ - ۱۳۶ - ۱۳۷ - ۱۳۸ - ۱۴۲ - ۱۵۶ - ۱۶۲ - ۳۵۷ - ۳۵۸ - ۳۷۲ - ۳۴۵ - ۳۷۶ - ۳۷۹ - ۳۸۶
۴۱۲ - ۴۱۳ - ۴۱۴ - ۴۱۵ - ۴۱۹ - ۴۲۰ - ۴۲۵ - ۴۳۶ - ۴۵۴ -

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

چین ہند دوستی وفد دہلی میں صدر کے ساتھ

اوپر—گوئرنکا عمل پکاسو ۱۹۳۷

داھنے—برسونج عمل پکاسو ۱۹۱۰

نیچے—عبدالحق (مضمون اندر)

ماں اور بچہ—عمل پکاسو ۱۹۰۱

ڈاکٹر ملک راج آنند

پریم ناتھ پردیسی

ط۔ انصاری

اختر انصاری اکبرآبادی

جگن ناتھ آزاد

قتیل شفائی

شرر فتحپوری

شہاب جعفری

فارغ بخاری

سلیمان ادیب

راہی غازیپوری

رضا ہمدانی

جوش ملیح آبادی

سحر جگمگائی

فضا پر وہ دیکھو سحر جگمگائی — وہ سلمے ستارے کی اوڑھے دلائی

دماغِ رسا ارغنوں لے کے جھوما — دلِ مبتلا نے پکھاوج اٹھائی

تخیل میں شب کا دیا جھلملایا — رگ و پے میں ٹھنڈی ہوا سنسنائی

وہ گاتے پرندوں نے شاخیں جگائیں — چمن چہچہایا ندی گنگنائی

چلے نیند میں کوئی تو خیر جیسے — کچھ اس طرح انگڑائی موجوں کو آئی

مہ و نجم پر خواب کا رنگ پھیلا — گل و برگ میں تازگی کسمسائی

عبیر و گلال آسمانوں سے برسے — زمیں کی ترنگوں نے ہولی منائی

بہ ناز و ادا چاند کا طوق اترا — فرشتوں نے مشرق کی مسند بچھائی

دبے پاؤں آکر جو چوما صبا نے — شگفتہ نسرین کی مسکرائی

زمیں کا ہوا رنگ سے غسلِ صحت — فلک کی [illegible] سے بتائی

زمیں پر چھڑے نغمہ ہائے عروسی — فلک پر بجی بربطِ کدخدائی

شہلاہ

زمیں کو ملا طرۂ عشوہ کاری
فلک پر کھلا غرفۂ دل ربائی

چمن گونج اٹھا بلبلوں کی صدا سے
نقاب اپنے مکھڑے سے گل نے اٹھائی

سیاہی سے ابھریں گلابی سی موجیں
مسکتی قبا میں فضا رسمسائی

کلی نے کہا اوس سے گڑگڑا کر
نہ چلدی بڑھا نا مرادو دہائی

صبا نے جوانی کو یوں گدگدایا
حسینوں نے منہ سے الٹ دی رزائی

جو کو کو سے چونکی اک الھڑ تو بولی
اُڑے کلموئی نیند میری اڑائی

گل افروز مکھڑے پہ چھٹکا کے زلفیں
در صبح پر شب کی چلمن گرائی !

جوبن تن کے انگڑائی بھرپور چٹکی
گھمایا جو کنگن تو مڑ کی کلائی

افق کی سیاہی نے مستی چھڑا کر
تکلف سے ہونٹوں پہ سرخی رچائی

نکلات کی تنگ چولی میں لچکا
دھندلکے نے ہیرے کی پیٹی لگائی

ہواؤں نے چاندی کا طاؤس چھیڑا
فضاؤں نے سونے کی تھالی بجائی

مبارک ہو اے جوشؔ قصرِ سحر میں
یہ انجم فروشی یہ خاور نمائی

•

احمد ندیم قاسمی

دو نظمیں

(۱)

قدموں کے نقوش ہوں کہ بکھر کر قبروں کے گلاب ہوں کہ بکھر کر

تاریخ کے بولتے نشاں ہیں تہذیب کے سلسلے رواں ہیں

یہ رسمِ جہاں قدیم سے ہے

آدم کا بھرم ندیم سے ہے

(۲)

تم کہتے ہو ڈھل رہا ہے سونا! اس دور میں جل رہا ہے سونا

ماتھوں سے ٹپک رہی ہیں بوندیں ہاتھوں سے نکل رہا ہے سونا

مشرق کی تمازتِ خودی سے

مغرب میں پگھل رہا ہے سونا

•

فارغ بخاری

سحر قریب ہے

لم بلند، عزائم بلند، فکر بلند
میں پستیوں کے تصور سے کتنا دور ہوں آج
نئے چراغ عجب تابناکیاں لائے
کہ مہر و ماہ مجھے پیش کر رہے ہیں آج
زاں کی گود میں مسلا ہوا کنول تھا مگر
بہاریں آج مرا انتظار کرتی ہیں
وہی نگاہیں جو اب تک اڑا رہی تھیں مذاق
مرے جنوں کی روش اختیار کرتی ہیں
وہ دیکھ منزلِ مقصود جگمگاتی ہے
قدم قدم پہ اگرچہ ہے ظلمتوں کا ورود
یہ تند و تار فضائیں یہ بے ثبات نجوم
پیامِ موت ہے ان کے لئے سحر کی نمود
وہ پو پھٹی، وہ اجالا ہوا، سحر جاگی!
ستارے ٹوٹتے ہیں چھٹ رہی ہے تاریکی
کرن کرن سے ملے گی تو نور پھیلے گا
وہ باشعور ہے سمجھی یہ جس نے باریکی

معین احسن جذبی

یہاں

یہاں ہے حفظِ کتب پر مدارِ فضل و کمال
یہاں رسائیٔ فکر و نظر کی قیمت کیا
یہاں ہے عقلِ فرومایہ محوِ سنگ زنی
یہاں جنوں کے گراں مایہ سر کی قیمت کیا
یہاں نہ شعر سناؤ، یہاں نہ شعر کہو
خزاں پرستوں میں گلہائے تر کی قیمت کیا
یہاں دکھاؤ نہ اپنی متاعِ خونِ جگر
خذف پسندوں میں لعل و گہر کی قیمت کیا
یہاں ہے طول کلامی نشر کا سکہ
یہاں مرے سخنِ مختصر کی قیمت کیا
زمانہ سازی کے انداز سیکھ لو جذبی
یہاں خلوص و گدازِ ہنر کی قیمت کیا

لینن ۱؎

حسن اعرافی

یہ پرچم جسکے غم میں خون کے آنسو بہاتے ہیں — وہ لینن جسکی ہم چھبیسویں برسی مناتے ہیں
نہ پیغمبر، نہ خاقاں تھا، نہ اسکندر، نہ دارا تھا — وہ عہدِ نو کی صبحِ سرخ کا روشن ستارا تھا
وہ اٹھا مارکس اور اینگلس کے تعلیمات کو لیکر — عمل پیرا ہوا آویزشِ طبقات کو لیکر

وہ علمی مسئلوں سے آہنی آہنگ تک پہنچا
وہ ہڑتالوں سے بالآخر مسلح جنگ تک پہنچا

جتھا بندی زمانے بھر کے محنت کش گروہوں کی — کتابِ انقلابِ سرخ کی شیرازہ بندی تھی
منظم کر دیا تھوڑے مگر پُر دل جوانوں کو! — دکھائی انقلابی راہ مزدوروں کسانوں کو
نئے نعرے دیئے، نعروں میں ہڑتالوں سے جاں پھونکی — صف آرائی کی حکمت میں نئی چالوں سے جاں پھونکی
ملوں سے غول اندر غول محنت کش نکل آئے — ہوئی ہڑتال پر ہڑتال اور زردار گھبرائے
یہ نقشہ دیکھتے ہی زارِ شاہی بوکھلا اٹھی — وطن اور قوم کی خوں خوار ڈائن ہڑبڑا اٹھی
مگر وہ انقلابی شیر تھے، دھمکی سے کیا ڈرتے — وہ جیلوں، گولیوں اور موت کی پروا بھی کیا کرتے
مؤثر ہو نہیں سکتی تھی لینن کی گرفتاری — کہ رکھتا تھا وہ جیلوں میں بھی اپنا مشغلہ جاری
وہ بیرونِ وطن بھی، انقلابی گیت گاتا تھا — وہ ہر اک موڑ پر آ کر نیا رستہ بتاتا تھا
وہ کہتا تھا کہ میسر ہی نہیں فطرت کا دعویٰ ہے — غریبوں کے دکھوں کا اشتراکیت مداوا ہے
"مگر آساں نہیں ہرگز حصولِ جنتِ ارضی — مسلسل جہد ہے ضامن ہماری کامیابی کی
"مسلسل جنگ ظالم زار کی ہر فتنہ گری سے — مسلسل جنگ ہر اک روپ کی سرمایہ داری سے
"مسلسل جنگ اپنے دیس کے جاگیرداروں سے — مسلسل جنگ ہر اک بھیس میں آدم شکاروں سے
"جو چاہو ختم کرنا ان لٹیروں کی خدائی کو — بدل دو خانہ جنگی میں ہر اک قومی لڑائی کو

"جنم بھومی کی پوجا میں لہو کی چاٹ پنہاں ہے"
"وطن اماں سہی لیکن یہ اماں کس کی اماں ہے"

۱؎ یہ نظم جنوری سنہ ۵۰ء میں لکھی گئی تھی — حسن اعرافی۔

شہ پارہ

سنی آواز لینن کی جو محنت کش غریبوں نے — کسانوں، فوجیوں نے اور مزدوروں ادیبوں نے
انہوں نے اشتراکی پارٹی کی رہنمائی میں — بدل دی جنگ عالم اک نئی ٹکر کی لڑائی میں
الٹ کر تخت آخر زار ظالم کی حکومت کا — کیا اعلان مزدوروں نے اپنی آمریت کا!

●

اُدھر تھا حملہ آور طاقتوں کا زور بڑھا ہوا — اِدھر تھا اندرونی سازشوں کا شور برپا ہوا !!
دکھائی ایسی لاثانی شجاعت سرخ فوجوں نے — بچائی پہلی سوویت ریاست سرخ فوجوں نے
یہ پہلی سوویت تعبیر خوابِ مارکس اینگلس تھی — یہ پہلی سوویت لینن نے اپنے خون سے سینچی
یہ پہلی سوویت دن دن بڑھی پھولی پھلی اور اب — جہازِ زندگانی کے لئے ہے رہنما کوکب
یہ پہلی سوویت انساں کا خوابِ بہاراں ہے — یہ پہلی سوویت دنیا میں خلد کامگاراں ہے
وہ مشعل ہے کہ اس کی لو سے دنیا میں اجالا ہے — وہ بوٹا ہے جسے محنت کشوں نے خوں سے پالا ہے
یہ مینارا ضیا افشاں ہے تاریکی کے دھاروں میں — اسے ڈھانے کے ہیں اب مشورے سرمایہ داروں میں

اِدھر منصوبہ بندی ہے، اُدھر پیماں بازی ہے
یہ کیا فتنہ طرازی ہے، یہ کیسی جنگ سازی ہے

بزعم خویش اگر ڈالر کو دنیا بہ سر پہ بھرتے ہیں — تو دنیا بھر کے محنت کش بھی یہ اعلان کرتے ہیں
"قسم ہے ان ہتھوڑوں کی جنہیں ہم جب چلاتے ہیں — ملیں تو خسر ایوانِ شہی تک تھرتھراتے ہیں
"درانتی کی قسم بھی جس کی ہاتھ دھرتے ہیں — تو سرمایہ جڑی بوٹی کا قصہ پاک کرتے ہیں
"قسم ہے اس زمیں کی جس پہ ہم یوں خوار پھرتے ہیں — کبھی جیلوں میں سڑتے ہیں، کبھی بیکار پھرتے ہیں
"قسم ہے انقلاب سرخ کے پرجوش دھاروں کی — قسم ہے روس کی مہکی ہوئی رنگیں بہاروں کی
"ستالن کی قسم جس سے بیٹے کو خون کھلاتے ہیں — قسم لینن کی جس کی آج ہم برسی مناتے ہیں
"یہ جھنڈا عہدِ نو کی صبح کا ہے احمریں کوکب — اسے ہاتھوں میں لیکر آج کھاتے ہیں قسم ہم سب
"پہل تم سامراجی جنگ بازو اب کے کر دیکھو — تم اے کٹھ پتلیو! امداد کی حامی تو بھر دیکھو

"ہم امن و آشتی تم پر مسلط کر کے لیں گے دم
خبر لیں گے تمہاری ہم، خبر لیں گے تمہاری ہم"

●

قاضی عبدالستار

گومتی کی آواز

_(طلبا کی تحریک پر)

جانے کیسی سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی ہے رات
بیکسی جھک جھک کے کرتی ہے لب و عارض کو پیار
خامشی کی بیڑیاں پہنے کھڑی ہے زندگی
کون جانے کیا ہوا گائے ہوئے گیتوں کا ہار
دھیمے دھیمے سے یہیں لوری دے رہی ہے چاندنی
جیسے بوڑھی مطربہ گاتی ہے تھم تھم کر ملہار
آسماں کی گود میں بکھرے ہوئے تاروں کے ڈھیر
منہدم بستر پہ جیسے اُلجھے پھولوں کے ہار
"درسگاہ" کے سرمئی گنبد پہ روتا ماہتاب
جانے کس کی راہ تکتی ہے نگاہِ سوگوار!
"کہکشانی کرنوں" میں ڈوبا "چھتر منزل" کا جمال
سو گیا ہے توڑ کر اپنی محبت کا ستار
گھاس کی بھیگی ہوئی پلکوں پہ شبنم کے چراغ
جیسے جوگن کر رہی ہو دیپ مالا کا سنگھار
گومتی...! اے لکھنؤ کی مریم مینا و جام
کس کے ماتم میں کھلی ہے تیری زلفِ تابدار
جیسے اک بیوہ کی چادر کہہ رہی ہو دردِ دل
چاندنی اوڑھے کھڑی ہے اس طرح تیری بہار
کل خرامِ ناز کے جادو سے ان بن تھی... مگر
آج کیوں جھلا گئے چلتی ہوئی موجوں کے وار

کچھ بتا بھی کیا دلِ ناشاد پر گذری ہے آج
میں تو برسوں رہ چکا ہوں تیرے غم کا رازدار
صبر کی کھیتی پہ اب بجلی چمک جانے کو ہے
دیکھ میرے غم کا پیمانہ چھلک جانے کو ہے
کیا کہوں اے شاعرِ آشفتہ دل بربادِ غم
تیری تعبیروں نے بھی دیکھا نہ ہوگا ایسا خواب
آج مجھ پر رو رہی ہے عصمتِ شامِ اودھ!!
کون جانے کن گناہوں کا پڑا مجھ پہ عذاب
کل کہ شعلہ ہو رہا تھا سینۂ جمنا کا دل
میرے گلشن میں مگر کھلتے رہے میرے گلاب
میرا دامن اور یہ افسانۂ تیغ و سناں...!
اس بڑھاپے میں پڑی مجھ پر نگاہِ انتخاب
"ظلمِ چنگیزی" کا میری بزم میں پرچم کھلے...!
میری محفل میں "ہلاکو" کی کہانی باریاب
ٹوٹ کر خنجر کے یوں جمہوریت تولی گئی
جیسے اک بنیا چکائے اپنے روکڑ کا حساب
ہائے وہ امن و اماں کے چاند تارے دل کا چین
جن کے ناموں کی قسم کھا کر اٹھے گا انقلاب
گود میں میری تڑپ کر سو گئے دھرتی کے لال
آسماں سے جو اتاریں گے بغاوت کی کتاب

ــــ یونیورسٹی

ــــ [illegible] کے فسادات۔

جن کی چھاتی پر قلم گاڑے گئے تاریخ کے
جن کے چہرے پر صبحِ فردا کے چمکتے آفتاب
جن کی مٹی سے ستم ڈھائے گئے تہذیب کے
جن کے آنسو شامِ یلدا کے دمکتے ماہتاب
شمعِ آزادی کے پروانے بغاوت کے چراغ
برف کے تودوں کو بخشا ہے جنہوں نے سوز و تاب
بزمِ افرنگی میں یوں لوح و قلم لیکر اٹھے
بند ہو کر رہ گئی جبرِ حکومت کی کتاب
زنزوں کے ساز پر اٹھے رجز گاتے ہوئے
فتح نے جھک کر سلامی دی ظفر نے لی رکاب
آتشیں چہروں پہ اپنے فرض کی عظمت کا پاس
جس طرح شبنم کی باتیں کر رہے ہوں آفتاب
اس طرح جھنجلا کے تخت و تاج پر ڈالی کمند
ناچتے طاؤس پر جیسے جھپٹتے ہیں عقاب
خون میں ڈوبے کفن ماضی کے افسانوں پہ ہات
رات کے تسلوں سے ٹکراتی شفق کا پیچ و تاب
بات پر آتے ہیں تو قسمت سے لڑ جاتے ہیں وہ
چشمۂ حیواں کو بھی ورنہ سمجھتے ہیں سراب
گیس گولی سے نہتوں کی لڑائی کب تلک
چاند کے لشکر پہ غالب آ گئی فوجِ سحاب
موت کی وادی میں آئے تو کس انداز سے
جیسے دولہن کے شبستاں پر قدم رکھے شباب
ان کی بیتابی کی سوگندا سے حریمِ دردِ دل
تک رہی ہے صبحِ نو سر پر کلاہِ آفتاب
نونہالانِ گلستاں پر شباب آنے کو ہے
ہاتھ میں محضر لئے روزِ حساب آنے کو ہے

باغباں سے کہہ رہی ہے جنبشِ لوح و قلم
کل رسن اور دار کے بدلے چکائے جائیں گے
آج تو گلشن نصیبِ گرگِ خاں ہے کل .... مگر
نرگسِ بیمار کے بدلے چکائے جائیں گے
آج تو دامن رقیبِ کہکشاں ہے کل مگر
دیدۂ خونبار کے بدلے چکائے جائیں گے
گو یہوں کے بھاؤ پر بکتا تو ہے اپنا لہو
کل اسی بازار کے بدلے چکائے جائیں گے
اپنی محفل، اپنی مینا، اپنے ساغر اپنی مے
قبضۂ اغیار کے بدلے چکائے جائیں گے
پیرِ میخانہ ترے دستورِ کہنہ کی قسم!
حسرتِ تجوار کے بدلے چکائے جائیں گے
آج ہنستے ہیں پایۂ سنگر طوق بھی زنجیر بھی!
کل نہیں آزار کے بدلے چکائے جائیں گے
ہر چراغِ لالہ میں چمکے گا خونِ باغباں
ہر کھٹکتے خار کے بدلے چکائے جائیں گے
ہر قدم پر پھول اور موتی کے لہرائیں گے گیت
فصلِ آتشبار کے بدلے چکائے جائیں گے
ہر کلی دولہن بنے گی ہر روش کوئے حبیب
یوں فراقِ یار کے بدلے چکائے جائیں گے
سکھ بھرے اقرار کی محفل میں پریاں گائیں گی
دکھ بھرے انکار کے بدلے چکائے جائیں گے

کشتیٔ مجبور کا ساحل بھی طوفانوں میں ہے
تیرا افسانہ بھی شامل میرے افسانوں میں ہے

●

پرویز شاہدی

ہم نوجواں ہیں

ہم نوجواں ہیں جانِ بہاراں مرگِ خزاں ہیں
شادابیوں کا گلشن بداماں اک کارواں ہیں
جام و سبو کی کیف و نمو کی روح تپاں ہیں
ہم آتشِ گل کی رقص کرتی چنگاریاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

شعلے غضب کے رہتے ہیں رقصاں قلب و جگر میں
سانسیں ہماری سورج کی کرنیں شوقِ سحر میں
سوراخ کردیں ظلمت کدوں کے دیوار و در میں
سوزِ دروں سے اپنی نگاہیں آتش فشاں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

بجلی کے دھارے ہر وقت رقصاں اعصاب میں ہیں
سرکش شرارے طوفاں بداماں اعصاب میں ہیں
سلگے ستارے خورشید افشاں اعصاب میں ہیں
دہکی رگوں میں سیال آہن کی ندیاں ہیں!
ہم نوجواں ہیں!

وہ ہوں دفاتر یا درس گاہیں یا کارخانے
جذبات کے یا افکار کے ہوں وہ آشیانے
سبزے کی مسند کالے دھوئیں کے یا شامیانے
سن کر صدائے سازِ جوانی! سب نغمہ خواں ہیں
ہم نوجواں ہیں!

ترانہ

بجلی سے لرزے حسنِ تبسم! ممکن نہیں ہے
ڈالر سے کانپے شانِ تکلم! ممکن نہیں ہے
ایٹم سے سہمے شوقِ ترنم!! ممکن نہیں ہے
کیا موت کا ڈر! خود زندگی کی روحِ رواں ہیں
ہم نوجواں ہیں

وہ والگا کے سیلِ رواں کی رنگیں کہانی!
وہ سرخ یورپ کی ندیوں کا! گل رنگ پانی
وہ یانگسی کی موجِ طرب کی شیریں بیانی
ہاں سب ہماری ہی کل کی توڑی انگڑائیاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

اطلانتک کے گرداب کا ہے انجام خواری
ہے پیسفک کے بزدل تھپیڑوں پر خوف طاری
جلتی رہی ہے جلتی رہے گی کشتی ہماری
شعلوں کے دریا میں ناخدائے امن و اماں ہیں
ہم نوجواں ہیں

بھیگی مسیں پھر کیف و نمو کا! حق مانگتی ہیں
تسکینِ ذوقِ جام و سبو کا حق مانگتی ہیں
بزمِ جوانی! میں ہاؤ ہو کا حق مانگتی ہیں
بارود مل کر کس کو ڈراتی یہ پھلجھڑیاں ہیں
ہم نوجواں ہیں

باغِ نشاطِ حسن و محبت لے کر رہیں گے
صبحِ تبسم شامِ مسرت لے کر رہیں گے
جو چھن گئی ہے وہ اپنی جنت لے کر رہیں گے
بیکار ہو ہم بوڑھے جہنم کے پاسباں ہیں
ہم نوجواں ہیں

منیب الرحمٰن

یہ مخلوق

مرے وطن کی یہ بدبخت فاقہ کش مخلوق
اجل کی لاڈلی، جور و ستم کی نورِ نظر
یہ گبرو دارِ حوادث کی ناز پروردہ
جسے زمانے نے خونِ جگر پلایا ہے!
وبا و قحط نے اپنا جسے بنایا ہے!
غمِ حیات نے جس کو گلے لگایا ہے

کیا ہے اجنبی ہاتھوں نے پائمال اس کو
سکھائے غیر نے آدابِ بندگی اتنے
ملے ہیں ورثہ میں اس کو قرونِ ماضی سے
اسے نصیب نہیں ارتقا کی جولانی
کہ اس سے چھن گئی آخر متاعِ انسانی
فقط جہالت و افلاس و چاک دامانی

اگر روانیِ دریا کو راستہ نہ ملے
علاجِ درد کی خاطر اگر ترستے رہیں
زمانہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے کوئی راہِ نجات
تو سنگِ خارا کے پشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں
تو خود ہی وقت کے ناسور پھوٹ جاتے ہیں
قضا کے دام سے انسان چھوٹ جاتے ہیں

مرے وطن کی یہ بدبخت فاقہ کش مخلوق
وہ وقت دور نہیں جب ستم پرستوں پر
صدائیں گونجیں گی کھیتوں میں، کارخانوں میں
اٹھے گی قبر سے روزِ حساب آئے گا
ستم کشوں کی طرف سے عتاب آئے گا
شفق میں ڈوبا ہوا انقلاب آئے گا

اختر پیامی

گنگ و جمن

(ایک بیک رات کی خموشی میں
ظلمتوں کی نقاب اوڑھے ہوئے
روحِ گنگ و جمن چلی آئی)

کتنی یادوں کے قافلے آئے — ذہن میں رینگنے لگے سائے
کتنی صبحیں سمٹ کے آپہونچیں — کتنی شامیں فضا میں گھلنے لگیں
کتنے چہروں پہ آگئیں موجیں — کتنی زلفوں کی کھل گئیں گرہیں
عارضوں کے گلاب بھی مہکے — اور ہونٹوں سے پھول جھڑنے لگے

(روحِ گنگ و جمن نے مجھ سے کہا)

جانے کب سے اداس رہتی ہوں — زحمتِ انتظار سہتی ہوں
مجھ کو آبادیاں ستاتی ہیں — مجھ کو ویرانیاں ڈراتی ہیں
لذتِ اضطراب مت پوچھو — دل ہے خانہ خراب مت پوچھو
چاندنی رات اب بھی آتی ہے — تیرگی مجھ کو کاٹے کھاتی ہے
آرزوؤں کے کتنے شیش محل — کتنی دوشیزہ حسرتوں کے کنول
میری لہروں پہ اب بھی بہتے ہیں — رازِ دارانہ مجھ سے کہتے ہیں
زورِ طوفاں بجھا نہ دے ہم کو — موج کوئی مٹا نہ دے ہم کو
اور تاریکیاں نہ چھا جائیں — چاند پر بدلیاں نہ آجائیں
میں یہ سنتی ہوں مسکراتی ہوں — اپنے دامن پہ چونک جاتی ہوں

یوں تو پہلے بھی شمع جلتی تھی — رات لیکن کہاں مچلتی تھی
سازشیں آندھیاں نہ بنتی تھیں — تیلیاں بجلیاں نہ بنتی تھیں

تیرگی اس طرح سے اُمڈی ہے | آج شمع وفا لرزتی ہے
اپنی عصمت بھی کھو سکیں موجیں | اب تقدس کہاں ہے لہروں میں
آگ پانی نے بھی لگائی ہے | زندگی خون میں نہائی ہے
میرا دامن لہو سے رنگیں ہے | آئینہ دار عکس خونیں ہے
کتنے روشن چراغ بجھنے لگے | قافلے تیرگی میں لٹنے لگے
کتنے لعل و گہر گنوا ڈالے | کتنے پاؤں میں پڑ گئے چھالے
کتنے سینوں سے اٹھ رہا تھا دھواں | کتنی بانہوں سے ڈھل گئی افشاں
وہ بھی لیل و نہار دیکھ چکی | گردش روزگار دیکھ چکی
آہوؤں نے ختن کو چھوڑ دیا | تم نے صحن چمن کو چھوڑ دیا
پھول کمہلا گئے بہاروں میں | خوں ابلتا ہے لالہ زاروں میں
خاک اُڑتی ہے صحن گلشن میں | آگ سی اک لگی ہے تن من میں
ہجر کا غم اٹھا نہیں سکتی | اپنے موتی لٹا نہیں سکتی
پھر بھی شکوہ نہ کچھ شکایت ہے | ہجر سے بھی مجھے محبت ہے
اک نئے دیس کو سدھارے ہو | تم کہیں بھی رہو ہمارے ہو
میں کلی کی قبا میں آؤں گی | عطر بن کر فضا میں آؤں گی
فکر کی خلوتوں میں آؤں گی | غم کے سائے میں گنگناؤں گی
نظم کی روح بن کے آؤں گی | گیت کی تان میں سماؤں گی
زلف کے پیچ و خم میں آؤں گی | عشق کی چشم نم میں آؤں گی
چاند سورج کی ضو میں آؤں گی | بوڑھی گنگا[1] کی رو میں آؤں گی
جوٹ کی کھیتیوں میں آؤں گی | جہد کی وادیوں میں آؤں گی
شوخ انرسش[2] میں رنگ لاؤں گی | ناریل کی نئی بڑھاؤں گی
ماہی گیروں کی لے میں آؤں گی | اور پدما[3] کے ساتھ گاؤں گی
اک نئے دیس کو سدھارے ہو | تم کہیں بھی رہو ہمارے ہو

(ظلمتوں کی نقاب اوڑھے ہوئے
روح گنگ و جمن خموش ہوئی)

[1] مشرقی بنگال کی ایک ندی
[2] انناس۔ [3] مشرقی بنگال کی ایک ندی۔

افضل پرویز

بکاؤ مال

یہ جان بھی ہے تیری، مری جان! بیچ دے
تن من ہے تیرا، ہیں ترے قربان بیچ دے

دستارِ فضل، زیورِ حکمت، متاعِ شعر
ان سب کے ساتھ دولتِ وجدان بیچ دے

جنسِ خودی، نیازِ محبت، غرورِ حسن!
چوراہے پر یہ فالتو سامان بیچ دے

ٹھمری کا درد، گیت کی لذت، غزل کا لوچ
سازوں کا سوز، راگ کی ہر تان بیچ دے

نیلام اٹھا دے لیلیٰ محمل نشین کا
مجنوں کا تار تار گریبان بیچ دے

خسرو کے پاس تیشۂ فرہاد رہن رکھ
بازارِ مصر میں مہِ کنعان بیچ دے

کھیڑوں میں جا کے ہیر کی عصمت فروخت کر
سیدے کے ہاتھ رانجھے کا رومان بیچ دے

سسی کا پیار تھل کے جہنم میں جھونک کر
پنوں سا یارِ غار و حدی خوان بیچ دے

دریاؤں کا بہاؤ، کہستان کا شکوہ
سب کچھ ہے تیرے تابعِ فرمان بیچ دے

پنگھٹ کے قہقہے، گھنی فصلوں کی کروٹیں
مچلا ہوا ہو کوئی بھی ارمان بیچ دے

"گل چیں کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل"
نازک ہے وقت، اٹھ، چمنستان بیچ دے

رندوں سمیت ساغر و مینا پہ رکھ نظر
پیرِ مغاں ہے تیرا نگہبان بیچ دے

دھندا کچھ اور مندا نہ پڑ جائے اس لئے
یکلخت اونے پونے یہ سامان بیچ دے

"ہرگز برا نہ مان جو دشمن برا کہیں"
ہر شے تری ہے، تو علی الاعلان بیچ دے

سوداگری میں جنس کی رائے کا دخل کیا
جس مول چاہے سب سر و سامان بیچ دے

عثمان عارفی

جمہور

جب بھی چھائی ہے گھٹا ٹوپ سیاہی غم کی
پاک دھرتی کے جواں سال افق زاروں پر
وقت وتاریخ کے تو خیز جگر پاروں پر
زندگانی کے لہکتے ہوئے رخساروں پر
ارض کو مہرِ جہاں تاب دیئے ہیں تم نے
وقت کو گوہرِ خوش آب دیئے ہیں تم نے
زندگانی کو مدھر خواب دیئے ہیں تم نے
جب بھی تم اٹھے غم دہر کا مرہم لیکر
اپنے ہاتھوں میں مہہ و سال کا پرچم لیکر
اپنے سینوں میں بغاوت کا جہنم لیکر
جبر و تخریب کے بھوتوں کو مٹانے کیلئے
عہد جابر کے کپوتوں کو مٹانے کیلئے
بہہ گئے وقت کے سیلاب میں شاہوں کے قصور
خاک میں دفن ہوا قیصر و کسریٰ کا غرور
بجلیاں ٹوٹ پڑیں خرمن ساسانی پر
جبر کی دھند میں روپوش ہوئے رنگ محل
اٹھ گئی وقت کے رخسار سے ظلمت کی نقاب
پاک دھرتی کا ہر اک ذرہ گہر ہونے لگا
ہر طرف بارشِ انوارِ سحر ہونے لگی!
لب فطرت سے بہاروں کے ترانے ابھرے

آج بھی غم کی لہو رنگ گھٹا چھائی ہے
پاک دھرتی کے جواں سال افق زاروں پر
ظلم کی آگ میں ہر دیدۂ تر جلتا ہے
بھوک کی آنچ سے انسان کا جگر جلتا ہے
پی کے مظلوموں کا لہو شاد ہیں دولت والے
مجرے والے سر بازار ستم جلتے ہیں!
جسم افلاس سر وادیٔ غم جلتے ہیں
بھوک کے جب اٹھتے ہیں وندی ہوئی کٹیاؤں سے
پیٹ کی شکل میں کشکول گدائی لیکر
اپنی محنت کے عوض چند نوالوں کیلئے
گولی چلتی ہے آہنسا کی سلامی لیکر
لاٹھیاں اٹھتی ہیں قانون خدائی لیکر
اور پھر خون سے ہو جاتی ہے گلنار زمیں
چھلنی ہو جاتے ہیں زخموں سے ہزاروں سینے
پاک دھرتی سے لپٹ جاتی ہیں بھوکی لاشیں
تم پھر آ جاؤ مہہ و سال کا پرچم لیکر
اپنے سینوں میں عزائم کا تلاطم لیکر
روحِ افلاس تمہیں شام و سحر ڈھونڈتی ہے
زندگانی تمہیں نشتر بہ جگر ڈھونڈتی ہے
دہر میں چشم و چراغ ابدیت تم ہو!
دکھ سے بھرپور مہہ و ساں کی دولت تم ہو

تم سے بچوں کی ہنسی ماؤں کی آنکھوں کا سرور
تم سے ابھری ہوئی دنیا میں چراغانِ بہار
تم سے گاؤں کی حسیں شام لہکتے ہوئے کھیت
تم سے چوپال پہ گونجے ہوئے دہقاں کی پکار
تم سے پنگھٹ سے پلٹتی ہوئی گوری کا خرام
تم سے پائل کے چھنگروں کی کھنکتی جھنکار
تم سیہ راتوں کو سپنوں کا اجالا دیدو
سینۂ خاک کو مہتاب کا ہالہ دے دو
تاکہ ہر ذرہ مہہ و نجم و گہر ہونے لگے
ہر طرف رقص غزالانِ سحر ہونے لگے
زرد چہرے غم و حسرت کی کہانی نہ سنائیں
شاد ہو جائیں حدیث لب و رخسار کہیں
صحن میخانہ میں ہوں رقص کناں جام و سبو
تشنہ لب رند خرابات نشیں مے چھلکائیں
ملک ہو جائیں ثقافت کے ترانوں میں مگن
شہر تعمیر و ترقی کی تمناؤں میں چور
بستیاں خلد کی امید جواں سال میں مست
گاؤں خوابوں کے دل آویز پھبن میں مسرور
زندگی عظمتِ انساں کی امیں ہو جائے
یہ زمیں غیرتِ فردوس بریں ہو جائے

شہکار

سرِ عام کب سے کھڑا ہے مسافر
اٹھائے ہوئے پیٹھ پر بوجھ غم کا
ازل سے جو بڑھتا رہا لحظہ لحظہ

یہ ڈھانچہ، یہ مٹی کا بیکار پتلا
جھکائے ہوئے اپنی کمزور گردن
نگاہوں کی گرتی ہوئی چلمنوں سے
زمیں کو بڑے غور سے تک رہا ہے
جہاں سے یہ ابھرا تھا انساں کی صورت
لپکتا تھا یوں چاند تاروں کی جانب
کہ جیسے یہ اک دن انہیں چوم لے گا
مگر چند جلاد ہاتھوں نے بڑھ کر
لڑکپن سے ہی چھین لی اسکی طاقت
اسے کارخانوں کا پرزہ بنایا
جھلستی ہوئی کھیتیوں میں جلایا
تعفن سے بھرپور آبادیوں میں
اسے زندگی بھر بھٹکنا سکھایا

اور اب یہ مسافر بھٹکتے بھٹکتے
سرِ عام آکر کھڑا ہو گیا ہے
جہاں کے خداؤں سے یہ کہہ رہا ہے
تمہارے تمدن کا شہکار ہوں میں
تمہارے ہی ہاتھوں کی صنعت گری نے
تراشا ہے مجھ کو، ابھارا ہے مجھ کو
مری سمت نفرت سے کیوں دیکھتے ہو
بڑھو اور مجھ کو یہاں سے اٹھا کر
چمکتے عجائب گھروں میں سجا دو
کہ جب بھی نئی منزلوں کے مسافر
تمدن کے ان آستانوں سے گذریں
مجھے دیکھ کر تم کو بھی یاد کریں!!

جمیل ملک

قاشیں

نریش کمار شاد

داستانِ مآلِ گل کہہ کر — مصلحت کیا اسے ڈرائے گی
مسکرانا کلی کی عادت ہے — خون ہو کر بھی مسکرائے گی!!

ذرہ اور شکوہِ ماہ و انجم ہو — موج اور اس میں یہ تلاطم ہو
بارہا سوچتا ہوں میں — شاید — میرے سینے میں دل نہیں تم ہو

چوٹ کھا کر بھی مسکراتا ہوں — درد میں بھی مزہ سا پاتا ہوں
دوستو! تم پہ ہی نہیں موقوف — خود بھی اپنی ہنسی اڑاتا ہوں

چاندنی رات کی خموشی میں — یوں کوئی مہ جمال آتا ہے
ایک شاعر کے ذہن میں جیسے — خوبصورت خیال آتا ہے

شوخ اتنی نگاہِ دید نہ ہو!! — مضطرب یوں دلِ امید نہ ہو
حسن کا حسن ختم ہو جائے — دسترس سے اگر بعید نہ ہو

منبعِ التفات ہو جائے — روح شہد و نبات ہو جائے
ہضم ہو جائے غم کا زہر اگر — موجِ آبِ حیات ہو جائے

یوں کلی کی چٹک میں پنہاں ہے — قلب فصلِ بہار کی دھڑکن
جیسے دوشیزگی کے سینے میں — ایک گمنام پیار کی دھڑکن

حسنِ احساس کی ضرورت ہے — ذرہ ذرہ حسین مورت ہے
تیری نظریں ہیں بے بصر ورنہ — زندگی اب بھی خوبصورت ہے

کائناتِ نیاز و ناز ہیں یہ — روح پرور ہیں دل نواز ہیں یہ
کھول دے اپنے عنبریں گیسو — زندگی کے حسین راز ہیں یہ!

صبح کے دلنشیں دھندلکے میں — شبنم آلود یوں ہے راہ کی خاک
میرے ہنستے ہوئے کئی اشعار — میرے اشکوں سے جس طرح نمناک

باقر مہدی

شعور

رموزِ دہر کو اہلِ نظر سمجھتے ہیں
دماغ و دل ابھی برق و شرر سے بنتے ہیں
حسین جہانوں کے خاکے ہمارے ذہن میں ہیں
نئے زمانے تو فکر و نظر سے بنتے ہیں

حیاتِ فکر و عمل سے حیات بنتی ہے
کہ تیرگی میں اسی طرح نور ملتا ہے
شرابِ وحشت دل کی دوا سہی لیکن۔
خمار اترنے پہ اکثر سرور ملتا ہے

دماغِ عشق کو سمجھا کے آرزوئے نیاز
غرورِ حسن کو بخشا ادا و ناز کا فن!
شعور دیتا ہے خود آگہی کے آئینے
کہ جس میں چمکے محبت کے ساتھ اس کا چلن

پیام ہے یہ نئی زندگی کی راہوں کا
قدم قدم پہ نئے باب وا کئے جائیں

سنبھل سنبھل کے بڑھے کاروانِ اہلِ نظر
کہ ذہن و دل کے سہارے نہ چھوٹنے پائیں

طلسم بےخبری کا فریب ختم ہوا —
کہ نورِ علم سے روشن ہے یہ جہانِ خراب
مزاجِ دیدۂ و دل اب بدلتے جاتے ہیں
کہ اب عروج پہ آیا ہے جرأتوں کا شباب

حیات آج عبارت ہے ہوشمندی سے
جنوں کے دور میں فکر و نظر کی بات کرد
ہزار ظلمتیں وحشت بدوش ہوں لیکن
سمجھ سمجھ کے جمالِ سحر کی بات کرد

نئے عوام بناتے ہیں زندگی کا شعور
حسین خوابوں کی تعبیر ملنے والی ہے
ہمارے ہند میں بھی پھول مسکرائیں گے
حیاتِ نو کی کلی جلد کھلنے والی ہے

شہاب جعفری

ہاتھ کی لکیریں

دستِ منعم سے اب اس درجہ بھی مانوس نہ ہو / ہے نجومی مری تقدیر سے مایوس نہ ہو
یہ مرے ہاتھ کہ جن پر ہے مجھے ناز بہت / تو یہ کہتا ہے مرے حق میں ہیں ناساز بہت

دستِ عاجز میں لکیریں نہیں زنجیریں ہیں
میرے اجداد کی سوئی ہوئی تقدیریں ہیں
کہیں مریخ کے ہیں سائے کہیں زہرہ کا اثر
تیرہ بختی کے زحل نحس قدم شام و سحر
نہ تو جینے کی خوشی اور نہ مرنے کا ملال
میرے ماضی کی طرح ایک سے مستقبل و حال
خوش نصیبی کا تصور کوئی ملتا ہی نہیں
ان لکیروں میں تغیر کوئی ملتا ہی نہیں

یہ مرے ہاتھ کہ جن پر ہے مجھے ناز بہت / تو یہ کہتا ہے غمِ دل کے ہیں غماز بہت
کہیں گہرے، کہیں دھندلے، کہیں مبہم ہیں نقوش / کہیں بے جان، کہیں کم، کہیں مبہم ہیں نقوش

ٹوٹے پھوٹے سے خطِ دل پہ دلِ زار کا بوجھ
الجھے الجھے سے خطِ ذہن پہ افکار کا بوجھ
نرم و نازک سے کفِ دست میں الفت کا گداز
یوں، کہ ہمدردیٔ احباب سے محروم نیاز
نہ جوانی کے تقاضوں کے نشاں ملتے ہیں
نہ محبت کے ارادے ہی جواں ملتے ہیں
ہوگا فردا میں ابھی اور تمناؤں کا خوں
یہ بھی ممکن ہے کسی وقت میں ہو جائے جنوں
فن مقدر ہے مگر اس سے بھلا کچھ بھی نہیں
دستِ محنت ہے مگر آب و غذا کچھ بھی نہیں

یہ مرے ہاتھ کہ جن پر ہے مجھے ناز بہت / ید بیضا نہ سہی، دستِ مسیحا نہ سہی / ہاں یہی دستِ عمل جن میں ہیں اعجاز بہت
میری تقدیر بھی خالقِ تقدیر تو ہیں / انقلاباتِ زمانہ کے عناں گیر تو ہیں

شہزاد فتحپوری

گریز

اجنبی! تیرے تحائف کو میں کیا لیکے کروں؟

یہ بڑی بات ہے تو نے جو مجھے یاد کیا
مجھ سے وابستہ رہیں تیری وفا کی رسمیں
جن میں بیداریٔ احساس کا خوں ملتا ہے
تیرے خوابوں میں فروزاں ہیں وہی قندیلیں

رات کی سرد خموشی میں دھڑکتا ہوا دل
چیخ اٹھتا ہے کہ برباد تمنا ہے شباب
درد کچھ اور چمک جاتا ہے جب تاروں سے
یوں جو ٹکرا کے پلٹتی ہے نگاہِ بے تاب

بھولی بسری ہوئی یادیں ہیں کہ تیر و نشتر
ایک بے نام خلش روح کو تڑپاتی ہے
خود فراموشیٔ دل جتنا سنبھالے ہے کبھی
زندگی اور بھی تنہائی میں گھبراتی ہے

کیسے خوش رنگ تصور کے حسیں پھولوں میں
تیرے گیتوں سے الجھ پڑتی ہے فریاد کی لے
لب پہ جب آتی نہیں دردِ محبت کی پکار
خون روتے ہوئے اشکوں کی زباں بولتی ہے

یہ بھی کیا کم ہے کہ تو آج بھی ہے میرے لئے
چاک داماں و جنوں کوش و حزیں، خاک بسر
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
ورنہ تو نے تو لٹائے ہیں محبت کے گہر

اجنبی! تیرے تحائف کو میں کیا لیکے کروں؟

بلراج کومل

کھنڈر اور پھول

(۱)

مکاں جل چکا ہے
کھنڈر ہے سیاہی ہے، بجھتی ہوئی راکھ کی سسکیاں ہیں
مری آنکھ پرنم ہے
چپ چاپ، گم سم کھڑا ہوں یہاں میں
مرے آنسوؤں میں تصاویر ہیں
ماضی و حال کی
وقت کی منزلوں کی
مرے ذہن میں داستاں ہے
زمانے کے بننے بگڑنے کی
تعمیر و تخریب کی دھڑکنوں کی
مرے کان میں گونجتی ہیں وہ نرم اور شیریں صدائیں
جنہیں آگ نے اس مکاں کے کھنڈر میں فنا کر دیا ہے
محبت کی تقدیس
معصوم شمعوں کے اشکوں کی گرمی
دھوئیں کی تڑپتی ہوئی دھاریاں
ان کا پیغام بن کر
فضاؤں میں شاید بھٹکنے لگی ہیں

(۲)

مری آنکھ پرنم ہے
پھر بھی میں خوش ہوں
مرے پاس خوابوں کی معصوم ٹھنڈک
ارادوں کے روشن ستاروں کی نرمی
ہواؤں میں بہتی ہوئی نغمگی ہے
میں یادوں کے ملبے پہ تخلیق کا پھول لیکر کھڑا ہوں

سیدہ فرحت

آثارِ سحر

زندگی کیسی بھیانک سی نظر آتی ہے
روح تاریکیٔ ماحول سے گھبراتی ہے
پھر بھی امید سہارا سا لئے جاتی ہے

ظلمتِ شب میں نظر آتے ہیں آثارِ سحر

لاکھ ہیں سنگِ گراں اس کو کچلنے کے لئے
اژدہے سیکڑوں بیٹھے ہیں نگلنے کے لئے
راہ دیتے نہیں کانٹے اسے چلنے کے لئے

پھر بھی انسان ہے منزل کی طرف گرمِ سفر

آج بیدار ہے انسان کا خوابیدہ شعور
ہر طرف گونجتی ہے آج صدائے جمہور
اپنی ٹھوکر سے مٹاتے ہیں وہ شاہوں کا غرور

اپنے حق کے لئے مر جاتے ہیں بےخوف و خطر

لے کے اک عزمِ جواں آج عوام اٹھتے ہیں
وہ بدلنے کو یہ فرسودہ نظام اٹھتے ہیں
توڑ دینے کو زر و سیم کا دام اٹھتے ہیں

دور منزل سہی محکم ہے مگر عزمِ سفر

آج کنجشک کمربستہ ہے شاہین کے خلاف
گل صف آرا ہوئے گلزار میں گلچیں کے خلاف
اک جہاں چیخ اٹھا ظلم کے آئین کے خلاف

آج لو دینے لگے سینۂ ہستی کے شرر

ہوگا جب دستِ خزاں سے نہ کہیں حسنِ بہار
جورِ گلچیں سے نہ اجڑے گا کوئی جب گلزار
جب نہ گونجے گی فضا میں کسی دکھیا کی پکار

اس حسیں دور کے آثار آتے ہیں نظر

عزیز قیسی

شہیدوں کی آواز

ہم فنا کا افق پار کرتے نہیں
گیت سنتے ہیں گھٹتے ہیں مرتے نہیں

خون کی بوندیاں ڈوبتی ہیں مگر
بیج کی طرح اٹھتی ہیں پھر جاگ کر

جب مسیحا بنے فصلِ گل کی ہوا
رُت جب آئے خنک ہو جو موجِ صبا

پھر اُبھرتی ہیں یہ سینۂ خاک پر
طنز کرتی ہوئی جبر خاشاک پر

کھیتیوں کی طرح لہلہاتی ہوئی
انقلابوں کے مانند چھاتی ہوئی

ہم تو کیا قاتلوں کو بھی ہے یہ پتہ
قتل ہوتے نہیں، گیت، سوبج، صبا

جبر واقف ہے فریاد کے وار سے
دار آگاہ ہے نعرۂ دار سے

گولیاں جانتی ہیں کہ یہ انگلیاں
توڑ سکتی ہیں رستے کے سنگِ گراں

رات لمبی سہی بیکراں تو نہیں
آستیں کا لہو بے زباں تو نہیں

چرخ پر گو اندھیرے کی تحریر ہے
رات خود اپنی قسمت کی تخچیر ہے

وحیدہ اختر

زادِ راہ

کتنی افسردہ و ویراں ہے یہ تنہائی کی شام — تشنگیٔ قلب کا ہر شے پہ گماں ہوتا ہے
در و دیوار، دریچے، صحن و بام و شجر — سب کی خاموشی سے اک درد عیاں ہوتا ہے
جانی پہچانی ہوئی میز، کتابیں، کرسی — قرب بھی آج مجھے ان کا گراں ہوتا ہے
دن کے ہنگاموں میں بہلا ہوا ہر صدمۂ جاں — دل کے ہر گوشہ میں پھر نوحہ کناں ہوتا ہے
محفل و مجمع و بازار میں کھوئی ہوئی فکر — جب سنبھلتی ہے تو ہر درد جواں ہوتا ہے

کھل گئے ہیں شفقستانِ سرِ دامانِ فلک — شام دامن کو حسیں پھولوں سے بھر آئی ہے
وقت کی اڑتی ہوئی پریوں سے رخصت کیلئے — دستِ مشاطۂ فطرت سے سنور آئی ہے
اس قدر شوخ شفق رنگ ہے ملبوس حریر — رنگ و ریشم کی پری جیسے اتر آئی ہے
کتنی نکھری ہوئی رنگین فضا ہے لیکن — شام میرے لئے بادیدۂ تر آئی ہے
روح کی پلکوں پہ کچھ اشک چمک اٹھے ہیں — غم کی ہر شکل مرے دل میں ابھر آئی ہے

رات آہستہ خرامی سے چلی آتی ہے — وقت ظلمات کی آمد کا پتہ دیتا ہے
جب الجھتے ہیں اندھیروں کے قدم تاروں سے — کوئی دو چار دیئے اور جلا دیتا ہے
گرنے لگتا ہے اگر ٹوٹ کے تارا کوئی — ہر تمنائے شکستہ کو صدا دیتا ہے!
سرد ہوتی ہوئی نمناک ہوا کا ہر لمس — میرے احساس میں اک آگ لگا دیتا ہے
شب کی ٹھہری ہوئی ظلمات کا گمبھیر سکوت — کتنے سوئے ہوئے جذبوں کو جگا دیتا ہے

اپنے کاندھے پہ اٹھائے ہوئے نعشِ ماضی — زندگانی کا ہر اک لمحہ پلٹ آیا ہے
مختصر عمر میں جتنے بھی ستم جھیلے ہیں — دل نے ان سب کو نئے رنگ میں دکھلایا ہے

شعلہ

میرے افلاس و آلام پہ ہر خندہ بہ لب
قہقہے مار کے احساس میں چلا آیا ہے

زخم اپنوں سے عزیزوں سے لگے ہیں جو بھی
نشتروں سے انہیں پھر آج اُدھیڑا آیا ہے

میری محدود سی خوشیوں کا اثاثہ لیکر
کوئی ایسے میں دبے پاؤں چلا آیا ہے

وہ مری مادرِ مرحوم کا چہرہ ابھرا
ایک بے پایاں محبت کی ہوا آتی ہے

تلخئ زیست سے بھنچتے ہوئے لب کھلتے ہیں
مامتا پیار سے پیشانی پہ جھک جاتی ہے

مضمحل اور فسردہ سے خد و خال ہنسے
اک اسی پیار سے چہرے پہ ضیا آتی ہے

میرے تپتے ہوئے سلگے ہوئے احساس کی آنچ
اسی آنچل سے تو منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

جب بھی میں ماں کو تصوّر میں بلا لیتا ہوں
یورشِ غم مرے پاس آنے سے گھبراتی ہے

باپ کے شفقت و الطاف میں ڈوبے الفاظ
ظلمتِ یاس میں شمعیں سی جلا دیتے ہیں

خواہرِ کمسن و مرحوم کے معصوم انداز!!
یاد آتے ہیں تو گلزار کھلا دیتے ہیں

بھائیوں، دوستوں، استادوں کے بنستے چہرے
دامنِ دل سے ہر اک داغ مٹا دیتے ہیں

بوئے اخلاص سے مہکے ہوئے دو چار خطوط
تلخئ گردشِ ایام بھلا دیتے ہیں

کامیابی کے گلاب اور مشقت کے چراغ
منزلِ راہِ تمنا کا پتا دیتے ہیں

مضمحل چہروں پہ امید کی ہلکی سی کرن
جہدِ انساں پہ یقیں کرنا سکھاتی ہے مجھے

اپنی محنت سے سمیٹے ہوئے حاصل کی خوشی
لذتِ شوق کے اسرار بتاتی ہے مجھے

روحِ اشعار میں بیٹھی ہوئی فن کی دیوی!
مژدۂ آمدِ خورشید سناتی ہے مجھے

شاعروں اور ادیبوں کی کھنکتی محفل
اپنی آغوش میں رہ رہ کے بلاتی ہے مجھے

چند معصوم سی خوشیوں کی یہ دنیائے حسیں
غم و آلام میں جینا بھی سکھاتی ہے مجھے

اپنی محدود سی خوشیوں پہ گذر کر لوں گا
صبح کے واسطے یہ رات بسر کر لوں گا

شاذ تمکنت

یادیں

کسمساتا ہوا سرد پچھلا پہر
سوچ کا غازہ لمحوں کے رخسار پر
بھیگی بھیگی ہواؤں کی چہکاریاں
خامشی کی خلاؤں میں گلکاریاں
چاند موبافِ ابریشمی کی طرح
رات کی زلف میں مسکراتا ہوا
تارے مقیش کے تاج پہنے ہوئے
کہر کے رس سے نم ہیں فضاؤں کے لب
شبنموں کی گلابی چھلکتی ہوئی
مانگ برگ و شجر کی جھمکتی ہوئی

میرے روٹھے ہوئے آنسوؤں کی سحر
کرب سے آہوں کی شاموں میں گم ہے مگر
میری یادوں کے سنگاب اٹھنے لگے
آج بیتے دنوں کے کنول جل اٹھے
کس کے آنگن کی خوشبو سلگنے لگی
پچھلی شب کی ہتھیلی بھی لو دے اٹھی
صبح رخسار کی دھانی آنچوں کا نم
ابروؤں کے خم و پیچ کا آشرم
دل کے نازک، بلوریں، سمن زار میں
کس کے قامت کی مہکیں چھلکنے لگیں
پیڑ کے چھدرے سایوں کی دھندلاہٹیں

کس کی پیٹوں کی شمعیں جلائے ہوئے
یہ ستاروں کی جھلمل سنہری ہوئیں
کس کے غم کو دلوں میں چھپائے ہوئے

یہ خنک خواب گوں جنگلوں کی صدا
نیم خوابیدہ پگڈنڈیوں کی روا
تارے نیلے الاؤ میں دہکے ہوئے
عطر کے بھپکے بادل میں لپٹے ہوئے
یہ گپھائیں ڈھلانوں میں کھوئی ہوئی
میری تخئیل کی سانس پھونے لگیں
ان گپھاؤں میں وہ ہمسفر تو نہیں
جن کے ہاتھوں پہ ہل کے دہکتے نشاں
جن کی لے میں رہٹ کی نشیلی گمک
جن کی چھاتی پہ آہن کی ضربِ گراں
جنکے دل میں ارادوں کے گھن کی دھمک
انگلیاں گرچہ کانٹوں میں الجھی ہوئی
دامنِ گل پہ کلیاں سجائے ہوئے
آنکھیں اپنے لہو میں نہائی ہوئی
پلکیں خوابِ شفق رُو اٹھائے ہوئے

دورِ زنداں کی دیوار ابھرنے لگی
کس کے کندن سے چہرے دمکنے لگے

شاہراہ

تار تارِ گریباں لہو رنگ ہے
کس کے زخموں سے گلشن مہکنے لگے
جنکے ہونٹوں پہ غزلوں کی شیرینیاں
جنکی آنکھوں میں نظموں کی رعنائیاں
جن کے ذہنوں میں فردا کی گلکاریاں
جن کا دل رُو کشِ بزمِ نورانیاں
یادِ ہم مشرب و ہمسفر آگئی

اس گھنی شب کی مہکی ہوئی چھاؤں میں
کیسے رنگین و سنگین خیال آگئے
وحشتِ ماضی و امروز کے گلستاں
نرم و نازک ہواؤں کو سنکا گئے

مجھ کو دھرتی نے، آنکھوں میں آنسو لئے
اپنے سینے کے سب چاک دکھلا دیئے

گونجتے ساحلوں کی چھلکتی پرت
مجھ کو گردِاب کے پیچ دکھلا گئی
سیپ پلکوں پہ موتی سجائے ہوئے
مجھکو پاتال کے راز سمجھا گئی

سانولی دھانیں مجھکو بلانے لگیں
گھومتی تکلیاں کسمسانے لگیں
زرد کھلیانیں نوحے سنانے لگیں
بالیاں دھان کی تمتمانے لگیں

پتی پتی کا مجھ تک پیام آگیا
ذرّہ ذرّہ کو طرزِ کلام آگیا

سالہا سال کی شب مہکتی ہوئی
بنتِ مریم کی جھانجن چھنکتی ہوئی
ہر رگِ سازِ سر سے پھڑکتی ہوئی
گیت ڈھلتے ہوئے سے چھلکتی ہوئی

گل کے سیلے ہوئے ہونٹ گرمِ فغاں
جورِ امواجِ صرصر کے شکوہ کناں
اوس کی دھند میں جھومتی ڈالیاں
شکوہ سنجِ خزاں سشا کئی باغباں
کون رخ سے ہوائیں یہ چلنے لگیں
کھیتیاں لعل و گوہر اگلنے لگیں
کوہساروں میں برفیں پگھلنے لگیں
وادیاں حدّتِ تیغ سے جلنے لگیں
سچ یوں شاہدِ عصرِ نو بو گئی!
چاولوں کی مہک جاوداں ہوگئی
جادۂ کہکشاں پر کمندیں پڑیں
ماہ و انجم کے رازوں کی گرہیں کھلیں
کون دھڑکن خلاؤں کی سننے لگا
آستیں برق کی کون چننے لگا!!
چھلکتی ہوئی پچھلی شب کا سماں
یہ خیالوں کی گنگا رتی ندیاں
یوں تصور کی رنگیں دھنک تن گئی
سازِ فردا کی چھڑنے لگی راگنی
چاندنی گھیت کرتی ہوئی چار سو
چھلکے چھلکے ہوئے خنکیوں کے سبو
صبح کا تارا پلکیں جھپکنے لگا!!!
چاند مغرب کی جانب سرکنے لگا
ٹھنڈی، رسماتی ہوائیں چلیں
پو کی مینا میں نیلی فضائیں ڈھلیں
سرخیوں کی دلہن مسکرانے لگی
بابِ مشرق شفق کھٹکھٹانے لگی
رنگ و نکہت سے اجلی خلا اٹ گئی
وہ کلی مسکرائی، وہ پو پھٹ گئی!!!

اشک امرتسری

خانہ بدوش کا گیت

مشکل ہے یہاں خانہ بدوشوں کا گزارا

یہ غازہ و روغن یہ خدوخال دل آرا   یہ رونقِ بازار و ہوسناک نظارہ
تم خوش رہو آباد رہے شہر تمہارا
مشکل ہے یہاں خانہ بدوشوں کا گزارا

ہندو ہیں کہیں اور مسلمان کہیں ہیں   یہ لوگ سبھی کچھ ہیں پہ انسان نہیں ہیں
مذہب کی کشاکش سے مناسب ہے کنارا
مشکل ہے یہاں خانہ بدوشوں کا گزارا

"شرنارتھی" ہو کوئی "مہاجر" ہو یا کچھ اور   رونا ہے بہرحال سسکتا ہے بہرطور
تفریق کی تلوار کا ہے گھاؤ نیارا
مشکل ہے یہاں خانہ بدوشوں کا گزارا

میرے لئے تسکین یہاں ہے نہ وہاں ہے   جمہور کا آئین یہاں ہے نہ وہاں ہے
اب جائے کہاں تیغِ تقسیم کا مارا
مشکل ہے یہاں خانہ بدوشوں کا گزارا

اے دولتِ قاروں کے نگہبان خبر لے   طوفان ترنم سے مرے آگ نہ برسے
کہتے ہیں کہ اس گیت میں ہے سرخ شرارا
مشکل ہے یہاں خانہ بدوشوں کا گزارا

کیف بھوپالی

سوگند

ذوقِ سفر کی قسم
عزمِ جواں کی قسم
موت ہمیں آئے گی
الا مریں گے نہ ہم

عزمِ جواں کی قسم

راہ میں آئی تھی کل
وادیٔ دیر و حرم
دل نے کہا تھا رکو
درد پکارا نہ تھم

عزمِ جواں کی قسم

تیری خرد کے لئے
ایک گریبان بہت
میرے جنوں کے لئے
ایک زمانہ بھی کم!

عزمِ جواں کی قسم

تیرے میرے درمیاں
جنگ بس اتنی سی ہے
تجھ کو خدا کا ملال
مجھ کو خدائی کا غم

عزمِ جواں کی قسم

آمدِ خورشید سے
رات گزرنے لگی
اور نکلنے لگا!
چاند تاروں کا غم

عزمِ جواں کی قسم

اور بڑھو ساتھیو
اور بڑھو دوستو
آج اکیلے نہیں!
آج کروڑوں ہیں ہم

عزمِ جواں کی قسم

گوہر جلالی

جہانِ تازہ

میں عصرِ نو کا پیامی میں صبحِ نو کا نقیب
مرے قلم سے شعاعوں کے پھول کھلتے ہیں
نفس میں لیتی ہے انگڑائیاں نسیمِ سحر
نظر سے دامنِ ہستی کے چاک سلتے ہیں

مری نگاہِ تفکر محیطِ کون و مکاں
قدم قدم مری راہیں نفس نفس مرے گیت
افق افق مرا سورج شفق شفق مرا رنگ
چمن چمن مرا پرچم قفس قفس مری جیت

میں رفعتوں کا مغنی حیات کا معمار
بڑھا ہوں آج بغاوت کی شاہراہوں پر
مری کدال پہ تعمیرِ نو کے خاکے ہیں؛
مری نظر ہے فلک بوس عیش گاہوں پر

ندائے کُن کی ہے تجدید میرا نغمۂ ساز
جہانِ تازہ در آغوش میری فکرِ جمیل
اتر کے صدیوں کے تاریک ذہنِ انساں میں
جلا رہا ہوں نئے آفتاب کی قندیل

حسن نعیم

کاروانِ حیات

(چینی کلچرل وفد کے استقبال میں!)

روئے تاریخ پہ نکھرا ہے صداقت کا جمال
داغِ تذلیل سے انسان کی شرافت نہ گئی
جسمِ مجبور سے افکار کی جرأت نہ گئی
دور شمع سے پروانے کی وحشت نہ گئی
چشمِ تہذیب پہ ظاہر ہوا محنت کا جمال
قافلوں کو کسی عنواں سے گزرنا ہی پڑا
حسنِ رفتار سے منزل کو ابھرنا ہی پڑا

جب ہی گزرے ہو زمانے کی نظر اٹھی ہے
عالمِ شب میں لئے شمس و قمر گذرے ہو
کارواں لے کے بہ اندازِ دگر گذرے ہو
سخت راہوں میں اٹھائے ہوئے سر گزرے ہو
خیر مقدم کے لئے روح بشر اٹھی ہے
قیدیٔ زیست رخِ زیست بدل آئے ہیں
بیڑیاں توڑ کے زنداں سے نکل آئے ہیں

محفلِ چین میں پیمانۂ عشرت نہ تھا
شمع محنت سے سیہ خانے سرافراز ہوئے
رقص فولاد سے ویرانے سرافراز ہوئے
کھیت کی گود میں سب دانے سرافراز ہوئے
کتنے افسانوں کا معیارِ صداقت بدلا
ایشیا! خوش ہو کہ افرنگ کا جادو ٹوٹا
فکرِ آدم سے بتِ سنگ کا جادو ٹوٹا

چین کی فنی روایات نے انگڑائی لی.
مسکرا اٹھی ہر اک جام کی مینا کاری
طشت کی خلعتِ اصنام کی مینا کاری
حرف کی علم کے معیار کی مینا کاری
زندہ انسان کے جذبات نے انگڑائی لی!
عظمتِ حال کو ماضی کی سعادت بھی
کہنہ تہذیب سے صدیوں کی امانت بھی

دام بھی صبحِ مسرت کا دیا ہے تم نے
کتنے سر فکر کی عظمت کے لئے نذر دئے
کتنے دل، دل کی صداقت کے لئے نذر دئے
کتنے گھر، گھر کی حفاظت کے لئے نذر دئے
تلخی، جہد کا ہر جام پیا ہے تم نے
فلسفے گہری سیاست کے بھی پایاب ہوئے
سالہا سال کے بیمار شفایاب ہوئے

جیسے ہی قافلہ گذرا ترا دشتِ چیں سے
ارضِ غمگیں پہ ہوئے سرو سمن محوِ خرام
کلیاں جھومیں کہ بہاریں ہوئیں اب انکی غلام
ذرے چمکے جو ہوئے جلوۂ فردا کے امام
قسمتِ ہند بھی جاگ اٹھے گی بخت چیں سے
ہم بھی دیوانے ہیں فرزانوں سے کہدے کوئی
ہم بھی عنواں ہیں، افسانوں سے کہدے کوئی

ریاض رؤفی

ہوائی اڈے

چراغ گل کرو ——— تاریک بام و در کر لو
کوئی شعاع دریچوں سے اب نہ ٹکرائے
کوئی کرن نہ شگافوں کو پار کر جائے

فضا میں چیخ رہے ہیں مہیب طیارے
یہ ظلم و جور کے پیکر، ستم کے ہرکارے
دعا کرو کہ بلا آج سر سے ٹل جائے

کڑک کے ساتھ ہی یہ کیسی روشنی چمکی
یہ زلزلہ — یہ دھماکے — یہ شور، چیخ پکار
کوئی مکان گرا ——— لو زمین پھر لرزی
مرے غریب پڑوسی پہ گر گئی بجلی!

اک اور دھماکا ہوا — اور ایک چیخ اٹھی
کوئی سنبھالو — نسیمہ گری ہے غش کھا کر
ہمارے گھر کی بھی دیوار گر گئی شاید

یہیں قریب کوئی چیخ چیخ کر رو دیا
کوئی نسیمہ کے چہرے پہ چند چھینٹے دو
ہماری سلمیٰ بھی جھولے میں چیخ کر اٹھی
اور اک دھماکا ہوا — اور اک گری بجلی

یہ کتے کون سے سایوں کو دیکھ کر بھونکے
ڈرا رہی ہیں ہمیں اپنے گھر کی دیواریں
نہ اتنی خوف زدہ ہو — ذرا سنبھالو ہوش
تمہیں تو دیکھ کر بچے بھی سہمے جاتے ہیں

اک اور شعلہ گرا ——— اور ایک گونج اٹھی
بتاؤ کون سے جرموں کی یہ ملی ہے سزا
کہ موت سر پہ کھڑی قہقہہ لگاتی ہے
فلک سے آگ برستی ہے — شہر جلتا ہے
ہر ایک گھر میں ہے ماتم — ہر ایک لب پہ دعا
ہر ایک گام سے اٹھی صدائے آہ و بکا!
قدم قدم پہ ہیں لاشے، جگہ جگہ ہے لہو!
کہ جسم جلنے کی آتی ہے، ہر طرف بد بو!
کہاں ہیں آج ہمارے مشیر اور غم خوار
کہاں ہیں آپ کی امداد کے وہ قول و قرار

دھماکے اور ہوئے ——— اور برق لہرائی
یہ کیسی کوؤں کی آواز کان میں آئی
کوئی بتاؤ کہ اس وقت کیا بجا ہوگا
سحر قریب ہے — اب کتنی رات باقی ہے

غلام ربانی تاباں

اپتھر

راستہ آئینہ دار برہمیٔ زلفِ دوست
کوہ کے سنگین شانوں پر پڑا تھا خم بہ خم
اک طرف اتنی بلندی اک طرف اتنا نشیب
پتھروں میں ڈھل گیا تھا زندگی کا زیر و بم

جیسے سازش کر رہے تھے ابر و باد و سنگ و خار
امتحاں جرأت نا آزمودہ کا رہا تھا
اس طرف فطرت مزاحم اس طرف عزمِ تمام
ہر نفس اک جہد تھا ہر گام اک پیکار تھا

جتنی افتادیں پڑیں سوزِ طلب بڑھتا گیا
شوق کو ہر مرحلہ اک تازیانہ ہو گیا
لاکھ فطرت نے چھپایا آدمی سے اپنا راز
پھر بھی وہ صید نگاہ عارفانہ ہو گیا

دامنِ کہسار پر رنگِ خزاں کی آب و تاب
جس کے آگے سرنگوں بہزاد و مانی کے قلم
آذر فردا کی چابک دستیوں کے منتظر
ایک اک پتھر میں کتنے ناتراشیدہ صنم

برف کا ٹیکہ دمکتا تھا جبینِ کوہ پر!
بادلوں کے دوش پر گیسو تھے لہرائے ہوئے
حسن کی آرائشوں میں محو ہو جیسے کوئی
عشق کی تسخیر کے جذبوں کی تہ پائے ہوئے

جھیل کو شمنا ہی ہوائیں گدگدا کی چھیڑتی
تیز جھونکا جب کوئی آجائے پانی مسکرائے
شورش ہر موج میں غلطاں ہزاروں زلزلے
جیسے مانجھی رات کو جہلم کنارے گیت گائے

یہ مناظر جن کا پرتو ہے مرا ذوقِ جمال
ان کو میرے فکر کی مشاطگی درکار ہے
جان سی پڑ جائے ان رنگین نظاروں میں آج
اک ذرا سوز و گدازِ زندگی درکار ہے

(اپتھر کشمیر میں ایک پہاڑی مقام ہے جس کی بلندی تقریباً چودہ ہزار فیٹ ہے یہ نظم اس جواں ہمت بزرگ اور دوسرے ساتھیوں کے نام معنون کرتا ہوں جو اس سفر میں میرے ساتھ تھے ـــــ یا یوں سمجھئے میں جن کے ساتھ تھا۔ تاباں

آل احمد سرور

دو قدریں

میں نے فطرت کے گلستاں سے چنے ہیں کچھ پھول
وہ ستارے ہیں تمہارے لئے خوابوں کا طلسم
تم سرِ میکدہ ہر شام لٹا دیتے ہو
منہ تکا کرتے ہو تم اہلِ کرم کا ہر روز
تم مرے خوابوں پہ ہنستے ہو، مجھے رنج نہیں
کبھی اس وادی میں گل گشت کو آنا ہی نہیں
اہلِ ثروت کے تبسم کے پجاری ہو تم!
لوریاں دیں تمہیں ساحل کے نگہبانوں نے
ہر روش پر تمہیں اک اور گلِ تر کی تلاش
ڈھونڈتے پھرتے ہو ہر شمع میں تم کوئی کرن
میں بصیرت کا پجاری ہوں مسرت کا نہیں
مجھ سے آزادیٔ افکار جدا ہوتی ہے؛
کتنے میخانوں کے در میرے لئے بھی وا تھے
کاغذی پھولوں کی جنت سے مجھے کیا لینا
اہلِ ظاہر مری مستانہ روی کیا جانیں

تم کو اصرار کہ یہ پھول نہیں کانٹے ہیں!
میں نے جو اپنے شبستاں کے لئے چھانٹے ہیں
نور و ظلمت کی کشاکش کا بھرم ہی مجھ سے
رونقِ بارگہِ اہلِ ستم ہے مجھ سے
انہیں خوابوں سے حقائق کے دئے جلتے ہیں
آج خاروں پہ جہاں اہلِ جنوں چلتے ہیں
دولتِ اہلِ نظر سوز و گدازِ پیہم!
اور طوفاں کا ہوا میرے سفینے پہ کرم!
اور نگہ داریٔ آدابِ چمن میرے لئے
شکنِ گیسوئے لیلائے وطن میرے لئے
میرے ہونٹوں پہ تبسم نہیں فریاد سہی
تم تو زناریٔ اوہام ہو، آزاد سہی
تشنگی میری فضیلت ہے مقدر تو نہیں
میرے افکار کی جنت کے برابر تو نہیں
راستہ جاتا ہے یہ دار و رسن سے ہو کر

میری خوشبو اسے کچھ دیر کو یاد آئے گی
جو بھی گزرے گا کبھی میرے چمن سے ہو کر

راہی معصوم رضا

دیوالی

دیپوں کی ورمالا لیکر، رات کھڑی ہے راہ گذر پر

کس کی گردن میں پہنائے
کس کو دیکھے اور شرمائے

دیکھ رہی ہے، سوچ رہی ہے
کس کی باہوں میں سو جائے
کس کے کانوں میں رس گھولے
کس کو دل کا بھید بتائے
شام سے آشائیں بیٹھی ہیں، سپنوں کی ایک سیج لگا کر
دیپوں کی ورمالا لیکر، رات کھڑی ہے راہ گذر پر

اور کوئی یہ سوچ رہا ہے
آشائیں مرجھا جائیں گی!
دیپوں کی یہ کومل کلیاں
صبح تلک کمھلا جائینگی

ان سندر دیپوں کی یادیں
کل تک پھر دھندلا جائیں گی
اب تو پھر یہ دیپ جلیں گے اگلے سال کی دیوالی پر
دیپوں کی ورمالا لیکر، رات کھڑی ہے راہ گذر پر

اِن دیپوں میں تیل نہیں ہے
تھوڑی دیر میں بجھ جائیں گے

رات کے کالے کالے سپنے
آج بھی ہمکو دھمکائیں گے

چیخ اٹھیں گے ڈر کر بچے
اور ہم ان کو بہلائیں گے
آج بھی نیند بلائی جائے، آشاؤں کی لوری گا کر
دیپوں کی ورمالا لیکر، رات کھڑی ہے راہ گذر پر

دیوالی ہے خوش ہونے دو
رونا ہے تو کل رو لیں گے
بچوں کو ضد کر لینے دو
چاند پیالوں میں اتریںگے
آج سبھی کچھ ہو سکتا ہے
ہنس ہنس کر بازی ہاریں گے
آج دھماکا بھی نغمہ ہے، لوگ ہنسیں گے پہلے ڈر کر
دیپوں کی ورمالا لیکر، رات کھڑی ہے راہ گذر پر

دیپ جلاؤ پچھتاؤ گے!
جب یہ رات گذر جائیگی
دیپوں کی ورمالا لیکر
ایک برس کے بعد آئیگی
کیسے کوئی آج بتائے
اگلے سال یہ کیا لائیگی

دیپوں کے دو چار جزیرے یادوں کا ایک سمندر
دیپوں کی ورمالا لیکر، رات کھڑی ہے راہ گذر پر

اشعر نوری

دستک

نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے امنڈ امنڈ کر آؤ صفیں جماؤ علم اٹھاؤ ساتھی قدم بڑھاؤ

آگے پیچھے جاگ رہے ہیں موت کے گہرے سائے
انسانوں کی آبادی پر بربادی منڈلائے
ماتاؤں کی آنکھ کے تارے ہیں آنکھوں سے دور
پھیکا پھیکا سہما سہما مانگوں کا سیندور!

جیون جوت جگاؤ ساتھی جیون امر بناؤ نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے امنڈ امنڈ کر آؤ

چھٹا باپ سے پیارا بیٹا بہن سے بیرن چھوٹا
سہاگنوں کی دنیا اجڑی پیار کا ناتا ٹوٹا!
آہوں میں تبدیل ہوئی ہیں پیار ملن کی باتیں
نس نس میں بس گھول رہی ہیں پورے چاند کی راتیں

پریم کی بانی سے کر اٹھو گھر گھر راگ رچاؤ! نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے امنڈ امنڈ کر آؤ

کونے کونے آگ لگی ہے بھبھک رہے انگارے
تاک لگائے بیٹھے ہیں سب مانو کے ہتیارے
سمے کے سر پر ناچ رہی ہے یدھ کی بپتا بھاری
ایک ہی بھے سے کانپ رہے ہیں کیا نر اور کیا ناری

سلگ رہا ہے جیون ڈیرا امرت رس برساؤ نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے امنڈ امنڈ کر آؤ

ہیروشیما کی چھاتی سے دھواں ابھی تک اٹھتا ہے
زہریلی گیسوں سے ابھی تک مانو کا دم گھٹتا ہے
صحرا صحرا گلشن گلشن چھایا ہے سناٹا!
ہے کوئی جو مارے بڑھ کر موت کے منہ پر چانٹا

دھرتی ماں کے ویر سپوتو ماں کی لاج بچاؤ نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے امنڈ امنڈ کر آؤ

کب تک آخر سہا کریں گے ہم اپنا اپمان!
کب تک آخر دیا کریں گے موت کو ہم بلیدان
کب تک یہ اپرادھ کی آندھی کب تک یہ طوفان
جنگ پرستوں کو جتلا دو جنتا ہے بلوان

دیپ جلاؤ گجر بجاؤ آؤ ساتھی آؤ!! نگر نگر سے ڈگر ڈگر سے امنڈ امنڈ کر آؤ

زبیر رضوی

کسان راجہ

میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری
اونچے پربت میرے ہیں یہ نیلی چھتری میری
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

کھیت ہیں میرے ساگر میرا چنچل لہریں میری
مست پون گھنگھور گھٹائیں اودی جھیلیں میری
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

رنگ برنگے پیڑوں کی یہ جھومتی ڈالیں میری
کھلیانوں پر میرا قبضہ دھان کی بالیں میری
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

پھول بشگوفے، کچی کلیاں ہری بھری پھلواری
کھیت کا ہر پودا میرا گلشن کی ہر کیاری
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

دھرتی کے سینے میں میں نے اپنا خون سمویا!
تپتی دھوپ میں اناج اگائے بیج یہ میں نے بویا
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

اپنے گھر میں بھوک اگائی جگ میں دھن برسایا!
محلوں کو اجیارا بخشا کٹیا کو اندھیارا
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

دانہ دانہ آج مگر ہے ایک آہنی تلوار!!
دہلا دے گی سارے جگ کو آج مری للکار
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری

ڈالی ڈالی پتی پتی پر ہے میرا ادھیکار
مسکائے ہے آج درانتی فصل کھڑی تیار
میں راجہ ہوں اس نگری کا ساری دھرتی میری
اونچے پربت میرے ہیں یہ نیلی چھتری میری

سالک آوارہ

"بات سناؤ"

دھرتی اور آکاش پہ چھائے، کتنے گھور گھور اندھیارے
اندھی آنکھ ہے کیا انساں کی اندھے ہیں آکاش کے تارے
اندھیارے کے جیون داتا کرتے ہیں خوشیوں میں بسیرا
کرنوں کا معدوم نشاں ہے، وہ بہت ہے دور سویرا

صدیوں کے اس اندھیارے میں بانی کے پٹ کھول رہی ہے
ہنس ہنس کر دکھیاری دنیا امرت میں بس گھول رہی ہے

ایک نظر دیکھو تو ادھر بھی، شور ہے کیسا رنگ محل میں
کیسی جوالا پھوٹ رہی ہے، آگ لگی ہے جل میں تھل میں

آگ کی لپٹیں دھواں دھواں، نور اندھیارے سے الجھا ہے
کانپ رہا ہے دھرتی کا دل، ہر سو کیسا شور مچا ہے

دور کھڑے ہیں سکھ کے مانجھی، سکھ کی نیا ڈول رہی ہے
ٹوٹ چلے ہیں دکھ کے بندھن، وقت کی مینا بول رہی ہے

رجنی کے پرکاٹ کے اوشا، جھانکے گی آنچل سے اپنے
جھلمل جھلمل سندر مکھ پر، ناچ اٹھیں گے کل کے سپنے
جیون تٹ پر گھور اندھیارا، آشاؤں کے دیپ جلاؤ
جیون جیوتی تیز ہو جس سے، ساتھی ایسی بات سناؤ

رضیہ سجاد ظہیر

بات سنو

چین دیس سے آنے والو! آؤ من کی بات سنو
بیتی بات نئی ہو جائے پھر مل جائیں ہاتھ سنو
شانتی اور پریم کے دوارے سواگت تمرا کرتے
گاندھی جی کی پھلواری کے اک اک ڈال اور پات سنو
کتنے پیار اور مان سے تم نے ہم سے نین ملائے
کتنی سندر ڈگر چلیں گے ہم دونوں اک ساتھ سنو
پورب سے سورج نکلے گا، گھور اندھیرا چھٹ جائے گا
من کے دیپک جل جائیں جب ہارے کالی رات سنو
بھارت چین کے ہاتھ ملیں جب کون کھڑا ہو آگے
یدھ کرنے والی شکتی ہی کو ہو جائے گی مات سنو
بھارت کا ہے ایک جواہر چین کا ماؤ دوجا
دونوں مل کر آج بنائیں جگ کی بگڑی بات سنو

(دکنو میں چینی ثقافتی وفد کا استقبال)

ہند و چین

۲۰ دسمبر ۵۳ء کو الٰہ آباد میں ادیبوں کی طرف سے چینی ثقافتی وفد کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت ہندی کی مشہور شاعرہ مہادیوی ورما نے کی۔ رہنما وفد مسٹر سی ٹنگ کی تقریر کے بعد چینی شاعر یوان شوئے پو نے ہند کے عنوان سے فی البدیہہ اپنے چار شعر سنائے۔ نظم کا ترجمہ سننے کے بعد ہر شخص اپنے شاعروں کی طرف دیکھنے لگا۔ دوران ترجمہ میں سردار جعفری نے بھی چینی شاعر کے جواب میں چار فی البدیہہ اشعار کہہ لئے تھے جو انھوں نے آخر میں اور تالیوں کی گونج میں سنائے۔ دونوں نظمیں ذیل میں درج ہیں ۔ ادارہ

※

یوان شوئے پو

دیارِ حسن و رعنائی یہی ہے
جدھر دیکھو ہرے پیڑوں کی چھتری
گلاب اتنے بڑے جیسے کٹورے
یہاں کے جنگلوں میں چاندنی سے
چمکتے جھلملاتے مور کے پر!
وہ نیلی گردنیں اور سبز شہپر
یہ وہ گلشن ہے جس کی ڈالیوں پہ
بنائی ہے بہار اپنا نشیمن
یہ ہے وہ مادرِ گیتی کی آغوش
حسیں آرام جاں تصویرِ الفت
جہاں لیتی ہے جرأت اور دلیری
گزشتہ اک صدی کے روز و شب میں
بہادر بیٹیوں نے اس سرزمیں کے
لہو سے اپنے خود سینچا ہے اس کو
بنایا ہے اسے شاداب و گلرنگ
جواں ہمت یہاں کے رہنے والے
عوام اس ملک کے کتنے جیالے
یہ بالکل جیسے میری ماں کے بیٹے
مرے چین اور مری ماں کے چہیتے

(ترجمہ ۔ وامق جونپوری)

سردار جعفری

O

ایشیا تیرے گلستاں کو جگانے کے لئے
چین کے باغ سے سرمست ہوا آتی ہے
دشت و در مثلِ شفق سرخ ہوئے جاتے ہیں
وہ بہار آتی ہے اور لالہ قبا آتی ہے
آج ہر نغمۂ بیداریٔ جمہور کے ساتھ
ماؤ کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
دوستو چین کے پھولوں کو یہ مژدہ دینا
ہند کے پھولوں سے خوشبوئے وفا آتی ہے

ترکی نظم

ناظم حکمت

سوال یہ ہے کہ......

دنیا کی ساری دولت بھی سرمایہ داروں کی پیاس نہیں بجھا سکتی
وہ اپنے پاس دولت کا ڈھیر لگانا چاہتے ہیں۔
اور اس لئے دولت کو جمع کرنے کے لئے
تمہیں اپنی زندگیاں نذر کرنا پڑتی ہیں
اور مٹ جانا پڑتا ہے!

اس میں شک نہیں کہ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کریں گے
انھوں نے خشک جھاڑیوں میں رنگین قمقمے لگا رکھے ہیں۔
اور آنکھوں میں پٹی باندھنے کے لئے
چمکیلے جھوٹے پھندنے رکھے ہیں،
جن کی دُم میں ٹکے ہوئے سلمیٰ ستارے جھلملا رہے ہیں۔

بازار میں انھیں کا نقارہ بج رہا ہے
انھیں کا دور دورہ ہے،
ان کے دلّال عوام کو بہلانے میں معروف ہیں
کوئی اپنے کو شیر بنا کر پیش کر رہا ہے،
اور کسی نے اپنا جسم سر سے الگ کر دیا ہے۔
بازیگر اور مداری بال جیسے مہین تار پر قلابازیاں کھا رہے ہیں، ناچ رہے ہیں۔
الغرض یہ سب نقّال ہمیں لوٹ رہے ہیں، تنباہ کر رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسا ہونا چاہئیے
سادہ لوح، معصوم یا دغا باز اور شعبدہ باز!
اگر تم سادہ لوح اور معصوم ہو تو زندہ رہو گے
اگر دغا باز اور شعبدہ باز ہو تو فنا ہو جاؤ گے

(ترجمہ نسیم احمد)

بنگالی نظم

ہریندر [illegible]

شاعر کا فرض

شاعر!
تمہارا فرض ہے کہ تم حسن و مسرت کے راگ الاپتے جاؤ
سحر خیز اور دلکش الفاظ میں بہار و شادمانی کے گیت لکھو۔
تمہیں منزل تک پہنچنے کے واسطے
اولوالعزم ارادہ
دل کا سرور
اور روح کی شانتی چاہیئے۔

اُن کی جان توڑ کوشش یہی ہے کہ میں زندہ نہ رہوں،
وہ شاعر کے قلم کو جنبش دینے کے لئے
انسان سے دغا کرتے ہیں۔
نزع کی حالت میں بھی فراموش کرنے والے خود غرض،
زندگی کی صحیح راہ سے بہکانے کے لئے
ہر وقت فصد کھولتے رہتے ہیں۔

بے شک!
ہماری نظمیں انسان کے دکھ سکھ کی ساتھی ہیں۔
وہ انسان کے ساتھ زندہ رہتی ہیں،
روتی اور ہنستی ہیں۔
ہم نے قسم کھائی ہے
ہماری نظمیں شکستہ دلوں کو ڈھارس بندھائیں گی
اور زخموں پر مرہم رکھیں گی۔

شاعر کا فرض ہے کہ حسن و مسرت کا راگ الاپے
خوشی کے وقت باغ باغ ہو جائے
اور اندوہناک وقت میں مغموم ہو جائے،
آج کا کام آج ہی کرلے
اور کل کا انتظار نہ کرے۔

بعض شاعر صحیح معنوں میں فنکار نہیں
بلکہ دھوکہ باز ہیں،
جو عوام میں اشتعال ڈال کر آپس میں لڑاتے ہیں۔
وقت ایسے شاعروں کو قابل اور صاحب لیاقت قرار نہیں دیتا،
اور نہ ان کے قلم میں استقامت و استقلال آسکتا ہے
جو انسان کی تباہی کے وقت
اپنے کو سپاہی نہیں بنا سکتا!

(ترجمہ:- نسیم احمد)

ایک ہنگرین کہانی

سیگمنڈ وہیس

"سات پیسے"

دیوتاؤں نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے، کہ غریبوں کو بھی ہنسنے کی توفیق ہونی چاہیئے۔ جھونپڑوں سے نہ صرف نالہ وزاری کی صدائیں ہی
ند ہوتی ہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے بھرپور قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں۔ ویسے تو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غریب اکثر اس وقت ہنستے ہیں
ب انھیں چلانا ہوتا ہے۔

اُس دنیا کو میں بخوبی جانتا ہوں، اُس نسل نے جس سے کہ میرا باپ تعلق رکھتا ہے بڑی مسرت کے دن گذارے تھے۔ اُن دنوں میرا باپ
یک انجن فیکٹری میں مزدور تھا۔ اس نے یا کسی اور شخص نے ان دقتوں کا ذکر خیر کبھی نہیں کیا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں اپنی آئندہ زندگی میں کبھی بھی
س قدر نہ ہنس سکوں گا جس قدر کہ میں اپنے بچپن کے ان تھوڑے سے سالوں میں ہنستا رہا۔ میں بھلا ہنس بھی کیونکر سکتا ہوں جب کہ میری گلابی رخساروں
الی ہنس مکھ ماں اب اس دنیا میں نہیں ہے جو اس بے ساختگی سے ہنسا کرتی تھی کہ اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے تھے اور کھانسی کی وجہ سے اس کا سانس
کھڑ جاتا تھا۔ اور پھر اُس روز تو ہنستے ہنستے وہ بے حال ہوئی جا رہی تھی جب کہ سارا دن ہم دونوں سات پیسے تلاش کرتے رہے اور بالآخر ہم نے انھیں ڈھونڈ ہی
کالا۔ تین پیسے تو کپڑے سینے کی مشین کے درازمیں پڑے تھے، ایک کپڑوں والی الماری میں ـــــ باقی پیسے تلاش کرنے میں البتہ ہمیں ذرا دقت پیش آئی۔

تین پیسے تو میری ماں نے خود ہی ڈھونڈ نکالے تھے، اس کا خیال تھا کہ مشین کی دراز میں کچھ اور پیسے ہوں گے، کیونکہ کپڑے سینے کے عوض اُسے جو
کچھ بھی ملتا تھا وہ اس دراز میں ہی رکھ چھوڑتی تھی جس کے لئے تو مشین کا دراز گویا قارون کا خزانہ تھا کہ جب بھی ہاتھ ڈالا کچھ نہ کچھ نکل آیا۔ اسی لئے تو میں
پنی ماں کو دراز میں سوئیوں، انگوٹھیوں، نلکیوں، قینچیوں اور دیگر چھوٹی موٹی چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے دیکھ کر ہمہ تن اشتیاق بنا ہوا تھا۔

"چھپ گئے ہیں کہیں سب کے سب"

"کون؟"

"ننھے منے سکے" میری ماں نے ہنستے ہوئے کہا اور دراز کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔

"میرے بچے! آؤ نا ہم ان شرارتی سکوں کو تلاش کریں ـــــ ہائے یہ ننھے منے شیطان"

وہ زمین پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور دراز کو یوں پاس رکھ لیا جیسے اُسے اُن کے اُڑ جانے کا خدشہ تھا، پھر اچانک ہی اس نے دراز کو اوندھا
کر دیا بالکل اس انداز سے جس طرح کہ تیتری پکڑتے وقت ہیٹ کو الٹ دیا جاتا ہے۔

ایسے موقعہ پر ہنسی ضبط کرنا قطعی ناممکن تھا۔

"ارے، اس کے اندر ہیں سب کے سب" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ڈھکنے کو یوں کا توں پڑا رہنے دیا ـــــ "اب تو جو کوئی بھی
ہوگا، باہر نکل آئے گا"

میں بھی زمین پر بیٹھ کر کسی ننھے منے چمکتے ہوئے سکے کے سر ابھارنے کا انتظار کرنے لگا۔ اندر کوئی چیز بھی نہیں سرک رہی تھی، درحقیقت ہمیں
توقع بھی نہیں تھی کہ اس کے اندر کوئی اور سکہ ہوگا۔

ہم اپنے اس طفلانہ مذاق پر ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے دراز کا ڈھکنا ذرا سا اٹھا دیا۔

"ارے ارے! میری ماں نے مجھے تنبیہہ کی" ذرا دھیان سے، کہیں یہ فرار نہ ہو جائیں، تمہیں تو شاید پتہ نہیں کہ پیسہ کس پھرتی سے کھسکتا ہے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔"

ہنسی کے مارے ہم نڈھال ہوئے جا رہے تھے۔ ذاتی تجربے کی بناء پر ہمیں معلوم تھا کہ پیسہ کس تیز رفتاری سے بھاگ جاتا ہے۔ جب ہم ذرا سنبھلے تو میں نے ڈھکنا اٹھانے کے لئے پھر ہاتھ بڑھایا۔

"اوہ!" میری ماں نے سٹپٹا کر بگلت کہا۔ میں نے گھبرا کے اپنا ہاتھ یوں پیچھے کھینچ لیا جیسے وہ جلتی ہوئی انگیٹھی سے لگ گیا ہو۔

"احتیاط سے ——— ہاں! تم تو بس اسے بھگا کر ہی دم لو گے۔ جب تک یہ نیچے پڑا ہے تب تک ہی یہ ہمارے پاس ہے۔ کچھ دیر اور اسے وہیں پڑا رہنے دو، تمہیں پتہ تو ہے کہ مجھے کپڑے دھونے ہیں۔ اس کے لئے مجھے صابن درکار ہے، اور صابن کی ٹکیا سات پیسوں سے کم میں آتی ہی نہیں، تین تو آگے ہی میرے پاس ہیں، چار پیسوں کی اور ضرورت ہے۔ وہ بھی اسی گھر میں کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے مگر وہ اپنا سکون برباد کرنا نہیں چاہتے اگر وہ روٹھ کر چلے گئے تو پھر کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ جلد بازی نہ کرو۔ دولت بڑی حساس ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ نرمی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہئیے۔ یہ تو معمولی معمولی باتوں پر ناراض ہو جاتی ہے ——— تمہیں کوئی دل پسند نغمہ تو یاد ہوگا، شاید ہم اسے مسحور کر کے ہی اس کے بل سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔

خدا ہی جانتا ہے کہ ہم ان استہزائیہ جملوں پر کس شدت سے ہنستے رہے ؎

جا پا پیسہ، باہر نکلو
لگ گئی آگ تمہارے گھر میں

اتنا کہہ کر میں نے ڈھکنا اٹھا دیا۔ اس کے نیچے سینکڑوں قسم کی فضول فضول سی چیزیں پڑی تھیں مگر پیسہ ایک نہ تھا۔ میری ماں بُرا سا منہ بنا کر ان چیزوں میں ہاتھ مارتی رہی مگر بے سود۔

"کس قدر افسوس کا مقام ہے" اس نے کہا۔ "کہ ہمارے پاس ایک میز تک نہیں۔ اگر ہم اسے کہیں میز پر اُلٹتے تو ظاہر ہے کہ اس کا بہت زیادہ احترام ہوتا۔ تب تو ضرور ہی کچھ مل جاتا اس میں سے"۔

میں نے وہ سارا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھر دراز میں رکھ دیا۔ اسی دقیقے میں میری ماں کسی سوچ میں کھو گئی، شاید وہ اس سوچ میں تھی کہ غلطی سے کہیں اس نے پیسے کسی اور جگہ تو نہیں رکھ چھوڑے کہ اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ تاہم ایک خیال میرے ذہن میں بھی چکر لگا رہا تھا۔

"امی! مجھے پتہ ہے کہ ایک پیسہ کہاں پڑا ہے۔"

"کہاں؟ بتاؤ نا، چلو آؤ پھر ڈھونڈیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ برف کی مانند وہ بھی پگھل جائے۔"

"مینٹل پیس پر ——— شیشے کے اس گلاس میں۔"

"اوہ، نادان بچے، تم نے پہلے کیوں نہ بتا دیا، اب تو وہ وہاں نہیں ہونے کا!"

ہم اٹھ کر مینٹل پیس تک گئے، واقعی گلاس کے پیندے سے لگا ایک پیسہ ہمیں مل گیا، تین دنوں سے میں اسے اڑانے کی فکر میں تھا مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں اس سے ایک للی پوپ خریدنا چاہتا تھا، مگر ذرا حوصلے کی بات تھی۔

"خوب! تو گویا کل چار ہو گئے، مسکراؤ نا اب تو میرے لال۔ دیکھو ہم نے آدھے سے زیادہ تو فراہم کر لئے ہیں بس صرف تین اور چاہئیں ہمیں اب، جیسے یہ پیسہ ہمیں ایک گھنٹے کے اندر اندر مل گیا ہے ویسے ہی باقی بھی چار بجے تک مل ہی جائیں گے اور پھر شام ہوتے ہوتے میں سب کپڑے دھو ڈالوں گی۔ ارے ہاں، ذرا باقی پیالیوں میں دیکھ لیں، شاید کچھ ہاتھ لگ ہی جائے۔"

"کاش، ہر ایک پیالی میں ایک ایک پیسہ ہوتا ———" (تب تو بہت سے اکٹھے ہو جانے تھے)۔ بہت دیر تک امی مجھے ان پیالیوں کا شجرہ نسب بتاتی رہی اور مارے ہنسی کے ہم لوٹ پوٹ ہوتے جا رہے تھے۔

"ٹھہرو!" اس نے اچانک رک کر کہا ـــ "ابھی مل جاتے ہیں دو پیسے۔ تمہارے باپ کے کپڑوں میں تلاش کرتے ہیں۔"

دیوار میں کیل لگا کر ہم نے کپڑے لٹکا رکھے تھے۔ کس قدر اعجاز کی بات ہے کہ جونہی میری ماں نے پہلی جیب میں ہاتھ ڈالا تو...... ایک پیسہ مل گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھا" اس نے کہا ـــ "مل ہی گیا نا۔ اچھا تو کتنے ہو گئے کل ملا کے۔ اب تو گننا بھی مشکل ہو جا رہا ہے۔ ایک، دو، تین، چار ـــ پانچ۔ اب تو صرف دو کی کمی رہ گئی ہے۔ دو پیسے ہوتے بھی کیا ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ جہاں پانچ اکٹھے ہو گئے، وہاں دو تو بہر حال مل ہی جائیں گے۔" اس نے بڑی جوش و خروش سے باقی کی جیبیں ٹٹولنا شروع کر دیں، مگر کچھ نہ ملا۔ ایک اور پیسہ تک نہ مل سکا۔ باقی دو پیسے کسی ترکیب سے بھی باہر نکلنا پسند نہیں کر رہے تھے۔

اعصابی تناؤ اور جسمانی تھکان کی وجہ سے میری ماں کے گال تمتما رہے تھے۔ اسے زیادہ کام کرنے کی اجازت نہیں تھی، کیونکہ اس طرح وہ جلد ہی بیمار پڑ جاتی تھی۔ یہ تو بے شک ایک غیر معمولی کام تھا، روپیہ فراہم کرنے سے کسی کو روکا جا سکتا ہے بھلا۔ چار بج چکے تھے۔ شام کی سیاہی اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ میرے باپ کو اگلی صبح ایک دھلی ہوئی قمیض کی سخت ضرورت تھی۔ مگر محض کنویں کے پانی سے تو میل سے لتھڑی ہوئی قمیض نہیں دھل سکتی ہے نا۔

میری ماں نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا ـــ "میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، میں نے اپنی جیبیں تو دیکھی ہی نہیں۔"

اور جب اُس نے اپنی جیبیں دیکھیں تو ـــ آپ یقین کریں، ایک پیسہ مل گیا ـــ چھٹا پیسہ۔

ہم نہایت مضطرب ہوئے جا رہے تھے ـــ اب صرف ایک پیسے کی کمی تھی۔

"اپنی جیبیں بھی دکھاؤ تم۔ شاید ان میں بھی ایک آدھ پڑا ہو۔"

"میری جیبیں تم بے شک دیکھ لو، بالکل خالی ہیں ـــ" اور واقعی ان میں کچھ نہیں تھا۔

شام کی سیاہی نے فضا پر پوری طرح اپنا تسلط جما لیا تھا۔ ادھر ہمیں پیسوں کے ہوتے ہوئے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ہمارے پاس ایک پیسہ تک نہیں۔ دوکان دار اُدھار نہیں دیتا تھا۔ ہمارے پڑوسی بھی ہماری طرح مفلوک الحال تھے، اور پھر ایک پیسہ مانگنے بھی کوئی جاتا ہے۔

اپنی بے سروسامانی پر دل گداز قہقہے لگانے کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں تھا ـــ اسی اثنا میں ایک فقیر آ گیا اور بڑی درد بھری آواز میں ایک المناک نغمہ الاپنے لگا۔ ہنستے ہنستے میری ماں بے ہوش ہوئی جا رہی تھی۔ "بس کرو اب، اے بھلے آدمی۔" اس نے کہا ـــ "دوپہر سے میں ایک پیسے کے لئے ٹکریں مار رہی ہوں ـــ صابن کی ٹکیا خریدنے کے لئے صرف ایک پیسہ کم ہے۔"

مسکین صورت بوڑھا فقیر خالی خولی آنکھوں سے میری ماں کی طرف دیکھنے لگا ـــ "ایک پیسہ" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"ایک تو میں بھی دے سکتا ہوں۔"

"حد ہو گئی یہ تو ـــ فقیر سے خیرات!"

"کوئی بات نہیں، میری بچی ـــ یہ رائیگاں نہیں جائے گا۔" اُس نے ایک پیسہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے!" میری ماں نے کہا ـــ "کہ کوئی........" اچانک وہ لحظہ بھر کے لئے سکتے میں آ گئی، اور پھر ایک خفیف شگفتہ قہقہہ مارا ـــ "روپیہ بھی کیا خوب وقت پر ہاتھ لگتا ہے! آج میں کپڑے کیونکر دھو سکتی ہوں۔ اب تو اندھیرا ہو چکا ہے اور ہمارے ہاں لیمپ میں تیل بھی ختم ہے۔" ہنستے ہنستے اس کا دم اُکھڑ گیا اور وہ نڈھال سی ہو گئی۔ اور جب میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا جبکہ اپنے چہرے کو ہتھیلیوں میں چھپائے وہ جھکی ہوئی تھی تو کوئی گرم سی سیال چیز میرے ہاتھوں پر گری۔

وہ خون تھا ـــ اس کا پیارا پیارا متبرک خون ـــ میری ماں کا خون ـــ اس ماں کا جو ہنس سکتی تھی اس انداز سے کہ غریبوں میں بھی بہت تھوڑے ہی ہنس سکتے ہوں گے۔

○

(ترجمہ:- نرنجن تسنیم)

ملک راج آنند

"تمہیں کتنی دکھائی دیں؟ بولو کتنی؟" کرشن نے پوچھا۔

"پانچ —" گوپال نے جواب دیا۔

"جا — جھوٹے کہیں کے — پوری بمبئی میں تین کیڈلک نہیں ہیں —"

"ارے جا — تو کیا جانے — میں کم سے کم چار تو گن چکا ہوں — ایک کے بارے میں مجھے یقین نہیں — وہ شاید بیوک ہوگی —"

"آہ۔ سالے تو کیڈلک اور بیوک میں فرق کو بھی نہیں جانتا — ہاتھی اور بھینس میں فرق بھی........"

"جتنی کیڈلک گاڑیاں میں نے دیکھی ہیں انھیں میں گن کر بتا سکتا ہوں — پہلی گورنر کی تھی — اس میں اس کا پوتا اور چپراسی تھا —"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ گورنر کا پوتا تھا۔ شیخی خور — جیسے تم گورنر کے شوفر ہو —"

"اگر میں گاڑی چلانا سیکھ لیتا تو شوفر بننا کیا بڑی بات تھی — کیا سابو فلمی ستارہ نہیں بن گیا تھا اگرچہ وہ مہاوت تھا — اور بہت سے میٹھ....؟"

"ارے جا سیٹھو! اُلو کے پٹھے — بھولو نہیں کہ تم بھینگے ہو — اور پھر یہ دلیپ کی طرز کا تمہارا حلیہ —"

"دلیپ کمار نے مجھے ایک دفعہ اپنی موٹر کی خبر گیری کے لئے چار آنے دئے تھے — میں نے اسے سروج بابو سے یہ کہتے سنا تھا کہ میں اگر بھینگا نہ ہوتا تو اچھا ایکٹر بن سکتا تھا۔"

"سروج بابو کون ہے — کیا وہی جو دلیپ کمار کی موٹر میں اکثر ہوتا ہے؟"

"ہاں — وہ دلیپ کی دُم ہے۔"

"سالے — وہ تیرا بھرکس نکال دے گا اگر اس نے کہیں یہ بات کہتے سن لی۔"

"ارے نہیں — وہ بہت اچھا لڑکا ہے — بنگالی بابو ہے — اس نے تو آٹھ آنے مجھے یونہی دے دئے تھے —"

"اچھا تکمے! ادھر دیکھ۔ شاید موقع ہاتھ لگ جائے۔ ڈگرو دلیپ سے کہیں اور جا رہا ہے۔ اب ہمارے لئے وہاں قبضہ جما لینے کا اچھا موقع ہے۔"

"اگر اس نے ہماری کھال اُدھیڑی تو! بڑا بدمزاج ہے سؤر!"

"وہ تو ہے — لیکن ہمیں بڑی احتیاط سے چلنا ہوگا —"

"ذرا بارش ہونے تک ہمیں انتظار کرنا چاہئے — شاید پھر اُسے ہم پر رحم آجائے۔"

"سالے — تم ہمیشہ بزدل ہی رہے اور بزدل ہی رہوگے، چاہے کتنی ہی شیخی کیوں نہ مارو —"

گوپال پر بزدل اور شیخی خور ہونے کا الزام لگا کر کرشن اٹھ کھڑا ہوا اور یہ دیکھنے لگا کہ ڈگرو کہاں ہے اور بارش سے پہلے برساتی کے نیچے سونے کے لئے جگہ حاصل کرنے کا کتنا امکان ہے۔ اس نے دیکھا کہ ڈگرو اپنی جگہ سے ذرا ہٹ چکا تھا۔ لیکن اس کے سونے سے پہلے وہاں کیسے پہنچا جائے۔ وہ بھونڈی والا اینڈ سنز کا ابھی تنخواہ پانے والا چوکیدار مشہور تھا۔ اس کے علاوہ بڑا غصیلا تھا جیسے پاگل ہو، اور بدقسمتی سے بارش سے پناہ لینے کی جتنی بھی جگہیں تھیں ان پر دوسروں نے قبضہ جما لیا تھا کیونکہ آج وہ رات کے نو بجے تک پرنسس گیٹ یا ایروز سینما کا شو ختم ہونے تک موسلا دھار مینہ کی وجہ سے رکے رہے تھے جیسے خود سے نگاہ ڈالنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ ڈگرو اپنی جگہ سے ہٹ چکا ہے اس لئے کرشن نے حسب معمول گوکیوں کا سا انداز اختیار کرتے ہوئے

گوپال سے کہا۔

"جا اور دیکھ برساتی کے نیچے ہم دونوں کے لئے جگہ ہو سکتی ہے کہ نہیں؟"

گوپال جو عمر میں چھوٹا تھا کرشن کے حکم کی بجا آوری کے لئے چل پڑا اس لئے نہیں کہ وہ اپنے بڑی عمر کے ساتھی سے خوف کھاتا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ چھوٹا تھا۔ ہمارے ملک میں چھوٹے جو روایتی طور پر بڑوں کا کہنا مانتے ہیں اس کے پیش نظر گوپال چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا تھا۔ اس کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دبلا پتلا تھا۔ گوپال پارے کی طرح لپکتا۔ یہ اس کی غیر معمولی اور پُر اسرار خوبی تھی جس کی مدد سے وہ فوراً بھانپ لیا کرتا تھا کس خاتون اور شریف مرد کو ٹیکسی چاہئیے یا پھر کون اپنی موٹر ٹھہرانا چاہتا ہے۔ وہ چرچ گیٹ کے ہر دوسرے لڑکے سے پہلے پہنچ جاتا تھا اور سود مند جملوں سے ان کے ساتھ مخاطب ہوتا۔ "کیوں صاحب ٹیکسی؟" "میم صاحب ٹیکسی!" یا پھر "صاحب موٹر سنبھالیں گا (یعنی اپنی موٹر دیکھئے گا)" اس کی بھینگی آنکھ میں ایک شرارت آمیز چمک ہوتی اور اس کے نرم اور سیاہ گالوں پر جوانی کی آب و تاب ہوتی جس کی وجہ سے اس کی درخواست کو رد کرنا مشکل ہو جاتا۔ موٹروں کی دیکھ بھال اور ٹیکسیں کو بلا کر لانے کے پیشے میں جس کامیابی سے وہ بہرہ مند تھا اس نے اسے پھرتیلا اور خوش باش بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپر پرکیش کے گورکھپور ضلع کے ایک یتیم لڑکے کی لازمی نیک طبعی کو قائم رکھتا تھا۔ وہ وہاں سے قحط کے شروع ہو جانے پر آیا تھا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح محض اپنی ذہانت پر زندہ تھا۔ کرشن ایک پنجابی لڑکا تھا جو امرتسر میں اپنے گھر سے بھاگ آیا تھا۔ وہ گوپال کو اکثر چھیڑتا رہتا کیونکہ وہ اس سے دو سال بڑا تھا اور جسمانی اعتبار سے بھی اس سے فائق تھا، قوی ہیکل تھا۔ ان دونوں کا اچھا گذارہ ہو رہا تھا اور وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے اور اس پیشے کے دوسرے لڑکوں کی غلیظ بہتان تراشی کے خلاف وہ ایک دوسرے کا ساتھ رہتے تھے۔ کم سے کم ان دونوں میں ایک ہی دیوتا کی دو مختلف شخصیتیں مشترک تھیں ——— کرشن گوپال ———

گوپال نے اپنی دھیمی چال سے کچھ اس طرح کا بہانہ کیا جیسے وہ لاتعلقی کے انداز میں ایلفنسٹن سرکل کی پان بیڑی کی دکان پر جا رہا ہے۔ وہ برساتی کے قریب گذرا۔ تاریکی اور اپنی آنکھ کے عجیب و غریب زاویے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے صورتِ حال کی تصدیق کی۔ اور اسے پتہ چلا کہ وہاں واقعی ان دونوں کے لئے جگہ تھی کہ وہ دونوں دوسری اور تیسری سیڑھی پر رینگ کر پہنچ سکیں۔ اس لئے اس نے واپس آکر اطلاع دی۔

"وہاں کافی جگہ ہے اگر وگدو ہیں ...."

"اچھا ——— تو پھر ہم دونوں چلیں گے اور پڑ رہیں گے۔ وہ جگہ اس کے باپ کی جاگیر نہیں کہ وہ ہمیں روک سکے۔"

اس جری اعلان کے بعد کرشن اٹھا اور رہنمائی کرنے لگا۔ گوپال اس کے عقب میں کپڑوں کی گٹھری اٹھا کر چلنے لگا۔

وگدو دفتر کی دہلیز کی اوپر کی سیڑھی پر چت لیٹا ہوا بڑے تسلسل کے ساتھ خراٹے لے رہا تھا۔ کرشن اور گوپال دبے پاؤں نچلی سیڑھی تک پہنچے۔

کرشن نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گوپال کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور وہ بڑی احتیاط سے دوسری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔

گوپال بھی کافی احتیاط سے آگے بڑھا لیکن لڑکپن کی بے لگام معصومیت کی وجہ سے وہ کرشن کی بات کو بھول گیا کہ وہ منہ سے ایک لفظ ادا نہ کرے ——— اور اس نے اپنے فطری لہجے میں پوچھا ——— "کیا میں گٹھری کھول دوں؟"

وگدو کے مسلسل خراٹوں کی لے میں انتشار پیدا ہوا اور اس نے زور سے سانس لی جیسے اس کے دل کی دھڑکن یک بیک بند ہو گئی ہو۔

"چُپ ——— سالے" کرشن نے گوپال کو گالی دی۔

گوپال بوکھلا گیا اور ایک لمحے کے لئے بُت بنا کھڑا رہا۔ وہ اپنی غلطی پر خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے گٹھری اپنی پشت پر سے اس سیڑھی پر پٹک دی جہاں کرشن بیٹھا ہوا تھا۔

گٹھری جب دھم کر کے گری تو وہ وگدو کے بدن سے جا ٹکرائی۔

دونوں لڑکوں نے اپنی سانس روک لی جیسے قیامت قریب ہو۔

وگدو آہستگی کے ساتھ کھانسا۔ ایک لمبی سانس لی۔ کراہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کا منہ اب بازار کی طرف تھا اگرچہ اس کا چہرہ اس کی ہتھیلی پر ٹکا ہوا تھا۔

کرشن کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ شیر کے منہ میں ہو کیونکہ دگدو کا چہرہ اس کے سر سے ایک ہی فٹ دور تھا۔ اپنے سکون کو بحال کرنے کے لئے اس نے دگدو کی بڑی مونچھوں کی طرف ایک مزاحیہ اشارہ کیا۔

گوپال مسکرایا اور نچلی سیڑھی پر پھرتی سے بیٹھ گیا۔ دفعتاً سوئے ہوئے دگدو کو چوکیدار کی چھٹی حس کی بنا پر اپنے آرام میں خلل آدمیوں کا احساس ہوا۔ وہ چونک پڑا اور اس نے اپنے سر کو اوپر اٹھایا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا وہ چلایا۔

"کون ــــ کون ہے ــــ ؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کرشن اور گوپال ہیں ــــ ہم دو لڑکے ہیں دگدو ــــ" گوپال نے ہمت سے کام لیا۔

"چلے جاؤ یہاں سے ــــ" دگدو نے غصے میں کہا۔

"مگر تمہارے دفتر کا دروازہ بند ہے اور تمہارے پیچھے لوہے کا پھاٹک ہے۔"

"جاؤ ــــ جاؤ ــــ!" چوکیدار چلایا۔

"لیکن ہم تو پہلے بھی یہاں سو چکے ہیں جب پٹھان لالہ یہاں چوکیدار ہوا کرتا تھا۔"

"لالہ کا پتہ کٹ گیا ہے۔ اور اب میں یہاں ہوں ــــ جاؤ ــــ چلے جاؤ ــــ کہیں تمہیں میری لاٹھی کا مزہ تو نہیں چکھنا!"

دونوں لڑکے ڈرتے ڈرتے اٹھے اور دوسرے دروازے کی دہلیز کی طرف بڑھے۔ یہ دروازہ کوئی سات گز دور تھا جس پر کینوس کا مختصر سا شامیانہ لگا ہوا تھا۔

"سالا!" گوپال نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ہاں ــ سالا ــــ" کرشن نے ہاں میں ہاں ملائی۔

جب وہ نئی دہلیز کی سخت سیڑھی پر بیٹھ چکے تو کچھ لمحوں کے لئے خاموش رہے۔ یہ خاموشی شکست کی خاموشی تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی جانب بھی نہ دیکھا اور اپنا سامان لئے ہوئے بیٹھے رہے۔ سڑک کی تاریکی خطرے کا پیش خیمہ سیاہ بادلوں سے اور گہری ہو چکی تھی۔ یہ بادل ہاتھیوں کے جھنڈ کی طرح تھے جو کسی وقت بھی کانوں کو بہرہ بنا دینے والی آوازیں نکال سکتے تھے۔ اگر ٹھنڈی ہوا نے انھیں ذرا سا بھی چھیڑا۔

گوپال نے آخرکار گٹھری پر سر رکھ دیا جیسے اس پر غنودگی طاری ہو رہی ہو۔ کرشن نے اپنے بدن کو سکیڑ دیا تاکہ اپنے ساتھی کو ٹانگیں پھیلانے کی اجازت دیدے۔ گوپال اپنے دوست کی اس نوازش پر جتنے میٹھے انداز میں سوچ رہا تھا اتنی ہی تلخی سے وہ دگدو کے رویے پر غور کر رہا تھا۔ اور پھر اس کے احساسات اس نقطے پر مرکوز ہو گئے کہ اگر کسی کو چند آنے مزید کمانے میں کہیں دیر ہو جائے تو پڑ رہنے کے لئے جگہ حاصل کرنا کس قدر محال ہے ــــ اور اس نے دبی زبان میں بارش کو گالی دی ــــ "بہن .... بارش!" بارش ہی ان کی اس بے آرامی کا باعث تھی، کیونکہ عام دنوں میں تو بمبئی میں پٹڑیوں پر کہیں بھی جگہ مل جاتی ہے اور ہر کوئی پاؤں پھیلا کر سو سکتا ہے۔ پھر اس نے دل میں اٹھتی ہوئی ہوک کے ساتھ مئی کی ان راتوں کو یاد کیا۔ ابھی ایک مہینہ بھی تو نہیں ہوا جب چرچ گیٹ کے لڑکوں کے پورے گروہ کے ساتھ فیروز شاہ مہتہ روڈ کی ایک چھوٹی سی گلی میں جس پر انھوں نے بڑ بول دیا تھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ تاش کھیلتے رہے تھے گپیں ہانکتے رہے تھے اور سونے سے پہلے ایک دوسرے کو گندی کہانیاں سناتے رہے تھے۔ اس کے باوجود گوپال کو نیند آگئی کیونکہ وہ ابھی تو خیر تھا۔ تھک جاتا تھا اور جلدی غافل سو جاتا تھا جس طرح بچے خود کو بھوکا محسوس کرتے ہیں تو ان کو فوراً کچھ کھانے کو ملنا چاہیئے۔ کرشن اپنے آپ کو گوپال کا محافظ سمجھتا تھا اور خود کو مجرم بھی خیال کرتا تھا کہ اپنے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھا کر جھڑکتا رہتا تھا یا پھر ایسا کرنے کا بہانہ کرتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ گوپال سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا نہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھا سکتا تھا ــــ وہ اتنا چالاک اور ہوشیار تھا۔

کرشن نے گوپال کے گٹھے ہوئے جسم کا بڑی شفقت سے جائزہ لیا لیکن وہ اس کے خدوخال کو تاریکی کی وجہ سے اچھی طرح نہ دیکھ سکا کیونکہ تاریکی نے اب ہر چیز کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا ــــ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گلی میں داخل ہو رہے تھے۔ کرشن نے نظر اٹھائی اور بادلوں کو اتنا نیچے دیکھا جیسے وہ گلی کی بلند عمارتوں کی چھتوں کو چھو رہے ہیں۔ ابھی اس نے اپنی نگاہ ان بادلوں پر سے ہٹائی نہیں تھی کہ سیاہ اور کوہ پیکر ہاتھیوں کے جھرمٹ کو چیرتی ہوئی بجلی کی ایک لکیر کوندی اور اس نے

تازیانے کی طرح ان ہاتھیوں کو منتشر کر دیا۔ ہاتھی چنگھاڑنے اور ترشح گرم گرم پسینے کی طرح بہنے لگی اور پسینہ زمین پر گھلنے لگا۔

گوپال کو بادلوں کی گرج نے متاثر نہ کیا۔ وہ اتنی گہری نیند سو رہا تھا۔ کرشن غصے سے پہلے اگرچہ دروازے کے ساتھ لگ کر جو شامیانے کے کافی سائے تلے تھا۔ چلّایا مگر گوپال کی آنکھ نہ کھلی۔ جب بارش کے بہت سے قطرے اس کے چہرے اور اس کی ٹانگوں پر گرے تو وہ اٹھا اور اپنی گردن پر پسینے کو ہاتھ سے پونچھنے لگا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ پراگندگی کے عالم میں ہو۔

"ابے او ـــــ" کرشن نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "گٹھڑی بھیگ جائے گی اور پھر اپنے پاس خشک کپڑے بھی پہننے کو نہیں رہیں گے۔"

گوپال کپڑوں کے بھیگ جانے کے بعد کی اس تباہی کی یاد دہانی پر بڑی پھرتی کے ساتھ اٹھا۔ بارش سے اٹھتی ہوئی ٹھنڈی بھاپ کی وجہ سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور جب کرشن نے اس سے گٹھڑی لے کر اپنے پیٹ سے لگالی تو گوپال کچھ کچھ بے حسی اور قدرے بے زاری کے عالم سے ابھر کر بیداری کی سرحد تک پہنچ گیا اور پھر چند لمحوں میں اُسے سامنے موسلا دھار مینہ پڑتا ہوا نظر آیا۔

"یہ بمبئی کی سالی بارش۔ جیسے کسی نے ہمارے سروں پر پانی کا گھڑا پھوڑ دیا ہو!" اُس نے گالی دیتے ہوئے کہا اور یہ بات بھول گیا کہ بارش ہوتی ہوئی دیکھ کر اکثر یہی جملہ دہرایا کرتا تھا۔ اور پھر اُس نے اپنی ذہانت کا مزید مظاہرہ کرنے کی غرض سے اپنے وطن کی یاد میں ایک جملہ کہا۔ "ہمارے یہاں مینہ تو اس طرح پڑتا ہے جیسے دلہن چھم چھماتی ہوئی آئے۔"

"بکو اس بند کرو۔ تم اور تمہاری دلہن......." کرشن چلایا وہ بارش کے شور کی وجہ سے چلّایا ہوا تھا۔ بارش کی پھوار ان کے بدن کے نچلے حصے کو بھگوتی ہوئی گذر رہی تھی اور ان کو بھگو دینے کے خطرے سے دوچار کر رہی تھی۔

گوپال نے گالی کو برداشت کر لیا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ آخر بارش کے ایک مضبوط تھپیڑے نے اسے بالکل جھنجھوڑ دیا۔

"اوہ ـــ ایشور!" وہ چلّایا ـــ اور ایشور کا نام اس کے لبوں پر خود بخود آگیا۔

گوپال کی مایوسی کو دیکھتے ہوئے کرشن نے اُسے بہلانے کی غرض سے کہا: "یہ دیکھو میں سیٹھ کی طرح معلوم ہوتا ہوں جیسے دولت مجھے مل گئی ہو۔" لیکن گوپال نے اپنے دوست کی طرف نگاہ نہ کی۔ وہ اس جملے سے خوش بھی نہ ہوا کیونکہ بارش کے چھینٹے اب لہروں کی صورت میں گر رہے تھے اور وہ سر سے پاؤں تک بھیگ چکے تھے۔ اس کے علاوہ دگدو کی برساتی سے غصیلی آوازیں آرہی تھیں جیسے وہ ان کو پناہ دینے کے لئے بلا رہا ہو۔

"میں دگدو کی برساتی میں جاتا ہوں ـــ تم آؤ نہ آؤ ـــ" گوپال نے زوردار انداز میں کہا اور دگدو کی برساتی کی طرف بھاگا۔

کرشن نے اپنے ساتھی کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر اس نے دگدو کو بلند آواز سے چلاتے ہوئے سنا۔ کچھ سوچے بغیر کرشن نے اپنے ساتھی کا تعاقب کیا۔ کپڑوں کی گٹھڑی اس کی پیٹھ پر تھی۔

جب وہ چوبی برساتی کی سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو انھوں نے بارش کے شور و غل سے بلند گالیاں اور دھمکیاں سنیں۔ یہ آوازیں اوپر کی سیڑھیوں سے آرہی تھیں۔ ان میں اوپر جانے کی ہمت نہ پیدا ہوئی کیونکہ دگدو کو کسی نے اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ دوسرا آدمی کون تھا وہ دونوں پہچان نہ سکے۔ گتھم گتھا دو جسموں اور گالیوں نے فضا کو بجلی کے کوندے کی طرح روشن کر دیا۔ وہ دونوں جب ایک دوسرے پر کوئی ضرب لگاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ بادل گرج رہے ہیں۔

"کیا یہ تمہارے باپ کی جاگیر ہے؟" دگدو سے گتھم گتھا اجنبی کہہ رہا تھا اور وہ دانت بھینچ کر جملے ادا کر رہا تھا۔

"حرامزادے صبح ہو لینے دے ـــ" دگدو کہہ رہا تھا: "پھر تجھے بتاؤں گا ـــ"

کشیدگی کے لمحے میں یک بیک جیسے گرجتے اور تاریک بادلوں سے پانی ٹپکتا ہے دونوں کے بدن نچلی سیڑھی پر آگرے۔ کرشن اور گوپال الگ ہٹ گئے ـــ دونوں بدن زمین پر لڑھکنے لگے اجنبی دگدو کے اوپر تھا۔

گوپال دفعتاً چلّایا ـــ "پولیس ـــ پولیس ـــ"

"یہ تو طلی ہے ـــ جارج ریستوران کا باورچی ـــ!" کرشن نے اجنبی کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"دیکھ وہ تو اوپر ہے ــــ" اور پھر ایک خون آشام تماشائی کی طرح کرشن گوپال کی طرف سے نظریں ہٹا کر علی کی حوصلہ افزائی کرنے لگا ــــ" مار ــــ مار ــــ سالے دگدو کی چمڑی ادھیڑ دے ــــ لگا سالے کے ــــ بڑا کنگ کانگ بنا پھرتا ہے۔"

گوپال ہاتھا پائی کی شدت دیکھ کر کانپ رہا تھا اور کچھ خوفزدہ بھی تھا۔ دگدو علی کے بدن کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اس کی کراہیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ علی نے اپنی گرفت کو ابھی تک ڈھیلا نہیں کیا تھا۔ اگرچہ وہ کرشن کے حوصلہ افزا الفاظ سن رہا تھا۔

شاید کرشن کے ان حوصلہ افزا جملوں نے علی کو گھبرا دیا تھا کیونکہ چشم زدن میں دگدو نیچے سے نکل آیا۔ اس نے کروٹ لی اور علی نیچے گر پڑا۔ یا درحقیقت علی نے نیچے سے لات ماری لیکن دگدو نے اپنا چاقو نکال لیا تھا اور علی کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔

"نہیں نہیں یہ مت کرو!" گوپال چلایا۔

"نہیں اسے چاقو چلانے تو دو ــــ" علی نے للکارا۔ اس نے دگدو کا وہ ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس میں چاقو تھا اور اپنے شانے سے اس ہاتھ کو دور رکھے ہوئے تھا اور نیچے سے دگدو کے جاذ بیــبا لاتیں مار رہا تھا۔

دگدو تکلیف کی وجہ سے شاید بلبلا اٹھا اور اس نے چاقو گھونپ دیا۔ علی کے شانوں سے گردن تک ایک خراش پیدا ہوئی۔ آخرکار نیچے پڑے ہوئے علی کے جسم سے گھاؤ کی وجہ سے گرم گرم لہو بہنے لگا۔

علی زور سے چیخا ــــ" یا اللہ!"

اب بہت سے لوگ وہاں بھاگتے ہوئے پہنچ گئے۔ ان میں پولیس کا ایک سپاہی بھی تھا۔ اور تاریکی میں سایوں کی طرح منڈلانے لگے۔ وہ سب گھبرائے ہوئے تھے اور چلا رہے تھے۔ قانون کے ہاتھ نے دگدو کا ہاتھ تھام لیا جس میں چاقو تھا اور اُسے علی کے جسم کے اوپر سے کھینچ لیا۔

"اس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے۔" گوپال چلایا۔

کرشن نے بازو اٹھا کر اُسے ایسا کرنے سے روکا اور پہلی سیڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں دگدو سویا پڑا تھا اس سے سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"جا اور وہ جگہ جا کر گھیرے اس سے پہلے کہ کوئی اور آدھمکے۔"

"تھانے چلو ــــ تم دونوں!" پولیس کے سپاہی نے علی اور دگدو سے کہا۔

"ارے سرکار اس آدمی کو تو نہ لے جاؤ جس کی گردن سے خون بہہ رہا ہے۔" بھیڑ میں سے کسی نے کہا ــ" قاتل کو لے جاؤ۔"

دگدو نے ایک لمحے کے لئے گردن اچک کر اس آدمی کی طرف دیکھا جس نے اُسے قاتل کہا تھا تاکہ وہ اسے پہچان لے اور بعد میں اس سے نمٹ سکے۔

"چلو ــ چلو ــ اب یہاں ہجوم کر کے کھڑے رہو۔" پولیس کے سپاہی نے حکم دیا۔

"کیا میں اپنے بستر کے نیچے سے اپنا بٹوہ اُٹھا لوں؟" دگدو نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ــــ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں ــ" پولیس کے سپاہی نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا کیونکہ اگر ملزم کے پاس بٹوہ تھا تو قانون کی مٹھی گرم کرنے کے لئے کچھ دستیاب ہو سکتا تھا۔

دگدو نے جب تکیے کے نیچے سے بٹوہ اٹھایا تو اس نے گوپال کو اپنے بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموشی سے گوپال کی طرف دیکھتا رہا اور کرشن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ کوئی جھگڑا نہ ہو جائے گوپال کے ساتھ بیٹھ گیا تاکہ اگر دگدو ہاتھ چھوڑ بیٹھے تو وہ گوپال کی حفاظت کر سکے۔ لیکن چوکیدار انھیں گھورتا رہا۔ پہلے سختی سے اور پھر نرمی سے۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "آخر تم یہاں پہنچ ہی گئے ــــ کوئی نہ کوئی وسیلہ بن ہی جاتا ہے۔"

خواجہ احمد عباس

"بوائے"

"بوائے!"
"یس سر"
"ڈنر فور ٹو!"
"یس سر!"
"بوائے!"
"یس سر!"
"وان بڑا پیگ وہسکی اینڈ سوڈا!"
"یس سر!"
"بوائے!"
"یس سر!"
"چکن الاکیف!"
"یس سر!"
"تندوری مرغ!"
"یس سر!"
"ٹوماٹو جوس، کولڈ میٹ، رشن سلیڈ، آئس کریم۔ کافی!"
"یس سر!"
"بوائے!"
"یس سر!"
"بوائے! بوائے! بوائے!"
"یس سر، یس سر، یس سر!"

اشوک کو خواب میں بھی "بوائے" کی آواز بازگشت ہی سنائی دیتی تھی، اور اس کے باقی ساتھیوں کا بیان تھا کہ وہ سوتے سوتے بھی اکثر "یس سر" بڑبڑایا کرتا ہے۔

وہ نئی دلّی کے "پیکنگ پیرس" میں دو برس سے ویٹر کا کام کرتا تھا، تنخواہ صرف بیس روپے مگر "ٹپ" ملا کر پچاس کی اوسط پڑ جاتی تھی۔ پھر کھانا مفت۔ اس بیکاری اور مہنگائی کے زمانہ میں بی۔ اے پاس لڑکوں کو بھی اتنا کہاں ملتا ہے۔ اور پھر اشوک تو صرف میٹرک ہی

پاس تھا، یہ اور بات ہے کہ کبھی وہ سوچا کرتا تھا کہ کالج میں پڑھے گا۔ بڑا سرکاری افسر بنے گا۔ کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کرے گا۔ بنگلے میں رہے گا.......... مگر زندگی کے سب خواب کب پورے ہوتے ہیں......... اور پھر آج کل بی۔ اے کرنے سے بھی کیا ہوتا ہے اس کا ایک دوست نرمل جس نے بی۔ اے کیا تھا، ایک دفتر میں چپراسی ہی تو تھا۔۔۔۔ تنخواہ پچاس روپے مہینہ خشک جس میں سے پانچ روپے کرایہ کے دیتا تھا۔ کھانے کا خرچ اپنی جیب سے ۔۔۔ اس کے مقابلے میں اشوک کافی خوش قسمت تھا، کہ کھانا مفت ۔۔۔ رات کو ہوٹل بند ہونے پر وہ کسی میز کے نیچے کوئی میلا میلا ترپال اوڑھ کر سوجاتا تھا اور مہینے کی پہلی کو بیس پچیس روپے اپنے گھر منی آرڈر کر دیتا تھا۔

"کیفے پیرس" کے کام میں اور بھی کئی فائدے تھے۔ پہننے کو یونی فارم مفت ملتی تھی۔ دھوبی کا دھلا سفید کوٹ۔ سفید پتلون۔ سفید جوتے۔ کیفے کے مالک کو اس بات پر بڑا ناز تھا، کہ اس کے ویٹر ہمیشہ اجلے کپڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے۔ مگر اشوک کو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ سفید کپڑے اس کی انفرادیت اور خودداری کا کفن ہیں۔ ان کو پہنتے ہی اس کی اپنی ہستی مرجاتی ہے۔ اب وہ میٹرک تک پڑھا ہوا بائیس برس کا جوان ایک سرمایہ دار کا ہم نام اشوک نہیں ہے بلکہ "کیفے پیرس" کا ایک گمنام بلکہ بے نام ویٹر ہے۔ جس کو صرف "بوائے" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

"بوائے!"

"بوائے!"

"بوائے!" دن بھر اس کی خودی پر اس نام کے طمانچے پڑتے تھے۔

باریک زنانہ نخریلی آواز میں "بوائے!"

موٹی مردانہ رعب دار آواز میں "بوائے!"

حلق میں سے نکلی ہوئی کھنکارتی ہوئی بلغمی آواز میں "بوائے!"

گاتی ہوئی آواز میں "بوائے!"

ناچتی ہوئی آواز میں "بوائے!" بوائے!" بوائے!" بوائے!" بوائے!!!"

غراتی ہوئی غصیلی آواز میں "بوائے!"

شرمیلی لجاتی ہوئی آواز میں "بوائے!"

اور اس کے پاس ان سب پکاروں کے لئے صرف ایک جواب "یس سر"

"یس سر"

"یس سر"

"یس سر"

دن بھر میں اشوک بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتا تھا۔ اس عرصے میں کچن سے ڈائننگ روم تک کم سے کم دو سو پھیرے کرنے پڑتے تھے۔ اشوک نے ایک بار حساب لگایا تھا، کہ وہ دن بھر میں کم سے کم دس میل چلتا ہے۔ وہ بھی ہر بار ایک بھاری ٹرے کو ہاتھ میں اٹھائے۔ بھیڑ کے سمندر میں سے میزوں کے جزیروں کے گرد گھومتا ہوا۔ اور ذرا بھی رفتار دھیمی ہوئی۔ ذرا بھی آرڈر کے لانے میں دیر ہوئی کہ "بوائے!" کا طمانچہ پڑا۔

"بوائے!"

"بوائے!"

"بوائے!"

"بوائے! کتنی دیر لگاتے ہو تم؟"
"بوائے! آر یو سلیپنگ؟"
"بوائے! پانی لاؤ جلدی جلدی۔"
"بوائے! چکن روسٹ اور پیشاوری نان مگر ایک دم جلدی۔"
"بوائے! لاگر بیر۔ اینڈ میک اٹ کوئک۔"
"بوائے! چکن سنڈ گوناٹ اور سینٹ پوٹاٹوز۔ بٹ آئی ایم ان اے ہری۔"
"یس سر۔"
"یس سر۔"
"یس سر۔"
چکن الاکیف۔
مٹن کٹلس۔
تندوری مرغا۔
رشین سیلڈ
ٹماٹو جوس۔
وہسکی۔ بیئر۔ شامپین۔
نرگسی کوفتے۔
ستھری اِن ون آئس کریم۔
سٹرا بیری اینڈ کریم۔
چاکلیٹ سنڈے۔
فروٹ سیلڈ۔

اشوک۔ تقریباً دو سو مختلف قسم کے کھانوں کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شکل صورت رنگ اور بو سے واقف تھا۔ مگر اس کو دو وقت دال روٹی اور بے مزہ گوبھی کی ترکاری ہی ملتی تھی عجب وہ ٹرے میں کوئی مہکتی ہوئی خوشبودار "ڈش" رکھ کر لے جاتا تو اس کا کتنا جی چاہتا کہ ایک بار...... صرف ایک بار........ اس نعمت کو خود بھی چکھ لے........ بھنے ہوئے مرغ کی ایک ٹانگ یا آئس کریم کا ایک چمچہ یا کیک کا ایک ٹکڑا........ مگر اسے معلوم تھا کہ بھولے سے بھی ایسی کوئی حرکت کی تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مگر جب بچا ہوا کھانا واپس جاتا تو ویٹر اکثر مالک اور منیجر کی نظر بچا کر اس میں سے دو چار لقمے چکھ لیتے تھے........ ایک بار اشوک بھی ایک فروٹ سیلڈ کی آدھی بچی ہوئی پلیٹ دیکھ کر للچا گیا۔ اور جلدی جلدی اس میں سے تین چار خوبانیاں اور سیب کے ٹکڑے اڑا گیا۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی جب وہ ایک گاہک کی میز پر سے جھوٹے برتن اٹھانے گیا تو دیکھا کہ وہ فروٹ سیلڈ کھاتا جا رہا ہے اور خوبانیوں کی گٹھلیاں اور سیب کے بیج واپس اسی پلیٹ میں تھوکتا جا رہا ہے۔ اور یہ دیکھ کر اشوک کا جی متلا اٹھا تھا اور اُسے غسل خانے میں قے کرنی پڑی تھی۔ اس کے بعد اس کا کبھی جھوٹا کھانا کھانے کو جی نہ چاہتا........ اور سو کھانوں کی نفیس خوشبوئیں اس کے نتھنوں کو گدگداتی رہتیں۔ کھانوں کی رنگین سجاوٹ اس کی آنکھوں کو للچاتی رہتی۔ اور اس کے پیٹ کی آنتیں سکڑ کر اس بھوک کی یاد دلاتی رہتیں۔ جو بے مزہ گوبھی کی ترکاری سے کبھی نہیں بھرتی........ مگر اشوک اپنا کام کئے جاتا، ایک مشین کی طرح جو پہیوں پر چلتی ہو۔ جس کے

شاہراہ

میکانکی ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے ہو اور جو گراموفون کے ٹوٹے ہوئے رکارڈ کی طرح بار بار ایک ہی جملہ دہراتی ہو..........

"یس سر"

"یس سر"

"یس سر"

ریسٹوراں صبح آٹھ بجے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک بھرا رہتا تھا۔ اس عرصے میں صرف لنچ سے پہلے کوئی ایک گھنٹے کے لئے بھیڑ کم ہوتی تھی۔ اور اس وقت سب ویٹر باری باری تھوڑی دیر کے لئے سستا لیتے تھے۔ ایک بار گرمیوں کے دن تھے۔ ریسٹوراں ایرکنڈیشنڈ تھا۔ مگر کچن کے پاس "پینٹری" میں جہاں ویٹر بیٹھتے تھے بلا کی گرمی تھی۔ اشوک پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے شیشے کے کواڑوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ جن کونے کی میزیں اس کے سپرد تھیں وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ سو اس نے سوچا تھوڑی دیر کے لئے کوٹ اتار کر پسینہ سکھا لوں۔ مگر ابھی اس نے کوٹ اتارا ہی تھا کہ ہال میں سے گونجتی ہوئی شیشے کے کواڑوں میں سے دھیمی ہوتی ہوئی "بوائے" کی آواز آئی۔

"کیا مصیبت ہے!"۔۔۔ اشوک نے سوچا، اور بددلی سے کوٹ پھر پہننا شروع کیا۔ ابھی بٹن لگا رہا تھا کہ دوبارہ اور "بوائے" کی آواز اس کو جھنجھوڑنے کے لئے وہاں تک پہنچی۔

دروازہ کھول وہ ریسٹوراں میں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک دہاڑتی، چنگھاڑتی ہوئی آواز گونجی "بوائے!"

اس نے قدم تیز کئے۔ مگر اسے پورے ہال کو طے کرنا تھا۔ فرش ڈانس کے لئے چکنا کیا گیا تھا۔ اگر وہ دوڑا تو منہ کے بل گر پڑے گا۔

"بوائے! بوائے!! بوائے!!!"

سلک کی بش شرٹ (جس پر شیر اور ہاتھی اور اژدہوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں) پہنے ایک موٹا سا آدمی بے تحاشا چلا رہا تھا جیسے اُسے دورہ پڑ گیا ہو..........

"بوائے! بوائے!! بوائے!!!" اور اشوک کو ایسا لگ رہا تھا، جیسے برابر اس کے منہ پر طمانچے پڑ رہے ہوں۔

"یس سر" اُس نے عاجزی سے ہیتو پیش کرتے ہوئے کہا۔

مگر ایک اور طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔ "تم لوگ سوتے رہتے ہو کیا؟ مجھے تمہاری رپورٹ کرنی پڑے گی......"

اور اس شام کو منیجر نے اشوک کو بتایا تھا کہ اس کو پانچ روپے جرمانہ کر دیا گیا ہے جو اس کی تنخواہ سے کاٹ لیا جائے گا۔

پھر کبھی اس نے کوٹ اتار کر سستانے کی ہمت نہیں کی۔

اس کے ہاتھ، پاؤں، اور زبان پر "کیفے پیرس" کے مالک کا قبضہ تھا، مگر اس کی آنکھیں، اس کے کان، اس کا دماغ......، وہ آزاد تھے۔ اشوک وہ حرکتیں دیکھتا جو ایک ویٹر کو نہیں دیکھنی چاہئیں ۔۔۔ وہ باتیں سنتا جو ایک ویٹر کو نہیں سننا چاہئیں، اور وہ خیالات سوچتا جو ایک ویٹر کو نہیں سوچنے چاہئیں۔

وہ دیکھتا...... کالے بازار والے موٹے سیٹھوں کو سرکاری افسروں کی وسکی اور شامپین کے بل ادا کرتے ہوئے.........

پیشہ ور طوائفوں کو سفید ساڑھیاں یا اور کوئی سادہ لباس پہنے گھریلو پوز میں اپنے "دوستوں" کے ساتھ بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے...... شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو لپ سٹک اور سرخی پوتے۔ چیختے ہوئے رنگوں کی ساڑھیاں یا سلیکس پہنے کالج کے لڑکوں یا فوجی افسروں کے ساتھ شیری پی کر طوائفانہ انداز میں ٹھٹھے مارتے ہوئے....... کھدر پوش "لیڈروں" کو بھوکی نظروں سے اینگلو انڈین ٹائپسٹ لڑکیوں کو گھورتے ہوئے.......... پارلیمنٹ کے ممبروں کو ادھر ادھر دیکھ کر چپکے سے وسکی کا آرڈر دیتے ہوئے...... شارکس سکن سوٹ

پہنے ہوئے ادھیڑ ٹھیکیداروں کو دُبلی، پتلی، سہمی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ ناچتے ہوئے ....

وہ سُنتا .... پرمٹ اور لائسنس کے لئے ممبئی کے بیوپاریوں اور سرکاری افسروں کے درمیان رشوت طے کرنے کی باتیں .... نوجوان طالب علموں اور ان کی گرل فرینڈز کے درمیان بھرے شکوے شکایتیں اور عہد و پیمان .... نئی دلی کی ہائی سوسائٹی کے سارے سکینڈل ...... ادیبوں اور شاعروں کے بحث مباحثے .... اخبار نویسوں اور رپورٹروں کی سیاسی گپ شپ ....

اور وہ سوچتا .... یہ شاندار "کیفے پیرس" اس کی نقلی سنگ مرمر کی دیواریں ...... اس کی دیواروں پر بنی ہوئی ادھ ننگی عورتوں کی تصویریں۔ اس کے نقلی مخمل منڈھے ہوئے صوفے .... اس کا ولائتی ناچ کی دُھنیں بجانے والا بینڈ .... یہ خدر پوش دیسی پینے والے .... یہ بھوکی آنکھوں والے بڑے بیوپاری ... یہ موٹے موٹے ٹھیکیدار .... یہ دُبلے پتلے مدقوق شاعر اور ادیب اور اخبار نویس ..... یہ شاہین کی بوتلیں .... یہ تندوری مرغ .... یہ رشین سلیڈ اور امریکن کاک ٹیل ..... یہ چست بلاؤز پہنے ہوئے عورتیں .... یہ آنکھوں میں دعوت نظارہ لئے ہوئے لڑکیاں .... یہ کھانا، یہ پینا، یہ ہنسی، یہ قہقہے، یہ دولت، یہ حسن، یہ شان و شوکت، یہ عیش و آرام، یہ زندگی اس سے اتنے قریب ہونے پر بھی اس سے کتنی دور ہے .... وہ اس سمندر میں ڈوبا ہوا ہے، مگر پھر بھی پیاسا ہے .... اور کبھی کبھی جب دن بھر چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہو جاتے، اور اس کا سر گھومنے لگتا اور کیفے سگریٹ کے دھوئیں اور وسکی اور بھنے ہوئے مرغ اور سینٹ اور پاؤڈر اور پسینے کی بو سے بھر جاتا اور جاڑے کے موسم میں بھی سینکڑوں مردوں اور عورتوں کے گرم گرم سانسوں سے ایک عجیب گرمی اور گھٹن پیدا ہو جاتی ...... اس وقت اشوک کو ایسا محسوس ہوتا کہ یہ سارا ریسٹوراں ایک تندوری مرغا ہے۔ اور وہ خود اس تندوری مرغے کے پیٹ میں گھسا ہوا ہے مگر بھوکا ہے ..... اور یہ مرغا تندور کی آگ میں بھونا جا رہا ہے اور ساتھ ساتھ وہ خود بھی بھنتا جا رہا ہے .... ایک لمحے کے لئے اس کو یہ ڈر لگتا کہ کوئی لال چقندر امریکن یا موٹا سندھی ٹھیکیدار اس کی ٹانگ پکڑ کر اس کی ہڈیاں چبانا نہ شروع کر دے .... مگر پھر ....

"بوائے !" کوئی گاہک آواز دیتا۔

اشوک اپنے تخیل کے جال سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جاتا۔ مگر اس کے دماغ میں ایک مبہم سا سوالیہ نشان اور اس کے دل میں ایک نامعلوم چبھن رہ جاتی۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہے؟

اور پھر ایک دن اشوک کو "کیفے پیرس" چھوڑنا پڑا۔ کیفے تین مہینے کے لئے بند کیا جا رہا تھا۔ تاکہ اس کو توڑ پھوڑ کر اس کی سجاوٹ نئے ڈھنگ سے کی جائے۔ چار سال پہلے "کیفے پیرس" کو لنڈن کے ایک مشہور ریسٹوراں کی نقل میں سجایا گیا تھا۔ اب کہا جاتا تھا کہ اسے نئے سرے سے امریکن ڈھنگ پر نیویارک کے ایک ہوٹل کی نقل میں سجایا جائے گا ....

بڑے آدمیوں کی یہ سب باتیں اشوک کی سمجھ کے باہر تھیں۔ وہ تو اتنا جانتا تھا کہ تین مہینے تک وہ بے کار ہے۔ اس لئے وہ اپنی ماں سے ملنے گھر جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ اس کی جیب میں دو برس کے بچائے ہوئے ستر روپے ہیں اور وہ سوچ رہا تھا، کہ ٹپ لے بنا اس رقم میں تین مہینے کیسے گزریں گے۔ اور پھر اس کی نظر کناٹ پلیس کے دوسرے مشہور ریسٹوراں "مائی لارڈ" کے سائن بورڈ پر پڑی اور اس نے سوچا کیوں نہ وہاں دریافت کر لیا جائے ممکن ہے کسی ویٹر کی جگہ خالی ہو۔

دروازے پر ہی NO VACANCY کا بورڈ لگا تھا اور باوردی چوکیدار نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ "مائی لارڈ" میں کسی ویٹر کی جگہ خالی نہیں ہے ــــ وقت کاٹنے کے لئے اشوک شیشے کی دیواروں کے پیچھے لگی ہوئی ان کھڑکیوں کو دیکھنے لگا جن میں راہ گیروں کو لبھانے اور للچانے کے لئے ہر طرح کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ بھنے ہوئے مرغ، ساسیج کے ہار، کٹلس کباب۔ وینیلا آئس کریم کا سفید پہاڑ اور اس کی چوٹی پر لال لال چیری لگی ہوئی۔ ہر قسم کے پھل۔ ٹماٹر۔ پہاڑی مرچیں۔ ہر چیز اتنی خوبصورتی سے سجائی ہوئی تھی کہ دیکھنے والے کے منہ میں پانی بھر آئے۔

دفعتاً اشوک کے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔ "اتنے دن میں نے "کیفے پیرس" میں بڑھیا کھانے دوسروں کو کھلائے مگر مجھے خود یہ بھی نہیں معلوم کہ چکن الاکیف اور سٹرابیری اور کریم کا مزہ کیسا ہوتا ہے۔ ایک بار ..... ایک بار .... کیوں نہ میں بھی یہ چیزیں کھا کر

دیکھوں۔ میری جیب میں ستر روپے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ بل دس روپے آئے گا۔ مگر یہ تجربہ زندگی بھر یاد تو رہے گا۔"

اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی خوش آئند کرکراہٹ محسوس کرتے ہوئے وہ "مائی لارڈ" ریستوراں میں داخل ہو گیا۔ ابھی لنچ کی بھیڑ لگی نہیں تھی۔ ہال میں تین چار میزوں پر ہی کچھ لوگ بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ باقی میزیں ابھی تک خالی تھیں۔ اشوک کو اپنے تجربے سے معلوم تھا کہ اس وقت ویٹر عام طور سے باری باری تھوڑی دیر اپنی ٹانگوں کو آرام دینے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں تاکہ لنچ کے ہنگامے کے لئے تازہ دم ہو جائیں۔

وہ کھڑکی کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوچا ویٹر کو بلانے سے پہلے "مینو" پر چھپی ہوئی فہرست دیکھ کر اپنے لنچ کا آرڈر طے کر لینا چاہئیے۔

"پہلے تو میں منگاؤں گا کریم سوپ۔ اس میں سے ہمیشہ بڑی اچھی خوشبو آتی ہے۔ ضرور مزیدار بھی ہوتا ہوگا۔"

"پھر چکن سٹراگوناف، نہیں نہیں چکن الاکیف۔ دیکھوں تو آج اس عجیب نام کا مرغا مزے میں کیسا ہوتا ہے۔ سنا ہے یہ کوئی روسی کھانا ہے۔ تو اس کے ساتھ رشین سیلڈ بھی ہونا چاہئیے۔"

"اور اس کے بعد۔ امریکن فروٹ کاک ٹیل۔ یہ بھی اچھا رہا۔ پہلے روسی پھر امریکن...... اب ویٹر کو بلانا چاہئیے۔"

"بوائے!"

وہ چلّایا۔ اور اس کی آواز میں اُن تمام ہزاروں آوازوں کا نچوڑ تھا جو خود اس کو بلانے کے لئے دی گئی تھیں۔

اور جب کوئی ویٹر اس کے پکارنے پر نہیں آیا تو وہ پھر چلّایا۔

"بوائے!"

رعب دار غصیلی آواز جیسی وہ اکثر سنتا تھا۔ جب کبھی اسے پہلی پکار پر ٹیبل تک پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی۔

"بوائے! بوائے!!" وہ بے تحاشہ چلّایا۔ جیسے اسے دفعتاً غصّے کا دورہ پڑ گیا ہو۔

"بوائے! بوائے!! بوائے!!!" جیسے وہ اس اژدہا چھاپ بش شرٹ والے کی ہتک آمیز چیخوں کا انتقام لے رہا ہو۔

"بوائے!"

سارا ریسٹوراں اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگ ادھر ادھر مڑ کر دیکھنے لگے۔

"بوائے!"

ایک بوڑھا سفید داڑھی والا بیرا اپنی کمر کے پٹکے کو درست کرتا اس کی طرف لپکا ہوا آ رہا تھا۔ اشوک کی "بوائے" کی پکار کا طمانچہ ایک جھرّیاں پڑے ہوئے گال پر پڑا تھا۔

"یس سر!" قریب آ کر ہانپتے ہوئے وہ بولا "یس سر"

اور اس کی بجھی ہوئی، مرجھائی ہوئی، گڑگڑاتی آواز میں ان ہزاروں "یس سر، یس سر، یس سر" کا نچوڑ تھا جو اشوک نے اپنے کیفے کے گاہکوں سے سر جھکا کر کہے تھے۔

ایک لمحے کے لئے اس نے بوڑھے ویٹر کی عاجزی بھری آنکھوں میں دیکھا۔ اور نہ جانے کیوں اُسے ان آنکھوں میں اپنا ہی چہرہ نظر آیا۔

"یس سر؟" بوڑھے نے پھر عاجزی سے دہرایا۔ اور اس "یس سر" میں اشوک کو اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دی۔

"کیا حکم ہے، صاحب؟" ویٹر پوچھ رہا تھا۔

اور اشوک کے دماغ میں اس کی اپنی زندگی کے دو سال گھوم رہے تھے۔ سنی ہوئی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"بوائے!"

"یس سر"

"ڈنر فور ٹو"

بقیہ صفحہ ۲۲۷ پر دیکھئے

ریاض برنی

اپنا گھر

سفرِ حیات کی طویل تاریخ میں پانچ سال کی حقیقت ہی کیا ہے۔ لیکن ایک فرد کی زندگی میں پانچ سال بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہم امیدوں کے سہارے جیتے ہیں، مستقبل سے بہت کم مایوس ہوتے ہیں۔ جب ایک سپنا ٹوٹ جاتا ہے تو اسی کے تانے بانے نئے سپنے تعمیر کر لیتے ہیں۔ جب ٹھوکر لگتی ہے، ذہن کو دھچکا محسوس ہوتا ہے، تو ماضی کے آئینے کو احتیاط سے نکالتے ہیں۔ اس کے گرد و غبار کو دور کرتے ہیں اور مستقبل کی جھلکیاں اس میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ــــــ زندگی اسی طرح امیدوں اور آرزوؤں کے سہارے گزر جاتی ہے۔

پانچ سال ــــــ کوئی بڑی مدت نہیں۔ مگر اس ہر لحظہ تغیر پذیر دنیا میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ــــــ اور اب بھی کبھی کبھی وہ دن یاد آ جاتے ہیں جب آج سے پانچ سال پہلے ہم دونوں ایک چھوٹے سے ہائی اسکول میں مدرس تھے۔ عثمان ہیڈ ماسٹر تھا اور میں اسسٹنٹ ٹیچر۔

عثمان مجھ سے کوئی دس برس بڑا ہوگا۔ مگر عام طور پر اس کے تعلقات اپنے ماتحتین سے مشفقانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھے۔ اسکول کی فضا بڑی خوشگوار تھی، اور اس کو بنانے میں عثمان کی شخصیت کا بڑا دخل تھا۔ تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ باہمی صلاح و مشورہ سے طے ہو جاتے تھے۔ زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا ــــــ اچانک ــــــ غیر متوقع طور پر ــــــ ملک تقسیم ہو گیا۔

تقسیم کے سمجھوتے سے لے کر آج تک ــــــ جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پر کیا گزری ــــــ ایک طویل داستان ہے۔ بہت کچھ بیت گئی اور بہت کچھ بیت رہی ہے ــــــ اس المیہ کا میری کہانی سے صرف اتنا تعلق ہے کہ عثمان آج کراچی میں ایک صابن فروخت کرنے والی انگریزی فرم میں کلرک ہے اور میں ایک امریکی فرم میں صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام کے چار بجے تک، گنتی اور پہاڑے رٹا کرتا ہوں۔

انسان فطرتاً ماضی پرست ہوتا ہے۔ ہم ماضی سے کتنا ہی اپنا دامن بچائیں، اس کی طرف سے منہ موڑ لیں، مگر وہ پھر بھی کبھی کبھی، تمام خوشگوار و ناخوشگوار واقعات کا بھیس بدل کر، ذہن کے کسی چور دروازے سے داخل ہو کر، ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ــــــ "کہیے مزاج تو اچھے ہیں" ــــــ اور آپ یقین کریں کہ پھر تمام تلخ یادیں بھی خوشگوار معلوم ہونے لگتی ہیں۔

پانچ سال قبل کیسی گزرتی تھی ــــــ یہ خوشگوار یادیں اب بھی کبھی کبھی ستاتی ہیں ــــــ یہ پانچ سال کیسے گزرے یہ نہ پوچھیے ــــــ ایک دن کراچی کی گلی کوچوں کا چکر لگا لیجیے ــــــ پھر یہ سوال آپ کے ذہن میں کبھی نہ ابھرے گا۔

یہاں آنے پر روزی حاصل کرنے میں ہمیں زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں ملازمتوں کا اتنا قحط نہیں تھا جتنا آج کل ــــــ! مگر مکان کے ملنے نے بہت دنوں تک گلی کوچوں کی خاک چھنوائی۔ آخر ڈیڑھ سال بعد میرے بھائی نے پگڑی دے کر ایک چھوٹا سا فلیٹ حاصل کر لیا۔ اور میں آج بھی اس کے ساتھ رہتا ہوں۔

عثمان ایک مدت تک کئی کیمپوں میں فٹ بال کی طرح لڑھکتا رہا ہے۔ جھونپڑیوں میں بڑی کس مپرسی کی زندگی گزاری۔ جگہ جگہ مارے مارے پھرا اور بڑی تگ و دو کے بعد ایک دوست کی سفارش سے بہار کالونی میں ایک نیم تعمیر شدہ مکان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں صرف ایک کمرہ اور ایک صحن ہے۔ پانی اور روشنی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ــــــ اور کرایہ ــــــ ماہوار پچیس روپیہ۔

ابتدا میں ہماری ملاقات ہر دوسرے تیسرے دن ہو جاتی تھی۔ مگر بعد میں، ہم اپنی ذاتی الجھنوں میں کچھ اس قدر پھنستے چلے گئے کہ اب تو کئی کئی ماہ گزر جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی خیریت معلوم نہیں ہوتی۔

مشاہدہ ۱۲

کل ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

کوئی ساڑھے تین بجے کا عمل ہوگا۔ مہینے کے آخری دنوں میں یوں بھی کام کی زیادتی ہوتی ہے۔ میں چار بجے سے پہلے ہی فارغ ہو جانا چاہتا تھا کہ اطلاع ملی کوئی صاحب باہر میرے منتظر ہیں۔ ایسے تنگ وقت میں جب کہ آفس بند ہونے میں صرف تیس منٹ باقی ہوں، کسی ملاقاتی کا آنا بہت کھلتا ہے۔ بڑی کوفت ہوئی اور میں یہ سوچتا ہوا اٹھا کہ اللہ کے بندے کو آنا ہی تھا تو آدھ گھنٹے بعد آتا۔ جب تک میں بھی کام سے فارغ ہو جاتا۔ باہر آکر دیکھا تو ـــــ "ارے عثمان!"

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ آپ یقین کریں کہ میں نے عثمان کو کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ میں تو اسے دیکھ کر رشک کیا کرتا تھا کہ ایک یہ بھی گوشت و پوست کا بنا ہوا انسان ہے۔ گلی گلی کی خاک چھانی ـــــ جھونپڑی جھونپڑی مارا مارا پھرا۔ بیوی بچوں کی بیماری میں بے حد مقروض ہوگیا۔ مگر کبھی پیشانی پر بل نہ آیا۔ اور آج ـــ بال پریشان تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے نیند کی پیاس جھلکتی تھی۔ اچکن کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ انتہائی پریشان اور حواس باختہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے رازدارانہ انداز میں پوچھا ـــــ "تمہارا آفس کب بند ہوتا ہے؟"

"کیوں ـ! ـــ خیریت تو ہے ـــ چار بجے ـــ آخر بات کیا ہے؟" میں نے گھبراتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں وکٹوریہ ہوٹل میں تمہارا انتظار کرتا ہوں ـــ آفس ختم ہوتے ہی تم میرے پاس آؤ ـــــ" پھر اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آئی ـــــ "ہاں! ـــ سب خیریت ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

اب مجھ سے کیا خاک کام ہو سکتا تھا۔ دماغ پر ایک بوجھ رکھا ہوا تھا ـــــ نہ جانے اس اللہ کے بندے نے کیا کر ڈالا ہے۔ ویسے عثمان سے کسی ناشائستہ حرکت کی توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جو شخص چھوٹی سی رقم دے کر مکان حاصل کرنے کو بھی غیر قانونی حرکت سمجھتا ہو۔ وہ کب قانون شکنی کی جرأت کر سکتا ہے۔ مگر اس کی موجودہ ہیئت کذائی میرے لئے پریشان کن تھی ـــــ اور پھر یہ کراچی ہے۔ یہاں کوئی بھی کسی کا پرسان حال نہیں۔ نہ معلوم کب کون سی مصیبت نازل ہو جائے۔

چار بجتے ہی میں نے وکٹوریہ ہوٹل کا رخ کیا۔ وہاں دوسرا ہی منظر نظر آیا۔ اور کافی حیران کن ـــــ عثمان صاحب ایک کرسی پر نہایت اطمینان سے سر پھیلائے، بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ جناب ایک پیالی چائے چڑھا چکے تھے۔ اب دوسری بنائی جا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چائے لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

"عجیب بہروپیا ہو یار تم؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ـــــ "خواہ مخواہ ڈرا دیا ـــــ یہ کیا صورت بنائی ہے ـــــ میں سمجھا کہ نہ معلوم تم پر کون سی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے ـــــ اور جناب! ـــ نہایت فرصت سے بیٹھے چائے اڑا رہے ہیں......"

"بھئی بات یہ ہے ـــــ" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا ـــــ "مصیبت تو ہے ـــــ اور سخت مصیبت ہے۔ مگر پھر کیا کریں ـــ کیا ہنسیں بھی نہیں ـــــ ارے میاں! ـــ یہ ہمارا ہی دل گردہ ہے کہ پانچ برس کراچی میں کاٹ کر بھی مسکراتے ہیں ـــــ" وہ ہنسنے لگا۔

"آخر قصہ کیا ہے؟ ـــ تمہیں میں نے ایسا پریشان کبھی نہیں دیکھا۔"

"قصہ وصہ کیا ہوتا ـــــ کچھ بھی نہیں ـــــ اچھا تم چائے پیئو۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔"

"دیکھو عثمان!" میں نے سنجیدگی سے کہا ـــــ "تمہیں مجھ سے تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک دوسرے کی حالت سے خوب واقف ہیں۔ آخر معلوم تو ہو کہ بات کیا ہے؟"

"معلوم نہیں تم کیا سمجھ رہے ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کوئی خاص بات نہیں ـــــ میں تو تم سے صرف مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟"

"کل ایک صاحب سے میری لڑائی ہوگئی ہے!" وہ مسکرانے لگا۔

"واقعی ـــــ یا مذاق کر رہے ہو ـــــ" میں بھی ہنسنے لگا۔

"بھئی دیکھو! ـــــ اب میری عمر چالیس کے لگ بھگ ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا ـــــ "اور لوگ اب بھی چیلنج دیتے ہیں ـــــ یہ عمر بھی کوئی لڑنے بھڑنے کی ہے؟ ـــ ایک زمانہ ہوا ـــ اور تم تو واقف ہو کہ بچپن میں مجھے کشتی کا بے حد شوق تھا۔ ایک مدت گذر گئی۔ اب تو میں لڑائی جھگڑے

سے کوسوں دور بھاگتا ہوں ـــــ اور جب پختہ عمر کے لوگوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھتا ہوں، تو حیرت بھی ہوتی ہے اور ایک طرح کی شرم بھی محسوس ہوتی ہے کہ یہ لوگ کیسے لڑ لیتے ہیں ـــــ" وہ چائے پینے لگا۔

"خیر یہ سب تو ہوا ـــــ" میں نے پوچھا ـــــ "مگر یہ قصہ کیا ہے؟"

"تم حمید کو جانتے ہو؟" اس نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"کون ـــــ حمید؟"

"وہی ـــــ جو کسی زمانے میں، اپنے ہاں انسپکٹر تھا۔ اب سنا ہے کہ یہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"ہاں! جانتا ہوں۔ اور شاید وہ بھی پہچان لے۔ عرصہ ہو گیا ـــــ اور یہاں تو کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا "میں بھی پولیس والوں کی دوستی کا قائل نہیں ہوں۔ مگر کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔"

"آخر بات کیا ہے؟"

وہ مزے لے لے کر چائے پی رہا تھا۔ اب نہ وہ پریشانی تھی، نہ سراسیمگی ـــــ اطمینان سے بیٹھا باتیں بنا رہا تھا۔

"بات یہ ہے ـــــ تم نے میرا مکان تو دیکھا ہی ہے۔ ہمارے پڑوس میں ایک پنجابی صاحب رہتے تھے۔ نہایت شریف اور نیک آدمی تھے۔ تم تو ان سے مل چکے ہو۔ ہمارا ان کا بڑا بھائی چارہ تھا۔ بڑی اچھی زندگی گذر رہی تھی۔ اچھے پڑوس سے تو انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے ناظم آباد میں مکان بنوا لیا ہے۔ اب وہ وہاں اٹھ گئے ہیں۔ ان کے مکان میں ایک نئے صاحب تشریف لائے ہیں ـــــ خدا ان سے سمجھے۔ سارے ہمسایوں کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے دن تو سب سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ مگر چند ہی دنوں بعد رنگ ڈھنگ ظاہر ہونے لگے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے۔ قمرالدین نام بتاتا ہے۔ دلی کے اطراف کا رہنے والا ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا بورڈ بھی مکان میں لگا رکھا ہے۔ گھر میں بیوی اور دو جوان لڑکیاں ہیں ـــــ مگر مجھے تو سب فراڈ نظر آتا ہے ـــــ تم ہی سوچو۔ کیا کوئی ماں اپنی لڑکیوں کو یوں خطاب کر سکتی ہے ـــــ" ارے تم دونوں ـــــ وہ آ گئے کب سے بیٹھے ہیں نا ـــــ اور ابھی تیرا سنگار بھی نہیں ہوا ـــــ۔ ارے گلشن! ـــــ ذری گلوری تو لگا لانا ـــــ" رات بھر طبلہ ٹھنکتا ہے ہارمونیم بجتا ہے ـــــ گانا ہوتا ہے ـــــ ہنسی ـــــ ٹھٹھول ـــــ قہقہے ـــــ بس ایک قیامت ہے ـــــ تو بھیا! یہ ہوتا ہے آج کل ہمارے پڑوس میں ـــــ راتوں کی نیند حرام کر دی ہے ان حرام زادوں نے ـــــ اور بھی لوگ ہیں۔ دو دو تین تین سال سے رہتے ہیں۔ یہ تماشہ کبھی نہیں دیکھا۔ ہر گھر میں بہو بیٹیاں ہیں۔ آخر یہ سب کیسے برداشت کیا جائے ـــــ دوسرے تیسرے دن کوئی صاحب ٹیکسی لے کر آ جاتے ہیں، اور صاحبزادیاں بن سنور کر، بھڑکیلے لباس میں، رنگ و روغن لگائے ہوئے سیر کرنے جاتی ہیں۔ کبھی چند نیوی کے نوجوان آ جاتے ہیں ـــــ کبھی ہمارے ہی محلے کے کچھ شہدے اور بدمعاش جمع ہو جاتے ہیں اور گانا بجانا شروع ہو جاتا ہے۔

آخر تنگ آ کر ایک مرتبہ میں نے، ہمت کر کے اس سے گفتگو کی ـــــ تو وہ ایکدم بپھر گیا ـــــ" صاحب! ـــــ یہ میرا مکان ہے ـــــ میں اس کا کرایہ دیتا ہوں ـــــ میری لڑکیاں گانا سیکھتی ہیں ـــــ بے پردہ رہتی ہیں ـــــ گھومنے جاتی ہیں ـــــ میرے ہاں میرے دوست واحباب آ کر بیٹھتے ہیں ـــــ تو آپ کیوں جلتے ہیں ـــــ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ـــــ آپ دخل دینے والے کون ہوتے ہیں۔ آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ میرے خانگی معاملات میں دخل اندازی کریں ـــــ اگر آپ کو ناگوار ہوتا ہے، تو آپ یہاں سے ہٹ جائیے ـــــ"

اب تم ہی بتاؤ نیازی! ـــــ میں اس کا کیا جواب دیتا ـــــ میں نے دوسرے پڑوسیوں سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے سے ایک رپورٹ پولیس کو دی گئی۔ مگر اس نے حلقے کے انسپکٹر اور سپاہیوں کو ملا رکھا ہے ـــــ وہ خود بھی کبھی کبھی شریک بزم ہوتے ہیں۔ نتیجہ کچھ نہ نکلا ـــــ آخر کار ہم لوگوں نے مالک مکان سے شکایت کی۔ مگر اس نے بھی معذوری ظاہر کر دی ـــــ آج کل حکومت کے قوانین ایسے ہیں کہ کسی کو بھی اس کے مکان سے نہیں نکالا جا سکتا ہے"

اس نے محلے کے چند لوگوں کو بھی ملا رکھا ہے۔ مسجد فنڈ میں اس نے سب سے زیادہ چندہ دیا ہے۔ پیش امام صاحب کو، اس کے گھر سے دونوں وقت کھانا جاتا ہے۔

آج کل تو وہ اور خود سر ہو گیا ہے۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔ اس کی لڑکیاں تو راہ گیروں پر فقرے چست کرتی ہیں ـــــ دو ماہ سے جان عذاب میں کر رکھی ہے ان لوگوں نے ـــ آخر تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا؟"

اس نے اور چائے لانے کا آرڈر دیا۔ سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ کل شام، مغرب سے پہلے ہی گانا شروع ہو گیا۔ وہ دونوں نیوی والے آئے ہوئے تھے ـــ والدہ کی نماز نہ ہو سکی۔ آخر نہتے ہی آکر انھوں نے دروازے پر سے چند سخت باتیں کہہ ڈالیں۔ بس، پھر غضب ہو گیا ـــــ وہ واویلا، جیسے قمرالدین اپنی بیوی پیٹتا ہے، گالیاں دیتی ہوئی، والدہ سے لڑتے ہمارے دروازے پر آدھمکی ـــــ لڑکیاں بھی آستینیں چڑھا چڑھا کر نکل آئیں ـــ ہم خون پی جائیں گے ـــ کیا سمجھا ہے تم نے ہمیں ـــ کوئی ایسے ویسے ہیں ـــ فلاں فلاں افسر ہمارے عزیز ہیں ـــ وہ گالیاں دے رہی تھیں ـــ خرافات بک رہی تھیں ـــ ہمارے گھر کی عورتوں نے ایسے ہنگامے کب دیکھے تھے، وہ دروازہ بند کر کے بیٹھ رہیں ـــ جب، آٹھ بجے میں واپس آیا، تو والدہ نے سارا قصہ سنایا۔ کہنے لگیں "عثمان! اب تم کوئی دوسرا مکان تلاش کرو ـــ اب یہاں شریفوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔" اتنے میں باہر سے قمرالدین نے مجھے پکارا ـــ ـ والدہ روکتی رہیں، مگر میں باہر نکل آیا ـــ یقین کرو نیاز! ـــ ـ ہی قطعی لڑنے جھگڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ نہ اتنی جلدی مجھے غصہ آتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر دیا جائے۔ میں باہر نکلا ـــ قمرالدین نے چھوٹتے ہی کہا ـــ "ابے وہاں کیا زنخے جیسا پردے سے لگا کھڑا ہے ـــــ ذرا نیچے اتر!"

بس ایک آگ ہی تو لگ گئی۔ پھر کیا ہوا کچھ نہ پوچھو۔ تم نے قمرالدین کو نہیں دیکھا ـــ کافی لحیم شحیم آدمی ہے ـــ میں نے سیڑھیوں سے اترتے ہی ایک زوردار چانٹا رسید کیا۔ ایک لمحے کے لئے حضرت کو تارے دکھائی دے گئے۔ لیکن وہ فوراً مجھ سے لپٹ پڑا۔ میں نے جو زور سے دھکا دیا۔ تو حضرت اپنے گھر کی سیڑھیوں پر جا کر گرے۔ ـ وہ دیکھنے بھر کا ہٹا کٹا ہے ـــــ اور بھئی! میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ لڑنے جھگڑنے کے لئے بھی کسی اخلاقی جواز کی ضرورت ہے۔ اگر تم حق پر ہو تو یہی چیز تم میں جرأت اور طاقت پیدا کر دیتی ہے۔ وہ سیڑھیوں سے اٹھ کر پھر میری طرف جھپٹا ـــ ایک شور مچ گیا۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ وہ دونوں نیوی والے بھی باہر نکلے۔ عورتیں چیخ و پکار کرنے لگیں۔ میں نہیں جانتا کہ پھر کیا کیا ہوا ـــ لیکن یہ آوازیں میں نے ضرور سنیں ـــ کوئی چلا رہا تھا ـــ پستول کہاں ہے؟ پستول کہاں ہے؟ ـــــ ذرا سی زور آزمائی کے بعد میں نے قمرالدین کو کنارے کی موری میں دے مارا ـــــ ایک نیوی والا پستول لئے ہوئے آگے بڑھا ـــ "شوٹ کر دوں گا ـــ" مگر مجھ پر تو اس وقت جنون سوار تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھوں سے پستول چھین کر دور پھینک دیا، اور دو گھونسے رسید کئے ـــــ ایک بھیڑ لگ گئی۔ بلکہ سارا محلہ اُمڈ آیا۔ عورتیں الگ چیخ و پکار کر رہی تھیں۔ اس کے دونوں بھی، دو سپاہی بھی آ گئے تھے۔ اور قانون بگھار رہے تھے ـــــ مگر وہاں تو ایک ہنگامہ برپا تھا۔ طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں ـــــ

"یہ رنڈیاں ہیں ـــــ رنڈیاں ـــ"

"یہ لڑکیاں راہ چلنے والوں کو چھیڑتی ہیں۔ نظر بازی کرتی ہیں۔"

"یہاں محلے بھر کے غنڈے جمع ہوتے ہیں۔"

"کل میں یہاں سے گذر رہا تھا تو اس کی ایک لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی ـــ انگڑائی لی ـــ اور گانے لگی ـــ انکھیاں ملا کے چلے نہیں جانا۔"

"یہ حرامی دلال ہے۔ ان لڑکیوں کی کمائی کھاتا ہے۔"

"ان بدمعاشوں نے سارا محلہ گندا کر دیا ہے۔ شریفوں کا چلنا پھرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"نکالو ان کمینوں کو یہاں سے۔"

"یہ چکلہ ہمارے محلے میں نہیں رہ سکتا۔"

فیصلہ تو کل ہی ہو جاتا۔ مگر ان کے پرستار اور چاہنے والے بھی تو ہیں ـــــ لوگوں نے سارا معاملہ محلے کے بڑے بوڑھوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ آج شام، فیصلہ ہو جائے گا۔

عثمان چائے کا گھونٹ لے کر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہنے لگا ——" وہ بدمعاش تو ادھر ہی آئے تھے کیونکہ ان کے ہمدرد سپاہی، اور محلے کے غنڈے بھی جمع ہو گئے تھے۔ مگر پستول کا معاملہ ایسا درمیان میں آ پھنسا تھا کہ اب ان کی زبان بھی نہ کھلتی تھی۔ جانے وہ پستول چوری کا ہے۔ یا کیا قصہ ہے۔ نیوی والے نے میرے پیر پکڑ لئے کہ میں وہ پستول واپس دلا دوں۔

اس نے ایک پیالی چائے اور بنائی اور سگریٹ پیتے ہوئے کہنے لگا ——" مجھے انسان کی ازلی نیکی پر یقین کامل ہے۔ فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوگا۔ محلے والے اب انھیں یہاں نہیں ٹکنے دیں گے۔ سوائے شکیلہ اور صاحب اور چند نشہ بازوں کے، سارا محلہ ان کے خلاف ہے۔ اور شاید پیش امام صاحب اس کی طرفداری کریں۔ بہرحال میں چاہتا ہوں کہ پولیس کی دھاندلی سے بچنے کے لئے یہ ساری باتیں حمید صاحب کے کان میں بھی ڈال دی جائیں۔ وہاں کے انسپکٹر سے مجھے بڑا خطرہ ہے۔ کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دے۔

وہ اطمینان سے چائے پی رہا تھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ ہوٹل کے منیجر نے ریڈیو کھول دیا تھا۔ خبریں آ رہی تھیں۔

"ہاں میں تمہیں یہ بتانا بھول ہی گیا ——" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا ——" وہ پستول بالکل خالی تھا۔ ورنہ شاید تم مجھے آج یہاں نہ پاتے۔"

"تو گویا برخوردار —— سوکھی دھونس جما رہے تھے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ریڈیو سے آواز آ رہی تھی:—

"کراچی کے چند معزز شہریوں نے اپنے ایک بیان میں وزیر اعظم بھارت پنڈت جواہر لال نہرو کے حالیہ بیان پر سخت غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان ایک خود مختار مملکت ہے۔ ہم اپنی داخلی اور خارجی پالیسی کے بنانے میں نہ کسی کے مشورے کے طالب ہیں نہ کسی کی مداخلت برداشت کر سکتے ہیں۔ امریکہ اور ....

....

....

اچانک میری نظر جو عثمان کے چہرے پر پڑی، تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دہشت برس رہی تھی۔ اس کا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ وہ کانپتا ہوا کھڑا ہو گیا ——

"چلو! نیاز! —— فوراً چلو ——" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر غصے سے کھینچتے ہوئے کہنے لگا ——" ابھی انسان کی ازلی نیکی سے میرا اعتماد نہیں اٹھا ہے فیصلہ ہمارے ہی حق میں ہوگا —— مگر صداقت کے لئے بھی جنگ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ لوگ جھوٹ کو بھی سچ سمجھنے لگتے ہیں —— چلو —— فوراً چلو۔"

"مگر یہ کیا وحشت ہے! کہاں چلو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"سنا نہیں تم نے —— سنا نہیں —— سنو وہ کیا کہہ رہا ہے ——" اس نے ریڈیو کی طرف اشارہ کیا۔

..... کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ہمارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرے ....

وہ غصے سے کہنے لگا ——" نیاز! —— تم —— بے پیدا کرنے والے کی —— یہی الفاظ قمرالدین نے بھی مجھ سے کہے تھے ....."

میرا سر چکرا گیا —— میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا

دیوندر ستیارتھی

دھن پال

دھن پال سے مجھے نہ محبت ہے نہ نفرت۔ محبت تو اس لئے نہیں ہے کہ اس کے اور میرے بیچ کوئی ایسا نقطہ نہیں ہے جہاں ہم ایک ساتھ مل کر کھڑے ہو سکیں۔ نفرت اس لئے ہے کہ اس کا بس چلے تو مجھے پیس ڈالے۔ اس لئے میں اس سے ہمیشہ بچ کر چلتا ہوں لیکن کبھی کبھار غلطی سے میں اس کی اول فول سن بھی لوں تو میرے دماغ میں اتنی بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے کہ کئی کئی روز تک دھن پال کے تصور سے ہی مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ سوچتا ہوں کبھی کبھار ہی کا مجھ سے یہ غلطی ہوتی ہی کیوں ہے کہ مجھے اس کی بکواس میں بھی مزا لینے کا انداز دکھانے سے کام لینا پڑے۔

اپنی جنم بھومی دھن پال کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اپنے دیس کا ہر انسان اس کی نگاہ میں کمینہ ہے۔ بیہودہ ہے، جھوٹا ہے، جاہل ہے، چور ہے۔ اپنی یہ رائے وہ بار بار دہراتا ہے۔ کبھی وہ مجھے صلاح دیتا ہے کہ میں بھی دو چار برس اس دیس میں گزار آؤں جہاں اس نے دس بارہ برس گزارے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر میں ابھی وہاں ہو آؤں تو مجھے اس کی باتوں میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ جائے گا۔ بار بار وہ امریکہ کا نام یوں اچھالتا ہے جیسے مداری ہوا میں گولے پھینکتا ہے اور انھیں زمین پر گرنے سے بچانے کا مظاہرہ کرتا ہوا بڑی ہوشیاری سے ہاتھ چلاتا رہتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ ہمارا ملک کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ کبھی کہتا ہے کہ یہاں والوں کو ایک صدی تک بات کرنے کی تمیز نہیں آ سکتی۔ کبھی کہتا ہے کہ یہاں والوں کو یہ تمیز تو کبھی آ ہی نہیں سکتی کہ دن بھر کے کام کے بعد کہیں بیٹھ کر مزے سے شام گزاری جائے۔ کبھی کہتا کہ اس نے سخت غلطی کی کہ دس بارہ برس امریکہ میں گزارنے کے بعد یہاں چلا آیا۔ اب مزا تو یہ ہے کہ میں اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہی بات ہے تو جناب یہاں سے تشریف لے جائیے۔

میں تنہائی کا قائل نہیں ہوں۔ دوستوں سے ملنے کے لئے میری طبیعت اکثر مچل اٹھتی ہے۔ طبیعت میں ابال آ جائے تو میں ایسے انسان سے ملنے کے لئے بھی اتاولا ہو جاتا ہوں جسے کبھی دوست نہ بنا سکوں۔ شاعر کا یہ خیال کہ انسان وہی ہے جس کے آوارہ جذبات پگھل کر کسی ملاقات میں ڈھل جائیں، مجھے بے حد پسند ہے۔ لیکن دھن پال کو دور سے دیکھ کر ہی میں منھ چھپانے کی ترکیب سوچنے لگتا ہوں۔

دھن پال سے بچنا آسان بھی تو نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں کی حشمت، اس کے ہاتھوں کی گرفت، اس کی باتوں کی دولتی ـــــ کسی سے بھی بچ نکلنا آسان نہیں ہے۔ بات کرتے کرتے اس کی آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں۔ چھپکلیاں کی طرح وہ دولتی چلاتا ہے۔ کوئی اس سے بچ کر چلے، یہ بھی تو اسے پسند نہیں۔

ادھر بہت دنوں سے میں دھن پال کی دولتی سے بچتا آیا تھا۔ اگر اسے یہ ملک اتنا ہی ناپسند ہے تو وہ امریکہ سے واپس کیوں آیا؟ آج بھی میں اس سے یہ سوال پوچھ بیٹھوں تو وہ مجھ پر دو دولتی اچھالنے لگے۔

ایک روز اس کی نازک بیانیوں کو سنتے سنتے میرے منھ سے نکل گیا: "تم ایک کتاب کیوں نہیں لکھتے؟"

اس نے جھٹ جھنجھلا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے سوچا کہ میری شامت آ گئی۔ لیکن پھر ذرا سنبھل کر اس نے کہا: "وہ کام بھی کریں گے اگر اس کا وقت آیا۔"

میں نے تو قسم کھائی تھی کہ اس کی دولتی سے مجھے ہر حال بچ کر چلنا ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"امریکی لڑکیوں کو میں ہندوستان کے قصے سنا سنا کر حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ امریکہ میں میرے پروفیسر میری ذہانت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ مجھے امریکہ میں اپنی تعلیم کے دوران میں ہندوستان کے بارے میں لکچر دے کر اچھی خاصی آمدنی کا ذریعہ حاصل ہو گیا تھا۔ امریکہ میں گنگا اور ہمالہ پر میری تقریر بہت جگہ سینکڑوں ہزاروں تالیوں کے بیچ میں پسند کی گئی۔ کئی بار ٹیگور اور گاندھی پر بولنے کے لئے مجھے مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے دعوت ملی۔"

میں کچھ نہ بولا، کیونکہ یہ قصے تو وہ کئی بار سنا چکا تھا اور حق تو یہ تھا کہ میں اس کی رٹی رٹائی باتیں سننے کے لئے بھی مجبور تھا۔ کیونکہ اس کی دولتیوں سے بچنے کا دوسرا راستہ

نظر نہ آتا تھا۔

وجے راگھو کے ہاں پہلے پہل دھن پال سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وجے راگھو نے اسے بارے رائے دی تھی کہ وہ انسان بنے اور اس ملک میں رہنے کا تہیہ کرے۔ دھن پال نے اس مشورہ پر یہاں رہنے کا فیصلہ کیا کہ اسے حسب خواہش کام ملے اور جھجھنے کی بجائے پہلے زیادہ نہیں تو پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ کا وسیلہ حاصل ہو جائے۔ اس پایہ وقت راگھو کی ہمت سخی کر اپنے رسوخ سے دھن پال کو ایک پبلشنگ ہاؤس میں حسب خواہش کام دلانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اسے راگھو نے ... دھن پال کو دوبارہ امریکہ جانے سے روکا۔ بلکہ اسے اس ملک کے بارے میں رائے بدلنے کا موقعہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن یہ ناممکن تھا کہ دھن پال اس ملک کے بارے میں کوئی تعریف کا جملہ زبان پر لا سکے۔

وجے راگھو میرا دوست نہ ہوتا تو شاید دھن پال سے میری ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی۔ اب اگرچہ وجے راگھو نثر لکھا کرتا تھا اور اپنی کسی تصنیف کے بارے میں میری رائے پوچھ لیتا تھا تو اس سے دھن پال کو تو تکلیف نہ ہونی چاہئے تھی۔ وجے راگھو افسر بھی تھا اور مصنف بھی ... جب راگھو کا بھی کیا قصور رہتا ؟ دھن پال کو نہ وجے راگھو کا مصنف ہونا پسند تھا۔ اس کا مجھ سے رائے لینا خاص طور پر دھن پال کو یہ بات ... بہت کھلتی تھی کہ وجے راگھو اپنی کسی تصنیف کے لے آؤٹ کے بارے میں میرے ساتھ ذکر بھی کرے۔ وہ چاہتا تھا کہ دھن پال کے پبلشنگ ہاؤس میں یہ ہی ساری بات چھوڑ دی جائے۔

ابھی اگلے ہی روز کی بات ہے۔ ... وجے راگھو نے بتایا کہ اجنتا پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے گنگا پران کی ایک کتاب شائع ہو رہی ہے جو انھوں نے انہی دنوں ختم کی ہے اور اجنتا پبلشنگ ہاؤس کو انھوں نے یہ کتاب ... کہ اس کا لے آؤٹ مجھ پر چھوڑ دیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ اجنتا پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے دھن پال بھی آرہا ہے اور سب بات پہلے سے طے کی جا چکی ہے۔

تھوڑی دیر بعد دھن پال آگیا اور آتے ہی اس نے وجے راگھو کے ہاتھ میں چٹھی دیتے ہوئے کہا: "لیجئے جناب بات طے ہوگئی۔"

پھر اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: "ہیلو لے آؤٹ ایکسپرٹ!"

وجے راگھو کو کہیں پہنچنا تھا۔ اس نے جلدی میں وہ چٹھی مجھے تھما دی اور کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

دھن پال نے جیسے پہلی بار میری لیاقت کا دبا دبا سا اعتراف کیا۔ بولا: "تو آپ ہیں لے آؤٹ ... صاحب۔ ... کا چکر لگایا جائے۔"

چلتے چلتے ایک جگہ رک کر وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ بولا: "تم نے وجے راگھو پہ جادو تو نہیں کر دیا؟ دیکھو انھوں نے نہیں مانا ... ہمارا پبلشنگ ہاؤس تو مجبور تھا۔"

"اب بتاؤ اس میں میرا کیا قصور ہے اگر وجے راگھو میرے بارے میں ٹھیک نہیں سوچتا؟"

"خیر یہ تو غلط ہے کہ وجے راگھو تمہارے بارے میں ٹھیک نہیں سوچتا۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے؟"

"تو اس بات کو یہیں ختم کر دیجئے۔"

"لیکن ایک اور بات بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یار ہماری سنر لیتی جی تمہارے افسانوں کی تعریف کر دیتی ہیں۔"

"یہ تو ان کی زبردستی ہے۔"

"خیر زبردستی تو نہیں۔ لیکن ان کی رائے بھی کسی حد تک تمہاری تحریر کے بارے میں ویسی ہی ہے جیسے جدید لے آؤٹ سے متعلق تمہاری سمجھ بوجھ کے بارے میں وجے راگھو کی۔ اب میں اس سادہ لوح عورت سے کہتا ہوں کہ لے آؤٹ سیکھنے کے لئے امریکہ میں رہنا ضروری ہے۔ ... صحیح قسم کی تحریر کے لئے بھی امریکہ جانا ہوگا میرے دوست کو۔"

"لے آؤٹ کو تو خیر گولی مارو" میں نے صفائی دی۔ "ہاں جہاں تک تحریر کا تعلق ہے اچھا ہو کہ میں نیویارک کا ایک چکر ضرور لگاؤں۔"

"لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا۔" وہ تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے اور ادھر ادھر جاتی ہوئی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہاں تو وہ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم وہ کچھ نہیں لکھ سکو گے جو اب لکھتے ہو۔ یعنی پھر تمہاری تحریر میں وہ درد نہیں رہے گا، وہ تڑپ نہیں رہے گی، وہ بے کلی سی نہیں ہوگی جس پر ہماری شرلیتی جی بھی کسی حد تک فدا ہو جاتی ہیں۔ وہاں سے لوٹ کر تم غریبوں کے بارے میں کچھ بھی لکھنا گوارا نہ کرو گے۔ تمہارے افسانوں میں لارڈوں کا ذکر ہوگا۔ جس کمرے کا ماحول تم کھینچو گے وہاں کی ایک کرسی اور ایک ایک میز

سینکڑوں کی مالیت کا ہوگا۔ اس کمرے کی ایک ایک الماری ہزاروں روپے کی مالیت کی ہوگی۔ انسانوں سے بھی زیادہ تم عیش و عشرت کے سامان کا ذکر کروگے۔ اور ایسے افسانے یک بھی تو وہیں بکتے ہیں کھاتے پیتے لوگوں میں! یہاں کے کنگال بھک منگے قسم کے لوگ اور چار سو بیس قسم کے لوگ کیا جانیں کہ عیش کس چڑیا کا نام ہے۔ یہاں تو یقیناً گھٹیا قسم کے افسانوں کے لئے ہی مارکٹ مل سکتی ہے اسی لئے تو میں بھی قلم نہیں اٹھاتا!"

"اب آپ تو امریکہ چلے آئے ہیں، دوسرے رنگ کی چیز پیش کر سکتے ہیں۔"

"میرے پاس چیزوں کی کمی تو نہیں ہے لیکن اب اور لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس ملک میں اس قسم کی چیزیں کون پسند کرے گا؟ اس ملک میں ہر تیسرے قدم پر شخص تم سے ملتا ہے مجھو لوکر رہ جوتا ہے۔ مکار ہے، فریبی ہے، چار سو بیس ہے۔ کیونکہ اس فضا میں وہ پروان چڑھتا ہے اس میں یہ سب چیزیں ملی ہوئی ہیں جیسے یہاں کی ہوا میں دھول ملی ہوئی رہتی ہے۔"

اب ہم ایک ایسی دکان کے سامنے جا پہنچے تھے جہاں پھولوں اور سبزیوں کے بیج بھی ملتے تھے۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "آؤ تھوڑے بیج لے لیں۔"

"چلئے۔" میں نے آج کی شام کی اس قید کی آخری گھڑی کا انتظار کرتے ہوئے کہا۔

وہ بار بار بیجوں سے بھرے لفافے ٹٹولتا رہا اور دل ہی دل میں ان کی قیمت کا حساب لگاتا رہا: "یار کئی بار یہ لفافے لے جا کر دیکھ چکا ہوں۔ زمین سے کوئی پودہ پھوٹتا نظر ہی نہیں آتا۔"

"یہ تو ناممکن ہے۔" میں نے شہہ دی: "آخر سب کے سب بیج تو خراب نہیں ہو سکتے۔"

وہ بیجوں کے لفافوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ کیا خریدے اور کیا نہ خریدے۔

یہ وہی شخص تھا جس کی دو ڈھائی برس پیشتر شادی ہوئی تھی جس لڑکی سے اس نے شادی کی بہت بڑے بینک بیلنس کی مالک تھی۔ میں نے ان دنوں ہنس کر دھن پال سے کہا تھا: "ہمارے ہاں تو لڑکی کو ویسے ہی لکشمی کہا جاتا ہے۔ صدیوں سے یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ لڑکی بیاہ کے بعد نئے گھر میں آتی ہے تو اپنی قسمت ساتھ لے کر آتی ہے۔"

اپنے بیاہ سے پہلے ایک روز میں دھن پال کے کمرے میں گیا۔ وہاں وہ پاکیزہ سی صورت نظر آئی۔ میرا تعارف کراتے ہوئے اس نے اس لڑکی سے میرے افسانوں کا ذکر کر دیا۔ اس پر اس لڑکی نے کئی افسانے گنا دئے اور بتایا کہ وہ انھیں شوق سے پڑھتی رہی ہے۔ خیر اس لڑکی نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ دھن پال کھانے پینے اور پہننے کے اعتبار سے ننانوے فی صدی امریکن ہے۔

دھن پال کی مصیبت تھی تو یہی کہ اسے یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شادی کے بعد اپنی تنخواہ بیوی کے حساب میں جمع کرائے یا اپنا حساب بھی قائم رکھے اپنے بینک میں۔ ویسے وہ خوش تھا۔ کیونکہ اسے اپنے بینک بیلنس سے کہیں زیادہ بینک بیلنس حاصل ہونے والا تھا۔

"ہماری شریمتی جی کو پھولوں کا بہت شوق ہے۔" دھن پال نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

میں کچھ نہ بولا۔ اسٹور میں سجا کر رکھی ہوئی طرح طرح کی چیزیں میری نگاہ میں تیرتی رہیں۔ گاہکوں کی مسکراہٹیں نہ ہوتیں تو میرے لئے وہاں دس منٹ کا وقت گزارنا بھی سر درد سے کم نہ ہوتا۔ مجھے یاد آیا کہ بیاہ سے پہلے ایک بار دھن پال نے مجھے بتایا تھا کہ ویسے تو اس کا ارادہ ایک امریکن لڑکی سے بیاہ کرنے کا تھا لیکن وہ امریکہ چھوڑ کر آنے کو تیار نہ تھی۔ اس لئے اسے وہیں چھوڑ کر وہ یہاں چلا آیا تھا۔ دراصل وہ اس ارادے سے بالکل نہیں آیا تھا کہ امریکہ لوٹ کر نہیں جائے گا اور اب بھی جبکہ اسے امریکہ سے آئے سات برس ہونے کو آئے وہ کئی بار امریکہ جانے کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔

بیجوں کے لفافے سے نظر ہٹا کر اس نے دو بار میری طرف دیکھا اور کہا: "میرا ارادہ ہے کہ پھولوں کے بیج نہ لوں اور سبزیوں کے بیج لے لوں۔ لیکن شریمتی جی کا ڈر بھی تو مجھے مارے ڈالتا ہے۔"

"ڈرنے سے تو کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"ڈرنے سے ایک فائدہ ضرور ہے۔ طلاق کی نوبت نہیں آتی۔"

"امریکہ میں تو طلاق کی بیماری بہت زیادہ پھیل چکی ہے۔"

"ارے بھئی! اسی لئے میں نے یہ علاج ڈھونڈ نکالا ہے۔ میں بھی کتنا خوش قسمت ہوں۔ کتنی مزیدار بات ہوئی کہ لیبی دلہن نے ایک طرح سے امریکی دولہا تلاش

لیا۔ اور پھر اس دیسی دلہن کا بینک بیلنس بھی کافی ہے۔ خیر اب تو ہمارے ہاں ایک آئی بھی پیدا ہو چکی ہے۔"

اس بیچ میں بہت سے گاہک اپنے مطلب کی چیزیں لے کر چل دئے تھے۔ لیکن دھن پال ابھی تک بیجوں کے لفافے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ یہ فیصلہ بھی نہ کر پا رہا تھا کہ پھولوں کے بیج خریدے یا سبزیوں کے۔

میں چاہتا تھا کہ بہت جلد اس سے ہاتھ ملا کر کہوں "دوست! اب مجھے چھوڑ دو۔ پہلے ہی تم مجھے نہایت احمق قسم کا انسان سمجھو لیکن میں اتنا احمق بھی نہیں بننا چاہتا کہ خواہ مخواہ کسی کی اردلی میں کھڑا رہوں۔ میں کسی ہوٹل کا بیرا تو ہوں نہیں کسی کے رحم پر جینے والا۔ میں تو ایک چھوٹا سا مصنف ہوں اور میں تو امریکہ جانے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ ایسا تم ہو کہ امریکہ جانے کو گنگا اشنان سمجھتے ہو۔ تمہیں ہمارے ملک سے، رہنے والوں سے نفرت ہے۔ گو تم ہمارے ملک کی لڑکیوں یا کسی ایک امیر لڑکی سے شادی کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اب مجھے اس کی بھی پروا نہیں کہ تم ہرے مارے۔ میں اپنی شرمیلی سے کیا کیا کھری کھری باتیں کہہ ڈالتے ہو۔ اور شاید ایک روز تمہاری باتوں میں آکر وہ یہ کہنے کے لئے تیار ہو جائے گی کہ تمہارا دوست لینی میں ایک کوڑی قیمت کی کہانی نہیں لکھتا۔ لیکن اب میں ایک منٹ کے لئے بھی یہاں نہیں رک سکتا۔ لیکن اپنی مجبوری پر ہاتھ ملتا رہا۔

"تم کیوں اداس ہو گئے؟" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھو بھئی مجھے جانے دو۔"

"تم ابھی نہیں جا سکتے۔"

"تو خرید لو نہ بیج۔ یا ابھی فیصلہ نہیں کر پائے۔ تم تو کہتے تھے کہ امریکہ میں سب کام تیز تیز کئے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ امریکی قسم کے دولہا پر خالص ہندوستانی قسم کی دلہن کا اثر شروع ہو گیا!"

"ارے بھئی! میں نے تو سات لفافے چن لئے۔ اب دیکھیں یہ بیج کیسے نکلتے ہیں۔"

"پھولوں کے بیج لئے ہیں یا سبزیوں کے؟"

"سبزیوں کے بیج ہیں۔ پھولوں کے بیجوں کو گولی مارو۔ ارے بھئی، پھولوں کو دیکھنے سے آنکھیں بھلے ہی خوش ہو جائیں لیکن اصل چیز تو سبزیاں ہیں۔ ہمارے پروفیسر کہا کرتے تھے کہ بیٹا خوب سبزیاں کھاؤ۔"

کاؤنٹر پر جا کر اس نے ان لفافوں کی قیمت پوچھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہی اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "ایک روپیہ تو نکالو۔"

میں نے ایک روپے کا کرنسی نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بل ادا کرنے کے بعد بیجوں کے لفافوں کو ایک بڑے لفافے میں ڈلوا کر وہ بولا "تو اب چلنا چاہیے۔"

ہم باہر نکلے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چھٹی مل جائے گی۔ لیکن برامدے سے ہوتے ہوئے یونہی ہم اگلے موڑ پر پہنچے۔ جہاں کتابوں کی ایک دکان تھی۔ وہ رک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کے ہمراہ کتابوں کی دکان کے اندر بالکل نہیں جاؤں گا۔ یہ تو میری عزت رہ گئی تھی کہ موقع پر اسے محض ایک روپے کی ضرورت پڑی اور میں نے ایک طرح سے جیب خالی کر دی۔ اب صرف ایک چونی پڑی تھی جیب کے ایک کونے میں جسے میں ہاتھ سے مسل رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ دوبارہ میرا امتحان لینے پر نہ اتر آئے۔ بھاڑ میں جائے لے آؤٹ کا تجربہ جو دبے راکھو کو پسند تھا، جہنم میں جائیں میرے افسانے جن کی تعریف مسز دھن پال اپنے خاوند کے سامنے بار بار کر چکی تھیں جیسا کہ دھن پال مجھ سے کہتا رہتا تھا ـــــ میں کہنا چاہتا تھا کہ مجھے کسی شخص کی قدر شناسی اپنے چنگل میں باندھ کر نہیں رکھ سکتی۔ میں سیدھا گھر جانا چاہتا ہوں ـــــ دھن پال نے کناٹ پلیس کے برآمدے میں کھڑے کھڑے بڑے غور سے آنے جانے والوں کو دیکھا اور کہنا شروع کیا: "مجھے ہمیشہ امریکہ کی یاد آتی ہے۔ یہ ملک میرے اپنے لائق بالکل نہیں ہے۔ امریکہ سے ناحق یہاں آیا۔ امریکہ میرا خیال ہے، آج بھی میرے لئے جگہ ہے۔ یہ لوگ جو آ جا رہے ہیں کتنے بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ جب میں کناٹ پلیس کے کسی کونے پر شرنارتھی عورتوں کو گول گپے اور چاٹ کھاتے دیکھتا ہوں تو مجھے امریکہ کی یاد آتی ہے۔ جہاں معمولی سے معمولی لوگ بھی بسکٹ اور کیک کھاتے نظر آئیں گے۔"

"یہ لوگ بھی بسکٹ اور کیک کھا سکتے ہیں" میں نے طنز کی۔ "ان لوگوں کا بسکٹ اور کیک کھانے سے انکاری تھوڑی ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ شرنارتھی

عورتیں گول گپّے اور چاٹ سے سنڈے ختم کر کے ہسکٹ اور کیک کی طرف ہی سفر کرتے جا رہی ہیں۔ انھیں بھی کھانے کا موقع دیجئے پھر دیکھئے وہ بھی کتنی بار کیک پر ہاتھ صاف کرتی ہیں۔

دھن پال نے انکار میں سر ہلایا "یہاں کھڑے ہو کر تم امریکہ کے بارے میں سوچ نہیں سکتے کہ وہ کیسا ملک ہے جہاں غریب سے غریب آدمی بھی ڈالروں سے کھیلتا ہے۔ وِٹ از اے لینڈ آف گریٹ اپر چونیٹیز!۔۔۔۔ وہاں ہر شخص کو ترقی کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔"

میں نے دھن پال کو گھور کر دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ دھن پال بے سر کا ہے جو یہاں کناٹ پلیس کے برآمدے میں کھڑا ہے، بے سر کا انسان جیسے بے پیندے کا لوٹا ہوتا ہے۔ اس کا سر امریکہ ہی میں رہ گیا! پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو بارہا اصلی امریکنوں سے مل چکا ہوں۔ جب اصلی امریکن بھی مجھے مرعوب نہ کر سکے تو یہ بے سر کا انسان مجھے کیسے مرعوب کر سکتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی اہمیت یہی تھی کہ وہ دس بارہ برس امریکہ میں جھاڑ پھونک آیا تھا۔

"اچھا بھئی اب مجھے چھٹی دو" میں نے جھنجھلا کر کہا "اب میں چلتا ہوں۔"

دھن پال صرف مسکراتا رہا۔ وہ ایک انجن کی طرح کھڑا تھا۔ وہ ایک انجن کی طرح کھڑا تھا جو چلتے چلتے رک گیا ہو۔ میں نے سوچا کہ اب اچھا موقعہ ہے اور مجھے بھاگ جانا چاہئے لیکن میرا بازو انجن کی گرفت میں تھا۔ اور یونہی میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی انجن نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا "تو تم بھاگنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اب بتاؤ میں نے کیا غلط کہا تھا کہ ہر تیسرے قدم پر اس ملک میں جو انسان ملتا ہے وہ دھوکے باز اور جھوٹا ہے۔ ارے بھئی چاہتا تو میں بھی ہوں کہ میں بھی خوب لکھوں لیکن سوچتا ہوں کہ ان ٹھگ بازوں اور جھوٹے انسانوں کے لئے لکھوں!"

میں نے جھنجھلا کر کہا "مجھے چھوڑ دو۔ میری طبیعت اچھی نہیں ہے دھن پال۔"

"گویا تم بہانہ ساز بھی ہو" اس نے ہنس کر کہا "آج تمہارے بہلانے نہیں چلیں گے۔ ارے یار آج شریمتی جی سے تھوڑی سی چھٹی مل گئی تھی۔ چلو تم مل گئے۔ اب میرے مزے کو کرکرا نہ کرو۔"

کناٹ پلیس کے برآمدے کے اس کونے میں میں دھن پال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا۔ کیونکہ جسمانی طاقت کے لحاظ سے وہ مجھ سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے یہ میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ پاس کے اسٹال سے ایک میگزین اٹھا کر بولا "لے آؤٹ ایکسپرٹ صاحب! امریکہ کے اس میگزین کا لے آؤٹ دیکھئے اور چلّو بھر پانی میں ناک ڈبو کر مر جائیے۔ میری شریمتی جی کو یہ میگزین پسند نہیں۔ اسے تو گھٹیا ہندوستانی میگزین ہی پسند ہیں۔ بڑی جاہل قسم کی عورت ہے۔"

"میں چلتا ہوں۔" میں نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی "تم تو اب گالیوں پر اتر آئے اور اپنی شریمتی تک کو لپیٹ میں لینے پر تل گئے ہو۔"

"میں تو اس وقت وجے راگھو کو بھی کھری کھری سنا سکتا ہوں۔" وہ بولا "اور سچ پوچھو تو اسوقت میں اپنی بیوی کو بھی خوب آڑے ہاتھ لوں! ارے بھئی اس عورت کا ٹیسٹ بدلنے میں میں رتّی بھر کامیاب نہیں ہوا!"

"مجھے چھوڑ دو۔"

"یہ وجے راگھو نہ جانے خود کو کیا سمجھتا ہے۔ اس قسم کا نک چڑھا پن تم مجھ میں نہ پاؤ گے۔" دھن پال نے مجھے گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "وجے راگھو مسکراتا بھی ہے تو گویا تم پر مہربانی کرتا ہے۔ وہ اگر پندرہ منٹ تم سے بات کرتا ہے تو اس ڈھنگ سے کہ تم خوش رہو اور اس کے کام آتے رہو۔ وہ افسر ٹھہرا۔ اس کی سرشت میں چاپلوسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مجھ میں تم یہ نک چڑھا پن نہ پاؤ گے۔ میں تو صاف صاف بات کرتا ہوں۔ یہ بات میں نے امریکہ سے سیکھی۔ وجے راگھو تو ہم دونوں کو اُلّو بنا رہا ہے۔ یہ منہ اور یہ چپت۔ تم خود ہی سوچو کہ اس کی کتاب میں ایسی کیا بات ہے کہ اسے بین الاقوامی نمائش میں دوسرے درجے کے انعام کے قابل سمجھا جائے۔ وہ واقعی ہمیں بنا رہا ہے اور خود بن رہا ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ باہر سے یہاں آئے اور ہمیں ٹیلیفون کر دے اور ہم کتوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے دم ہلا کر بھاگیں! اس سے انکار نہیں کہ اس کی سفارش ہمارے آڑے آئی اور ہم آج روٹی کھا رہے ہیں۔ لیکن امریکہ میں کوئی شخص کسی کا کام کرنے کے بعد کبھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ اب اس شخص کو ہمیشہ کے لئے غلام بنا لے۔ امریکہ میں غلامی کا دور ختم ہوئے برسوں بیت گئے۔ اور اب وہاں زندگی کا طور طریقہ ہی الگ ہے۔ ارے بھئی ڈالروں کا قحط نہ ہو جس ملک میں وہاں انسانیت خود بخود اونچی اٹھ جاتی ہے۔ وجے راگھو تو ہمیں اپنی انگلی کے اشارے پر نچانا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ ہماری تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہے۔"

"مجھے نہ وجے راگھو سے تعریف چاہئے نہ تم سے" میں نے کہا "دیکھو دھن پال مجھے چھوڑ دو۔"

"ایک کہانی یاد آ گئی۔ وہ ضرور سنتے جاؤ۔"

"سنا ڈالو"

"ہاں تو امریکہ کے ایک پروفیسر نے اپنی بیوی سے کہا —— ادھر آؤ مس کیٹ میری بات سنو! اور صاحب مس کیٹ کو مس پروفیسر نے اپنی زبان سکھا دی تھی۔ مس کیٹ نے کہا میں نہیں آؤں گی۔ تم اپنا کام کرو۔ مجھے ابھی فرصت نہیں۔ اور پھر شام کو جب پروفیسر کے ہاں چائے پر بہت سے دوست اور ان کی بیویاں اور کچھ کی معشوقائیں اور سہنے والی بیبیاں جمع ہوئیں۔ تو بلی نے وہاں آکر پروفیسر سے کہا "تم انسان لوگ بھی کتنے بدذوق واقع ہوئے ہو۔"

"اور تم بھی کچھ کم بدذوق نہیں ہو دھن پال!" میں نے کہا "میں چلتا ہوں۔ مجھے رخصت کرو۔"

"ارے بھئی پوری کہانی تو سنتے جاؤ۔ پانچ سو ڈالر کی کہانی ہے۔ ہاں تو مس کیٹ نے اپنے پروفیسر سے کہا۔ تم انسان بہت ہی کمینے ہو۔ ہمیشہ لوگوں کی پیٹھ پیچھے برائی کرتے ہو۔"

"تم بھی تو وجے راگھو اور اپنی شریمتی کی برائی ان کی پیٹھ پیچھے کرتے ہو، دھن پال۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی بیچ میں کیوں بولتے ہو؟ ہاں تو مس کیٹ کہہ رہی تھی کہ مسز فلاں مسز فلاں کی یوں برائی کر رہی تھی اور مس فلاں کی ماں مسز فلاں کی لڑکی کے بارے میں نہ جانے کیا کیا بک رہی تھی۔ اور آج جب کہ سبھی لوگ موجود ہیں وہ ایک دوسرے کے سامنے یہ بات کہنے کی ہمت کیوں نہیں کر سکتیں۔ ہاں تو صاحب مس کیٹ کی بات عورتوں تک بھی جا پہنچی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ مس کیٹ مزاک پرکار کے نیچے دب کر مر گئی۔ اب عورتوں نے رو رو کے قہقہے لگائے کہ ان کی برائی کرنے والی وہ جیتی صورت دنیا سے ختم ہوگئی۔ —— کہو بھئی یہ کہانی کیسی ہے۔ اور میرا تو خیال ہے۔ اس زندگی میں تم ایسی کہانی کبھی نہ لکھ سکو گے۔ یہ کہانی امریکہ کے ایک شخص نے لکھی اور اس پر امریکہ کے ایک میگزین کے ایڈیٹر نے پانچ سو ڈالر انعام دیا۔"

"کوئی اور کہانی ہو تو وہ بھی سنا ڈالو دھن پال!" میں نے جھنجھلا کر کہا "میری شام تو تباہ ہوگئی۔ اب اور بھی تباہ کردو تو کیا بگڑتا ہے۔"

"تو تمہیں میری صحبت اتنی ہی ناپسند ہے۔"

"تمہیں گھر جانا چاہیے۔ تمہاری شریمتی جی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی دھن پال!"

"ارے شریمتی کے چکر میں پھنسنے والے انسان دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔"

"یہ غلط بات ہے۔ اس طرح تو تم بہت بڑے بینک بیلنس سے ہاتھ دھو بیٹھو گے دھن پال!"

"ارے ہاں بھئی شکریہ شکریہ۔ تم نے ٹھیک یاد دلایا۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ اگلے بلاک کی اگلی نکڑ والی دکان کے سامنے تک تو چلو میرے ساتھ۔ جہاں اپنی شریمتی جی سے ملنے کی میں نے اپوئنٹ منٹ کر رکھی ہے۔"

"چلیے" میں نے اس کی جنگل سے چھوٹنے کی خواہش میں کہا "میں تمہیں وہاں چھوڑ آتا ہوں لیکن اس سے آگے ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں گا۔"

کناٹ پلیس کے برآمدے میں لوگ آجا رہے تھے اور انہی کے بیچ سے اپنا راستہ چیرتے ہوئے ہم بھی بڑھے جا رہے تھے۔ مجھے اپنی بے عقلی پر بری طرح غصہ آرہا تھا۔ آخر میں نے وجے راگھو سے چھٹی پانے کے بعد ہی دھن پال سے کیوں چھٹی نہ پالی۔ وجے راگھو سے ملنے کی بھی ایسی کیا بات تھی۔ انسان کو اپنی شخصیت کی اہمیت پہچاننی چاہیے۔

شام کے سائے لمبے ہو کر رات کے آنچل سے لپٹ چکے تھے۔ بجلی کی روشنی میں آنے جانے والوں کے چہرے بہت جاذب نظر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن میری طبیعت پر اتنا بوجھ تھا کہ کوئی صورت مجھ پر اپنا اثر نہ کر سکتی تھی۔ لیکن سوچ رہا تھا کہ یہی وہ زندگی ہے جسے انسان، اپنی میراث کہہ سکتا ہے۔ آنے جانے والوں کے الفاظ میں مجھے رنگینی محسوس ہو رہی تھی۔ دھن پال تو شاید عادت سے مجبور تھا۔ لیکن اس نے مجھے اپنی گرفت میں کیوں لے رکھا تھا؟ آخر ہم تو ایک ہی شہر میں کام کرتے تھے اور ٹیلیفون ملاقات تو ہو ہی جاتی تھی۔ اسے یہ کیا سوجھی کہ خواہ مخواہ میری شام کو برباد کر دے۔ آخر اس نے یہ کیسے اندازہ لگا لیا کہ اس کی مسکراہٹوں سے میری روح کا غم ڈھل جائے گا! بے چارہ دھن پال! مجھے اس کی تیامت پر ترس آرہا تھا۔ اس کا تصور کھوکھلا تھا۔ اسے امریکہ سے ہمیشہ شہرت کی توقع رہتی تھی۔ وہ بے پیندے کا لوٹا تھا۔ اس کا پیندا تھا امریکہ۔ اس کے دماغ کا زنگ صرف امریکہ کے ذکر خیر سے ہی اتر سکتا تھا۔ کم سے کم اس کا یہی خیال تھا۔ اور میرے لئے تو امریکہ ایک انجانی دنیا تھی۔ ایک ذہنی جھٹکے کے ساتھ میں نے کناٹ پلیس کے برآمدے سے آنے جانے والوں کی صورتوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایسی صورتیں بھی تھیں جن کی نگاہوں میں سپنے ابھر رہے تھے۔ جس جگہ ایسی کوئی صورت نظر آجاتی ایک تخیل ایک گدگدی سی محسوس کرنے لگتا۔ لوگوں کی آوازوں میں پرندوں کے نغموں کی سی شیرینی

سنائی دینے لگی۔ بجلی کی روشنی میں دلنواز لڑکیوں کے گھنگھریلے بوب کٹ فیشن کے بال۔ ان کی آنکھوں کے نخرے۔ ان کے ٹھک ٹھک کر چلنے اور چہک چہک کر بولنے کے انداز مجھے بے حد پسند آئے اور میں نے سمجھ لیا کہ یہی امریکہ ہے میرے لئے۔

اگلے برآمدے کی اگلی نکڑ سے ہم بہت آگے نکل آئے تھے۔ ایک جگہ دھن پال رک گیا۔ بولا "اب ذرا پیچھے آؤ۔ تمہیں اپنی کار بھی دکھادوں۔"

"بھئی وہ بھی دکھادو اگر کوئی کسر رہ گئی ہو۔ دھن پال۔"

وہ مجھے اپنی کار کے پاس لے گیا۔ کار کی کھڑکی سے ایک بچی جھانک رہی تھی۔ "یہ ہماری بچی ہے" وہ بولا "میرے ساتھ امریکن انگریزی میں بات کرتی ہے۔"

میں نے بچی کے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا "اس شکل صورت تو اپنی ماں جیسی ہے۔"

"ڈرو نہیں" وہ بولا "میرے پاس ایک امریکی نسخہ ہے۔ اگلے تین مہینوں میں اس کے خدو خال میرے جیسے ہو جائیں گے۔"

"تو وہ دوا پہلے ہی کھلادی ہوتی مسز دھن پال کو۔"

"ارے بھئی خاص امریکہ سے منگوائی ہے۔ اور ابھی پچھلے ہی ہفتے آئی ہے یہ دوا۔"

اتنے میں مسز دھن پال نے پیچھے سے آکر کہا "میں ابھی ٹیلیفون سے پوچھ کر آرہی ہوں۔ پتہ چلا کہ تم لوگ وجے راگھو سے ایک گھنٹے سے الگ ہو چکے ہو۔ تو کہاں رہ گئے تھے۔ یہ ایک گھنٹہ تم لوگوں نے کہاں گنوایا؟ یہ گھنٹہ کہاں برباد ہوا؟"

"ڈارلنگ، میں تمہارے لئے بیج لایا ہوں!" دھن پال نے لجاجت سے کہا۔

"کاہے کے بیج؟ پھولوں کے بیج ہی ہیں نا؟" مسز دھن پال مسکرائی۔

"ارے بھئی پھولوں کو گولی مارو۔ امریکی نظریہ تو سبزیوں کا مداح ہے۔"

"تو واپس چلنا ہوگا" مسز دھن پال نے ایک دم بگڑ کر کہا "ہمیں یہ امریکی بیج واپس کر کے ہندوستانی پھولوں کے بیج لانے ہوں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"یہی ہوگا۔"

میں نے دیکھا کہ میاں بیوی میں جھڑپ شروع ہو گئی۔ مسز دھن پال کو میرے افسانے پسند سہی، میں نے سوچا لیکن اب انھیں فرصت نہیں۔

میں ان لوگوں کی آنکھ بچا کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ بار بار میں جیب میں ہاتھ ڈال کر چونی کو مسلتا رہا۔ اس روز میں کافی ہاؤس نہ جا سکا۔ کیونکہ کافی ہاؤس میں ایک کپ کافی پینے اور بیرے کو ایک آنہ ٹپ کرنے لائق پیسے میری جیب میں کہاں تھے۔ کاش! میں نے جھوٹ بول دیا ہوتا اور دھن پال کو ایک روپے کا کرنسی نوٹ نکال کر نہ دیا ہوتا جس کے بل بوتے پر میں اپنی شام کو رنگین بنا سکتا تھا۔

○

پریم ناتھ پردیسی

بنفشہ کے پھول

سکندر ملک کا چڑچڑاپن اب کسی کے لئے باعثِ حیرت نہ تھا۔ گھر کے سب افراد محلے والے اور اس کے اپنے شاگرد اس کی قنوطیت سے واقف ہو چکے تھے۔ ہر چند وہ بولتا کم اور سوچتا زیادہ تھا تاہم جب بھی بولتا تھا تمام موضوعات پر مقدور بھر بولتا تھا۔ نمک کی گرانی سے لے کر ایورسٹ کی چوٹی تک اس کی گفتگو کی زد میں آجاتے تھے۔ اور سننے والے حیران رہ جاتے تھے کہ اس مرد کے اندر کتنی آگ دبی ہوئی ہے۔ یہ دریا کی آگ، مایوسیوں اور وسوسوں کی آگ، جو اس کی اپنی نہیں تھی۔ ماحول کی لگائی ہوئی تھی۔ اور جسے وہ کوشش کے باوجود بجھا نہیں سکتا تھا۔

وہ صبح سے شام تک آدھ درجن شاگردوں کو لئے اس کوٹھڑی پر بیٹھا رفل کی چادریں کاڑھتا تھا۔ جو شالامار باغ کی طرف کھلتی تھی۔ درمیان میں ہارون بانے والی خستہ حال سڑک تھی جس پر کبھی کبھی فوجی گاڑیاں، تانگے اور بسیں شور مچاتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر سکندر کی آنکھوں میں مسرت کی ہلکی سی لکیر جھلک اٹھتی، اس لئے کہ وہ زندگی میں خوشگوار حرکت چاہتا تھا۔ خوش آئند شور چاہتا تھا۔ اور جب تک گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوتی وہ اسے اور اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے گرد و غبار کے طوفان کو دیکھتا رہتا۔ پھر اس کی نظر شاہی فصیل کو پھاند کر شالامار باغ میں پہنچ جاتی جو مغلیہ دبدبے اور جاہ و جلال کی دلکش کی صورت میں ڈل کے ایک کنارے صدیوں سے لیٹی تھی۔ سکندر ملک اگرچہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا مگر وہ باشعور ضرور تھا۔ اُسے اپنے ملک کے ماضی کی تمام کہانیاں یاد تھیں۔ ظلم و ستم اور غلامی کی کہانیاں۔ غریبی اور بھوک کی کہانیاں، بیگار اور جبر کی کہانیاں۔ لیکن اس کے باوجود اسے شالامار باغ سے محبت تھی۔ جیسے یہ ساری دھرتی سارے درخت اور پہاڑ اس کے اپنے ہوں۔ وہ سوچتا تھا۔ مغلوں نے اگرچہ ہمیں غلام بھی بنایا تو ہماری زندگی کے کئی سامان بھی مہیا کئے۔ اناج سستا کر دیا۔ روزگار کی کئی سبیلیں نکالیں۔ فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کی۔ وہ باغ میں کھڑے چار سو سال پرانے چناروں کو دیکھتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے ملک کی ساری تاریخ کا ورق ورق الٹ جاتا۔ جیسے جہانگیر بادشاہ اپنی خوبصورت ملکہ کے ہمراہ باغ میں ٹہل رہا ہے۔ فواروں کا پانی چاند کی دودھیا روشنی میں ہنس رہا ہے۔ اور بادشاہ دور کی پہاڑیوں کو دیکھ کر پوچھتا ہے "شہنشاہیت کس قدر گندی ہے ملکہ۔ جنت ارضی کے اس ٹکڑے میں بھی تمہارے بادشاہ کو سکون نہیں۔" ملکہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھلک اٹھتا ہے۔ جسے چھپانے کے لئے وہ دور کھڑے اُن لوگوں کی طرف دیکھتی ہے۔ جن کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں، آنکھیں جھکی ہوئی ہیں، روحیں جھکی ہوئی ہیں۔ اور بادشاہ جواب کا انتظار کئے بغیر کہہ اٹھتا ہے۔ "ہمیں رعایا کو خوشحال کرنا ہے۔ ورنہ ایسی جنت زیادہ دیر تک ہمارے تسلط میں نہیں رہ سکتی۔"

ملکہ بادشاہ کی طرف حیران نظروں سے دیکھتی ہے۔ بادشاہ کے ہونٹوں پر ایک بامعنی مسکراہٹ کھیلتی ہے اور وہ پھر کہتا ہے: "یہ جھکی جھکی گردنیں کسی وقت بھی ہمارے دبدبے سے ٹکرا سکتی ہیں۔ ہمیں جنت چاہیئے اور انھیں روٹی۔"

سکندر ملک چونک اٹھا، اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "یہ جنت نہیں جہنم ہے عالی جاہ۔ ہمیں روٹی چاہیئے لیکن اپنی جنت کے عوض نہیں" کمرے میں رفل کی چادروں پر جھکے ہوئے آدھ درجن سر اوپر اٹھے۔ اور چادروں پر آدھی کاڑھی ہوئی عشق پیچاں کی بیلیں اور بنفشہ کے پھول جیسے کانپنے لگے۔ سکندر ملک نے کہا: "یہ اکبر شاہ کا بیٹا تھا اپنی ملکہ سے کہتا تھا ہمیں جنت چاہیئے اور انھیں روٹی۔" اس کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ رفل کی پھیلی ہوئی چادر کا ایک کونا اس کے گھٹنوں سے کھسک گیا۔ جس کی کشیدہ کاری میں وہ اپنی روح نچوڑ کر سمو رہا تھا۔ کیونکہ پچھلے کئی مہینوں سے بمبئی میں بنفشہ کے پھولوں والی چادروں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ اور اس صنعت کے سوداگر انھیں پھولوں کے آرڈر دے رہے تھے۔

سکندر کو فوراً احساس ہوا کہ اس کی باتوں سے کمرے میں حیرت پھیل گئی ہے۔ اس نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا: "اپنا کام کرو۔ کبھی کبھی انسان خواب بھی دیکھتا ہے۔" شاگرد اپنی اپنی چادروں پر پھر جھک گئے۔ اس بار ایک ہلکا سا گیت فضا میں تیرنے لگا۔

سے بیلہ چھم یوان کتھہ یانہٕ ژٕتیس

تیلہ چھم یوان دیوانگی

اس گیت نے سکندر ملک کی روح کو گرما دیا۔ اس نے نئے جوش کے ساتھ کھسکی ہوئی چادر اپنے گھٹنوں پر کھینچ لی، اور سوئی سے اُدھڑے کاڑھے ہوئے پھول کو سنوارنے لگا۔ مگر اس کے باوجود اس کے ذہن پہ ایک بوجھ سا تھا۔ جنت اور جہنم کا بوجھ، شہنشاہیت اور روٹی کا بوجھ۔ وہ سوچنے لگا اگر یہ جنت ہے تو اتنی گرانی کیوں؟ اتنی بھوک اور عریانی کیوں؟ یہ بے اطمینانی اور مایوسی کیوں؟ سو روپے ماہوار کمانے کے باوجود بنیادی ضروریات تک پوری نہیں ہوتیں۔ اور سات دن کے بعد ہی سارا گھر منہ کھولے بکنے لگتا ہے، جھگڑے ہوتے ہیں۔ گالیاں لہراتی ہیں۔ برتن ٹوٹ جاتے ہیں اور میاں بیوی دنوں ایک دوسرے سے باتیں نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ جنت کیسی ہے۔ یہ تو جلتا ہوا جہنم ہے۔ جس میں لکڑی کے بدلے ہماری روحیں جلتی ہیں۔ ہمارے ارمان اور امنگیں جلتی ہیں۔ ہمارا حال اور مستقبل جلتا ہے۔ وہ بار بار سوچتا تھا کہ ایسے جہنم میں لوگ کیسے زندہ رہ سکیں گے۔ کاروبار کیسے چلے گا۔ بنفشہ کے پھول کب تک چادروں پر کاڑھے جائیں گے۔ جو اپنی رعنائی اور نزاکت کے باوجود اپنے خالقوں کی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتے۔ وہ فکر کے اسی نشیب و فراز میں جھکا رہا تھا کہ دروازے پر کارندے نے سلام کیا۔ سکندر ملک نے چادر میں سوئی چبھو دی اور کہا: "وعلیکم السلام۔"

کارندہ سکندر ملک کے برابر بیٹھ گیا۔ چادر پر کشیدہ پھولوں کو دیکھ کر بولا۔ "واللہ باتیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی جنگل سے توڑ کر لائے گئے ہیں۔" سکندر ملک نے سوکھی سی ہنسی ہنس کر کہا: "مگر یہ کب تک؟"

"جب تک کشمیر زندہ ہے۔" کارندے نے ہنس کر جواب دیا۔

"مگر کشمیر تو مر چکا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو اُستاد؟"

"بخدا سچ کہہ رہا ہوں کشمیر زندہ نہیں ہے مر چکا ہے۔ اور ہم سب اس کی لاشیں ہیں۔"

کارندہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ شاگردوں سے بولا: "تمہارا اُستاد بڑا رنگین مزاج ہے۔ جو بات کہتا ہے الٹی کہتا ہے۔"

"الٹی بات نہیں کہتا ہوں۔ گرانی نے سب کو مار ڈالا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی موت کا اعتبار نہیں آتا۔ حالانکہ تم مر چکے ہو۔"

"خدا ابھی ہم سے مایوس نہیں ہوا اُستاد۔ واللہ ہمیں زندہ رہنا ہے۔"

"اس گرانی میں مشکل ہے۔"

"آج بہت بڑا آرڈر لے آیا ہوں۔ سو چادروں کا ماہوار ——" کارندے نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ لیکن سکندر ملک پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے بے دلی سے پوچھا: "فائدہ؟"

"فائدہ یہ کہ اُجرت زیادہ ملے گی۔"

"اُجرت تو اپنی محنت کی ملے گی مگر پیٹ کا کیا ہوگا۔ اس کا بھی کچھ سوچا ہے۔ آج کے چاول چاول نہیں رہے چاندی کی گولیاں بن گئے جو نہ خریدے جا سکتے ہیں نہ نگلے جا سکتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک ہے اوستا۔ اور میں نے سنا ہے اس پر سوچا جا رہا ہے۔"

"سوچا جا رہا ہے!" سکندر ملک نے قہقہہ لگایا۔ "وہ کیا سوچیں گے۔ سوچتے وہ ہیں جن کے پیٹ خالی ہوتے ہیں۔ دماغ خالی ہوتے ہیں۔ سینے خالی ہوتے ہیں۔ پیٹھیں ننگی ہوتی ہیں۔"

سے جب مجھے تیری باتیں یاد آتی ہیں تب مجھ پر دیوانگی سی چھا جاتی ہے۔

کارندے سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑا۔ اور سکندر ملک نے پھر کہا: "باہر سے جو بھی آتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ یہ جنت ہے۔ مگر میں حیران ہوں کہ وہ جنت
سا ہے۔ سب اوپر اوپر سے دیکھ کر چلے جاتے ہیں مگر ہمارے اندر کوئی نہیں دیکھتا کہ یہ دھواں کیسا ہے اور کہاں سے آ رہا ہے۔"
کارندے نے مسکرا کر کہا: "قوموں پر ایک دور ایسا بھی آتا ہے اُوستا جب زندگی کی قدریں بدلتی ہیں اور سارا ملک نئی قدروں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔"
سکندر ملک کا چڑچڑاپن اُبھر گیا۔ اس نے چادر کو دور پھینکتے ہوئے کہا: "میں سلانچے نہیں جانتا۔ ہم سوئی کے مزدور ہیں۔ ہمیں آنکھوں کی روشنی کے لئے اچھی
اچاہیئے جو سستی ہو۔ ہمیں دھوپ اور سردی سے بچنے کے لئے کپڑا چاہیئے جنھیں ہم خرید سکیں۔ ہمیں ایسا پیسہ چاہیئے جس میں برکت ہو۔ ہمیں ایسا کام چاہیئے
ہماری مزدوریں پوری کر سکے۔"
اس کے بعد وہ تھرتھرانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں جلنے لگیں۔ سارے کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اور سکندر نے پھر شالامار باغ
طرف اشارہ کر کے پوچھا: "جنھیں اپنے بزرگوں سے ایسی دولت ورثے میں ملی ہو ان کا یہ انجام ہونا چاہیئے تھا؟ کہ مرنے لگیں اور کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔
سے بس کی بات ہوتی تو آج ہی کھال لے کر......" اس کے بعد وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ صرف اس کا منہ سفید جھاگ سے بھر گیا۔
کارندے نے موضوع سخن بدلتے ہوئے کہا: "آج ساٹھ چادروں کا بنڈل لایا ہوں۔ لالہ کہتا تھا جتنی جلد تیار ہو اتنا اچھا رہے گا۔ کیونکہ بازار
کوئی بھروسہ نہیں۔"
"جلد کیسے ہوگا......" سکندر ملک نے پوچھا: "جب انگلیوں میں سکت ہی نہ ہو۔"
"اسی لئے تو لالہ نے اُجرت بھی بڑھائی ہے۔" کارندے نے کہا۔
"اُجرت کے بڑھنے سے کیا ہوتا ہے۔ برکت ہی کہیں نہیں رہی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم پیسے نہیں کما رہے مٹی کما رہے ہیں۔"
"یہ کفر ہے اُوستا۔" کارندے نے جلد جلد کہا۔
"یہ کفر ہے؟ اور بھوکوں رہنا ایمان ہے؟ ننگے رہنا ایمان ہے۔ تیل اور چاول کے لئے تڑپنا ایمان ہے۔ لے جاؤ اپنا بنڈل اور بیوپاری سے
کہہ دو سکندر ملک مر گیا ہے۔"
شاگردوں کے چہروں پر نامعلوم قسم کا خوف اُبھر آیا۔ کارندہ خواہ مخواہ ہنسنے لگا۔ اس نے آہستہ سے نوٹوں کا ایک بنڈل جیب سے نکالا اور
ان کے آگے رکھ دیا۔
سکندر ملک نوٹوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اور شاگرد معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھتے رہے کہ غصے میں آکر وہ بنڈل کارندے کو
لوٹا نہ دے۔ مگر اس کی روح مر چکی تھی۔ اس کا غصہ مر چکا تھا۔ شاید وہ خود بھی مر چکا تھا۔

تین مہینے گذر گئے۔ کئی چیزوں کی قیمتیں جو آسمان تک پہنچ گئی تھیں۔ یکایک گر گئیں۔ اور سکندر ملک کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ چیزوں کی قیمتیں آسمان
تک کون پہنچاتا ہے اور پھر انھیں کون گراتا ہے۔ کیسے گراتا ہے۔ کیوں گراتا ہے۔ وہ اب بھی اپنی کھڑکی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا زمانہ ہے۔ چھپائی
ہوئی چیزیں باہر کیسے نکلیں۔ کس نے نکالیں۔ کیوں نکالیں۔ چاول کیونکر سستے ہو گئے؟ اس کا ذہن جیسے بے پناہ دھوئیں سے بھر گیا تھا جس میں سے اسے
باہر نکلنے کا راستہ ہی نہ ملتا تھا۔ سارا شہر، سارا محلہ، ساری بستی قیمتوں کے گرنے سے خوش ہو گئی۔ صرف ایک سکندر ملک تھا جو اب بھی بجھا بجھا رہتا تھا
وہ اب بھی گالیاں بکتا تھا۔ برتن توڑتا تھا۔ اور لوگ حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ آخر اس کی منزل کہاں ہے؟ کسی نے اسے بدخواہ کہا۔ کسی نے دیوانہ
کسی نے پاکھنڈی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کہتا رہا۔ اگر چند چیزوں کی قیمت گر گئی تو کیا ہوا سینکڑوں چیزیں ابھی آسمان پر ہیں۔ جب وہ بھی نیچے آئیں گی
تب موت زندگی میں بدل جائے گی۔ کیونکہ ابھی کپڑا مہنگا ہے۔ گوشت اور سبزیاں مہنگی ہیں۔ تیل چائے اور کھانڈ مہنگی ہے۔ محض چاول سے کیا ہوتا ہے۔
پیٹ کا جہنم بجھانے کے لئے سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور اگر اسی رفتار سے قیمتیں گرتی گئیں، تو لوگ کیسے زندہ رہیں گے، کاروبار کا کیا ہوگا، بنفشہ
کے پھول کہاں بکیں گے؟

مگر یہی فلسفہ بگھارنے پر اس کی لڑائیاں ہوتیں۔ جیسے کہ ایک شام بیوی نے جل بھن کر کہا: "تم ناشکرے ہو، شکر نہیں کرتے کہ تاریکی میں روشنی کی کرن پھوٹ گئی ہے۔"

سکندر ملک بگڑ گیا۔ اس نے کہا: "تو کیا جانے روشنی اور تاریکی۔ ذرا سی چنگاری دیکھی اور لگی ناچنے۔ اپنا پیٹ دیکھ، اپنی ٹانگیں دیکھ، اپنا گھر دیکھ جو سب کے سب خالی ہیں۔ ننگے ہیں، بے سروسامان ہیں۔"

"میرا دل کہتا ہے یہ چنگاری سورج بنے گی۔" بیوی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

سکندر ملک نے زہرخند کر کے کہا: "چنگاری کبھی سورج نہیں بنتی۔"

"کیوں نہیں؟" بیوی نے تکرار کے ساتھ کہا: "تم دیکھتے نہیں، ایک چنگاری سے کتنی روشنی پھیل گئی ہے جو برسوں مشرق سے ابھرنے والا سورج ہمیں نہ دے سکا۔ اب بھی ہم شکر نہیں کریں گے تو خدا ہمیں غارت کر دے گا۔"

سکندر ملک لاجواب ہو گیا۔ بیوی اسے ہرا کر چلی گئی۔ اور وہ دیر تک خاموش سڑک کے میلے اور ننگے سینے کو دیکھتا رہا جس پر جابجا زخم تھے گڑھے اور خراشیں تھیں، اور جو صرف اس وقت چیخ اٹھتے تھے جب اُن کے اوپر سے انھیں روندتی ہوئی کوئی فوجی گاڑی یا بیلوں سے بھری ہوئی بس گذر جاتی تھی۔ صرف اسی وقت کسی کو سڑک کی ناہمواری کا احساس ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ خود اسے مدتوں سے محسوس کرتا آ رہا تھا۔ مگر اس نے چپ سادھ لی تھی۔ لوگ اس پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔ اسے چڑچڑا کہتے تھے۔ دیوانہ کہتے تھے۔

معاً کوٹھی کے سامنے ایک تانگہ کھڑا ہو گیا۔ سکندر ملک کا بیوپاری خود آ گیا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی پرانی کرسی کمرے میں بچھا دی۔ بیوی کو پکارا بچوں کو پکارا۔ اور ننگے پاؤں بیوپاری کا استقبال کرنے کے لئے نیچے اترا۔

"کیا حال ہے استاد ــــ" بیوپاری نے پہلی منزل کی دہلیز میں آ کر پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ آپ اس وقت کیسے آ گئے ــ؟" سکندر ملک نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ "اوپر چلئے ــ"

دونوں کمرے میں پہنچے۔ ان کے پیچھے سکندر ملک کی بیوی اور دو بچے بھی تھے۔

"آپ اس وقت کیسے؟" سکندر نے دوبارہ سوال کیا۔

بیوپاری نے کھڑے کھڑے ہی کہا: "چیزوں کی قیمتیں گر گئی ہیں اور مانگ بھی کم ہو گئی ہے۔"

"وہ کیوں ــــ؟" سکندر ملک نے پوچھا۔

"یہ بزنس کا راز ہوتا ہے سکندر جو ــــ ایک چیز کی قیمت گر گئی تو سب پر مندہ چھا جاتا ہے۔ اب مال جب ہی بکے گا جب اسکا کوئی خاص گاہک۔"

سکندر ملک کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لیکن دروازے پر کھڑی اس کی بیوی نے کہا: "جب تک آپ جیسے شاہ کی مہربانی ہے ہمیں ڈر کس بات کا؟"

بیوپاری نے کہا: "یہ ٹھیک ہے بی بی۔ مگر بازار کو کیا کریں۔ یہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ قیمتوں کے گرنے سے صرف تمہیں ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی نقصان ہوا ہے۔ ہم جس شال کی بیس روپے اجرت دیتے تھے اب دس بھی نہیں دے سکیں گے۔"

سکندر ملک کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کے ذہن میں کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوا ــــ جیسے وہ پتھر کا بت بنا ہو۔ بیوپاری نے سیڑھیاں اترتے اترتے کہا: "کل کارندہ آ رہا ہے، وہ حساب صاف کرے گا۔ اگر آگے بھی نصف اجرت پر کام کرنا منظور ہو تو دکان سے بنڈل منگوا لینا۔"

"نصف اجرت پر ــ؟" سکندر ملک نے یہ لفظ بڑی مشکل سے کہہ ڈالے۔

بیوپاری سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے تانگے پر بیٹھ کر کہا: "مجبوری ہے کیا کریں۔" تانگہ واپس شہر کی طرف چلا گیا۔ اس کی بتیاں دیر تک ماحول کی تاریکی کا مقابلہ کرتی رہیں۔ سکندر ملک کو محسوس ہوا جیسے یہ بتیاں نہیں ہیں۔ بیوپاری کی دو آنکھیں اسے چڑا رہی ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو، سکندر ملک نصف اجرت پر کام نہیں کرے گا۔ دوسرے دن وہ شہر سے خرید کر رفل کی چند چادریں لے آیا۔ اور ان پر اپنی نگرانی میں کام کرانے لگا۔ عشق پیچاں کی بیلوں کے بدلے نرگس اور بنفشہ کے پھول اور گلاب کی کلیاں کاڑھی جانے لگیں۔ سب کے رنگ جدا جدا تھے اور ایسے نظر آتے تھے جیسے سرسبز زمین پر قرینے سے

رنگا رنگ پھول اُگ آتے ہیں۔ اگر کشیدہ کاری میں کسی شاگرد سے ایک آدھ دھاگہ غلط طریقے سے اِدھر اُدھر دکھائی دیتا تو وہ سخت برہم ہو جاتا۔ بعض موقعوں پر لاٹھی اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ صرف سوئی کی صنعت کاری نہیں۔ انسان کی روح کی کہانیاں ہیں۔ اس کی تمنائیں اور امیدیں ہیں۔ اس کے سنہرے خواب سے ہوئے ہیں۔ دل کا ایک ایک قطرہ سوئیوں سے نکال کر ان پر نچھاور کیا گیا ہے۔

پندرہ دن کے بعد شال تیار ہو گئے۔ وہ بڑے اہتمام سے سفید چادر میں لپیٹ کر انھیں شہر لے گیا۔ سب سے پہلے اس کی ضرورت اسے اپنے بیوپاری کے پاس ہی لے گئی جو چادروں پہ کئے گئے کام کی نزاکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"استاد، تمہارا یہ فن آج تک کہاں چھپا ہوا تھا۔" اس نے پوچھا۔

"گرانی کے نیچے دب گیا تھا لالہ ـــ" سکندر ملک نے جواب دیا۔

"لیکن اب غلط موقع پر ابھر آیا ہے" اس نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ بازار گر گیا ہے۔"

سکندر ملک نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے بازار کو دیکھا۔ وہ جیسے بیس سال پہلے تھا۔ ویسا ہی اس وقت بھی تھا۔

"ایسے کیا بازار کو دیکھ رہے ہو۔ ہماری کتابوں میں اسے دیکھو۔ روز گرتا جا رہا ہے۔" بیوپاری نے ہنس کر کہا۔

"کتابوں میں بازار ـــ؟" سکندر ملک نے پوچھا۔ "کیا بازار آپ کی کتابوں میں ہوتا ہے؟"

"ان جان بننے کی کوشش نہ کرو سکندر جو ـــ ہمارے ہی بازار میں تمہارے بال پک کر سفید ہو گئے ہیں ـــ" بیوپاری نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"بازار مان لیا گر گیا ہے مگر محنت کا معیار تو نہیں گرا۔ وہ بلکہ اونچا ہو گیا ہے۔" سکندر ملک نے بڑی جرأت سے کہا۔

"محنت کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ اس کا معیار ہمیشہ بازار کا اتار چڑھاؤ ہے۔ آج سے دو مہینے پہلے تمہاری محنت کی جو اجرت تھی۔ آج اگر اس کا نصف بھی تمہیں ملے گا۔ جب بھی غنیمت ہے۔" بیوپاری نے کہا۔

"نصف ـــ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" سکندر ملک نے برہم ہو کر پوچھا۔ "ہم نے پورے پندرہ دن اس پر اپنا پسینہ بہایا ہے اور اس امید پر کہ ہم اس کی پوری اجرت پائیں گے۔"

"تمہارا کہنا ٹھیک ہے۔ مگر ہم بھی کیا کریں۔ ہم سے کوئی خریدتا نہیں ویسے تمہاری مرضی ہے تو کہیں اور اپنا مال دکھاؤ۔ ہم میں تمہاری قیمت پر خریدنے کی ہمت نہیں۔"

سکندر ملک نے بقچہ اٹھایا اور چل دیا۔ جاتے جاتے اس نے کہا: "میرے ضمیر نے کسی اور کے پاس جانا گوارا نہیں کیا تھا۔ ورنہ پائے گدا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست۔"

شام تک وہ ایک دکان سے دوسری دکان تک گھومتا رہا۔ سب نے اس کے کام کی تعریف کی۔ مگر جب پیسوں کی بات چلی تو وہی نصف اجرت۔ اس کے اپنے اندازے کے مطابق یہ تین سو روپے کا کام تھا۔ مگر ڈیڑھ سو سے زیادہ کوئی دینے پر آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔

اندھیرا ہونے کے بعد جب وہ گھر کی طرف اپنا بقچہ لئے لوٹنے لگا۔ تو اسے محسوس ہوا جیسے سارا ملک تنگ ہو گیا ہے۔ اور اس کی ٹانگوں میں چلنے کی سکت نہیں ہے۔ وہ ساری رات اپنی کھڑکی پر بیٹھا سوچتا رہا۔ غصے میں جھنکتا رہا۔ دھوئیں سے گھٹتا رہا۔ وہ اس تجارت کا راز جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ جان سکا۔ صبح کی روشنی میں اس کے سامنے کھلی چادروں پر کاڑھے ہوئے پھول اور کلیاں اسے ایسے دکھائی دیں جیسے سب روز رہی ہوں۔ جیسے کھلنے سے پہلے ہی انھیں مسل کر رکھ دیا گیا ہو۔ جیسے ان سب کو ذبح کیا گیا ہو۔

○

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر فرماویں۔ ـ منیجر

تاجور سامری

انویٹیشن

تینوں شاعر مسکراتے ہوئے چہرے لئے "آج کی آواز" کے دفتر سے نکلے۔ اور جلدی جلدی سڑک پر آگئے تاکہ سول لائنز جانے والی بس پکڑ لیں۔ دفتر کی گھڑی پونے چار بجا رہی تھی، اور انھیں چار بجے ایک پریس کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ مگر سڑک کے چوک پر آئے تو پتہ چلا کہ ابھی ساڑھے تین سے بھی کم کا وقت ہے۔ "پون گھنٹہ پہلے پہنچنا تو نری حماقت ہے۔" لیم شیم قد آور شاعر نے چارمینار سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"جلدی تو تمہیں نے مچائی تھی۔ ورنہ میں اتنے میں تو سہرا بے "کا جھنجھٹ چکا دیتا......" دوسرے درمیانے قد کے شاعر نے اپنی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں کی مسکراہٹ سے باقی فقرہ پورا کرنے کی کوشش کی ـــــ "ادھر لا! ـــ ادھر ہے پیکٹ میں؟ـــ"

جواب میں قد آور شاعر دھوئیں کے مرغولوں میں شرارت سے مسکرا دیا۔ اور اس کی آنکھیں مطمئن انداز میں کچھ مندی گئیں۔

سالے......؟ یہ بات؟" درمیانے قد کے شاعر نے بھی گویا اپنی پتلون کی جیب سے "برہم استر" نکالا ـــ "دیکھا؟" یہ ایک سگریٹ کا پیکٹ تھا۔

"ہاں جی...... یہ پوری چھپے کیپسٹن!...... قد آور نے اس سے سگریٹ جھپٹ لیا ـــــ اور "منہ کا" لمبا سا کش لگا کر پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔

"یار یہی ایک تھا ـــــ اچھا یاری یاری سہی"۔ درمیانے قد کا شاعر شکست خوردہ انداز میں گڑگڑایا۔

"اب لیٹ گئے ہو ـــ سالے ـــ ہم بھی تو یہی پیتے تھے کبھی۔"

دوسرا شاعر پھر گڑگڑایا ـــ "آدھا آدھا ـــــ دی گریٹ!"

"آگئے نا اپنے سچائی پن پر! خیر یہی سہی ـــ لو ـــ عیش کرو ـــ سالے..... ہمارے......" یہ کہہ کر لیم شیم نے اُسے باقی سگریٹ دیدیا۔

تیسرا ٹھگنا شاعر مسکراتا ہوا اپنے ساتھیوں کا یہ ڈراما دیکھتا رہا۔ وہ سگریٹ وغیرہ سے بے نیاز تھا۔ مگر ان کی ہر محفل میں ضرور شریک ہوتا تھا۔ آج بھی دعوت تو پہلے دو کو تھی مگر انھوں نے اسے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ یوں بھی ان دونوں نے رحم کھا کر اسے اپنے معیار پر قبول کر لیا تھا۔

لیم شیم قد آور تو خیر کھاتے پیتے گھر سے تھا اور ادب میں بھی اس کا مقام تھا۔ اور اوپر کی سوسائٹی میں رہنے کے سبب اس کا معیار زندگی خاصا بلند تھا۔ اس کی عام عادتیں بھی اوپر کے طبقے کی سی تھیں۔ لیکن طبیعت میں جو فطری نرمی اور سادہ دلی تھی وہ اسے سب کے ہمسطح کر دیتی تھی۔ لیکن درمیانے قد کے شاعر کی مالی، اور ادبی حیثیت دونو بنیادی طور پر مستعار تھیں اور وہ اسے اپنی ذہانت سے جوں توں کر کے اپنے ساتھ چپکائے ہوئے تھا۔ ٹھگنے قد کا شاعر تو خیر تھا ہی پرولتاری ـــــ یہ دونوں سگریٹ پیتے ہوئے سڑک پر گھور رہے تھے اور تیسرا آسمان پر تیزی سے دوڑتے ہوئے ایک سفید بادل کے ٹکڑے کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک درمیانے قد کا شاعر کھنکارا ـــــ "سائیں! ـــ کیوں کیا رائے ہے؟"

"کوئی خاص بُری نہیں ـــــ مگر یہ تو بھاگتا جونکا ہے ـــــ چھوڑو ـــــ کیوں جی کیا بجا ہے؟ لیم شیم نے ایک راہ چلتے بابو سے پوچھا۔

"چار بجنے میں چودہ منٹ......" بابو یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ٹھگنا شاعر بولا "میرا خیال ہے پیدل مارچ کی جائے ـــــ بس تو آنے سے رہی۔ کیا رائے ہے تمہاری؟" درمیانے قد کے شاعر نے سگریٹ کے ٹکڑے کو اپنی چپل تلے مسلتے ہوئے سوال کیا۔

"مری رائے میں پرولتاری لیڈر شپ پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔ چار بجے تو کانفرنس شروع بھی ہو جائے گی"

تینوں چل پڑے، جب وہ ماتا کے چوک میں پہنچے تو لیم شیم اچانک رک گیا۔ اور اس کے دونو شاعر ساتھی سوالیہ نشان بن گئے۔

درمیانے قد والے نے زبان کھولی: "اب کیا سوچ رہے ہو ——؟"

"میرا خیال ہے ہم فضول ہی جا رہے ہیں —— " لحیم شحیم نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اتنا بڑا جلوس لے کر پریس کانفرنس میں جانا تو.......لحیم شحیم کہتے کہتے رک گیا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ جائیے.... ابھی کیا بگڑا ہے۔ میں جاتا ہوں آپ دونوں جائیے۔" ٹھگنے شاعر نے پلٹ کر کہا۔

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے...... ہم سب کو چلنا ہوگا۔ سالے...... بزدلی پر اتر آئے! —— پریس کانفرنس میں شمولیت کی تعداد تو مقرر نہیں ہوتی...... آخر ہم "آج کی آواز" کی نمائندگی کر رہے ہیں۔"

"ہاں ہاں یار بات تو ٹھیک ہے......" لحیم شحیم یہ کہہ کر پھر چل پڑا۔ چلتے چلتے لحیم شحیم بولا: "اخبار کی نمائندگی کی بات ہم سب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ مطلب تو ہے کچھ چونچ بھری ہو گی۔"

"ہاں ہاں اور کیا! آج کی چائے کے پیسے ہی بچیں گے۔" درمیانے قد کے شاعر نے ذرا بڑھاوا دیا۔

"ارے صرف چائے کے پیسے نہیں، سگریٹ بھی اچھے ہوں گے۔ اور کھانے کو بھی خاصا۔ پروفیسر پونم کہتا تھا۔ سالا ہے تو سنکی مگر خاطر تواضع خوب کرتا ہے اخبار نویسوں کی۔" یہ کہہ کر لحیم شحیم پھر رک گیا۔

"اب کیوں رک گئے؟" ٹھگنا شاعر بول اٹھا۔

"میرا خیال ہے چار بج چکے ہیں —— وہ سامنے کلاک ہے دیکھو تو ——"

درمیانے قد کا شاعر پان والے کی دکان پر لگی کلاک پر وقت دیکھ کر آیا۔ اس کا چہرہ کچھ اترا سا تھا۔

"کیا بات ہے؟" ٹھگنا شاعر چلایا۔

"میرا خیال ہے لوٹ ہی چلیں، چار واقعی بج چکے ہیں۔ اور جگہ کا بھی علم نہیں ہیں ——"

ٹھگنے شاعر نے کہا: "جگہ تو میں جانتا ہوں اور وہ دور بھی نہیں۔ لیکن چلنا ہمیں ضرور چاہیے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ اگر ہم نہ گئے تو "آج کی آواز" کی نمائندگی کون کرے گا۔ دوسرے یہ کہ ایسی پریس کانفرنس ضروری نہیں پورے چار بجے شروع ہو جائے۔ لوگ باگ تو دیر ہی سے پہنچتے ہیں۔ اور پھر "اجالے" کے دبیر صاحب تو آئیں گے تین میل سے پیدل۔"

"اور تیسری وجہ؟" درمیانے قد کے شاعر نے طنزاً سوال کیا۔

"تیسری وجہ تو صاف ظاہر ہے۔ اتنی ساری چیزیں کھانے کی دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا میری رائے میں تو عقلمندی نہیں۔" ٹھگنا شاعر اپنی بات ختم کرتے ان دونوں پر اس کا ردِ عمل دیکھنے لگا۔

لحیم شحیم بولا —— "میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیوں چھوڑا جائے۔"

"مگر یہ نہ ہو جو کھلائے گا وہ خشک تقریریں بھی پلائے گا۔" درمیانے قد کے شاعر نے ایک اور خدشے کی چٹان لڑھکائی۔

"اس کا علاج یہی ہے کہ کان لپیٹے اپنا کام کئے جاؤ۔" ٹھگنے قد کے شاعر نے یہ کہہ کر آگے قدم بڑھایا اور وہ دونوں بھی اس کے پیچھے ہو لئے۔

اچانک لحیم شحیم پھر رکا —— "یار میرا خیال ہے ہم حماقت کر رہے ہیں۔"

"کیوں؟" درمیانے قد کا شاعر رکے بغیر پلٹا۔

"سالے۔ ذرا کپڑے تو اچھے پہنے ہوتے...... میری تو چپل بھی گھسٹ رہی ہے......" لحیم شحیم نے اپنے پاؤں پر نادم سی نگاہ دوڑائی —— "سالی ترقی پسندی لے دے کر بیٹھ گئی......"

"اب چلو بھی کیا نخرے کرتے ہو۔" ٹھگنے شاعر اور درمیانے قد کے شاعر نے اسے دھکیلا اور اب وہ سب چل پڑے۔

تھوڑی دیر میں اس کوٹھی نما مکان کے قریب آئے تو معلوم ہوا کہ پریس کانفرنس والے کمرے کا راستہ صدر دروازے کے بجائے گلی میں سے مقرر ہے۔ چنانچہ یہ تینوں گلی میں سے ہو کر اس کمرے میں پہنچے۔ پریس کانفرنس کے لئے وہاں صرف چار آدمی بیٹھے تھے۔ تینوں صوفے خالی تھے۔ ایک اخبار نویس صاحب جو ان تینوں کے جاننے والے تھے اکیلے ایک صوفے پر بیٹھے تھے۔ نیم شیم اس کے بغل میں جا بیٹھا۔ دوسرے دونوں نے ایک سیٹ قبضے میں کر لی۔ ان تینوں کی آنکھیں جس چیز کی تلاش کر رہی تھیں وہ سارے کمرے میں کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آخر درمیانے کے ایک آدمی نے جسے یہ سب اخبار نویس کچھ تھے حرکت میں آیا۔ "میرا خیال ہے اب کوئی نہیں آئے گا۔ کام شروع کر دیا جائے۔"

سب سے پہلے موجودہ اخبار نویس۔ نے نہایت اطمینان سے سر ہلا دیا۔ یہ تینوں ساتھی اس انتظار میں تھے کہ اب کھانے پینے کا سامان آئے گا مگر صاحب خانہ نے فوراً ایک کاغذوں کا پلندہ نکالا۔ اور گویا ہوئے۔

"میں ابھی رپورٹ پڑھے دیتا ہوں۔ آپ بعد میں سوال کر لیجئے گا۔" اور انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اتنے میں نیم شیم نے سرگوشی میں اپنے ساتھی سے پوچھا۔ "یہاں پیشاب کے لئے کوئی جگہ ہے ——"

جواب ملا۔ "گلی میں ——"

نیم شیم اٹھا تو درمیانے قد کے شاعر نے کہا۔ "ارے پیشاب تو مجھے بھی آیا ہے۔" اور وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلا گیا۔

آخر ٹھگنا شاعر بھی معاملے کو بھانپ کر باہر آ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی گلی کی نکڑ پر کھڑے اس کے منتظر تھے۔

"سالے —— بھوکے ننگے —— پریس کانفرنس کرنے چلے ہیں۔" درمیانے قد کے شاعر نے اپنا زہر انڈیل دیا۔ نیم شیم اور ٹھگنا شاعر خاموشی سے آگے چل پڑے۔

انجم تمنائی

سائے

میری آنکھ کو لگے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ بے شمار چمگادڑیں میرے کمرے میں زور زور سے اڑ رہی ہیں اور کوئی ذبح کیا ہوا پرندہ پوری قوت کے ساتھ اپنے پروں کو پٹک پٹک کر اپنی جان دے رہا ہے۔ میں حیران ہو گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کہاں سے اتنی چمگادڑیں میرے کمرے میں آ گئیں؟ اور کیسے یہ کمرہ ذبح بن گیا! یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے ۔۔۔۔ بتی جل اٹھی میری نگاہیں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی میری آنکھیں جس چیز کی متلاشی تھیں وہ وہاں موجود نہ تھی۔ ناکامی بجائے حیرانی کو دور کرنے کے اس کو اور زیادہ بڑھانے لگی۔ کمرے کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ قرینے سے دھری ہوئی تھی۔ نہ میرا کمرہ چمگادڑوں کا مرکز تھا۔ اور نہ ہی مذبح ۔ پھر دور دور سے پھڑکنے کی آواز آنے لگی۔ کان آواز کی طرف گھومنے لگے۔ آنکھوں میں حیرانی ناچنے لگی۔ نہ ہی کمرے میں کچھ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی پتہ چل رہا تھا کہ آواز کیسے اور کس طرف سے آ رہی ہے۔ یکایک میری نگاہیں تھم گئیں اور نظر ایک مرکز پر سمٹ کر رہ گئی۔ ۔۔ پریشانی دور ہونے لگی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پیشانی پر ٹھنڈک معلوم ہونے لگی۔ میں خود اپنی سراسیمگی پر حیران تھی۔ ہوا اپنی پوری قوت کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ دریچے پر پڑے ہوئے ریشمی پردے ہوا کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے اور زبان حال سے اپنی ناکامی پر چلا چلا کر مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ہم مجبور ہیں۔ ہم اس کو روکنے سے قاصر ہیں۔ اٹھو! جلدی اٹھو اور اس کو روکو!

میں مسکراتے ہوئے دریچے کی طرف بڑھی تاکہ ہوا کو اس کی بے جا مداخلت کی سزا دوں۔ جونہی چٹخنی لگانے کے لئے آگے بڑھی نگاہیں سڑک پہ جا پہنچیں۔ کمرے کے باہر چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا سکوت ہی سکوت تھا۔ رات کی سیاہی اپنے پر پھیلائے ہوئے سارے عالم پر چھائی ہوئی تھی۔ دور کہیں سے کبھی کبھی کسی کتے کی آواز سیاہی کو چیرتے ہوئے ساری فضا پر چھا جاتی تھی۔ پاس کے پرانے برگد کے درخت پر بیٹھا ہوا بڈھا فلسفی کبھی کبھی اپنی کامیابی پر چیخ اٹھتا اور بیہودہ خاموشی کے ساتھ نہ سلجھنے والی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں لگ جاتا شاید اسے اپنے ہی دلائل کمزور نظر آنے لگتے تھے۔ سامنے کے مکان کے کھلے برآمدے میں سسکتی ہوئی چراغ کی روشنی اپنی جان توڑ رہی تھی۔ روشنی سے کچھ دور ایک عجیب و غریب سایہ حرکت کرتا ہوا دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ کبھی دو ہاتھ نظر آتے تو کبھی چار ہو جاتے۔ ابھی ایک بڑا سا سر نظر آ رہا تھا کہ یکایک وہ دو ہو گیا۔ ابھی وہ دو سر نظر آ رہے تھے کہ ایکدم ایک سر ہو گیا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پیشانی پر نمی سی محسوس ہونے لگی۔ سانس رک رک کر چلنے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ سایہ حرکت کرنے لگا۔ اور روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اس کو پہلے کی بہ نسبت اب اچھی طرح دیکھنے لگی۔ وہ ایک عجیب و غریب شکل کا سایہ نہ تھا۔ بلکہ دو انسانی دھندلے دھندلے سائے تھے جو نظر آنے لگے۔ سسکتی ہوئی روشنی ختم ہو گئی اور وہ سائے بھی نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں بستر پر پڑے سوچنے لگی۔ یکایک میرے سارے بدن میں سرسری دوڑ گئی اور مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ کیا یہ شیطان تھا؟ شیطان ۔۔۔۔ بھوت ۔۔۔۔۔ یا بلا ۔۔۔۔۔ ہاں ضرور یہ کوئی بلا ہو گی ۔۔۔۔۔ جو مجھے ڈرانے کے لئے مختلف شکلوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ نہیں یہ شیطان یا بھوت نہیں ۔۔۔۔۔۔ وہ تو انسانی سائے تھے۔ انسان کا خیال آتے ہی میرے دل کو ڈھارس ہوئی اگر انسان ہوتا تو دو سر ۔۔۔۔ چار ہاتھ ۔۔۔۔۔ یہ کیسے؟ اور آدھی رات گئے وہ کیا کر رہے تھے ۔۔۔۔۔۔ ہو نہ ہو یہ ضرور شیطان ہی تھا ۔۔۔ شیطان ۔۔۔۔ ابھی میرا یہ نظریہ پختہ نہ ہوا تھا کہ پھر یکایک یہ سب دلائل یکے بعد دیگرے میری ہی نظروں میں کمزور نظر آنے لگے۔ اس مکان میں تو انسان بستے ہیں۔ اگر شیطان ہوتا تو وہ وہاں کیسے رہتے ۔۔۔۔۔ کیا وہ ان کو نظر نہیں آتا؟ تو پھر مجھے کیوں نظر آنے لگا؟ نہ جانے اس ادھیڑ بن میں میری آنکھ کب لگ گئی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو سورج چڑھ چکا تھا۔ پھر رات کا سماں میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ دل نے فیصلہ کیا کہ کسی طرح بھی اس معمے کو ضرور حل کیا جائے۔

اس سلسلے میں میں نے سب سے پہلے اس مکان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ میری نظروں کے آگے ایک سیاہ کھپریلوں کی میلی موٹی چھت تھی۔ اصطبل نما آٹھ دس چھوٹے چھوٹے مکانوں کی قطار چلی گئی تھی۔ پورے مکانوں کی کھپریلوں سے آہستہ آہستہ دھوئیں کے بگولے نکل رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے جلے ہوئے ملبے میں سے آہستہ آہستہ دھواں نکلتا ہے۔ اتنے میں روتا ہوا ایک کالک بھرا بچہ برآمدے میں دوڑتا ہوا آیا اور ساتھ ہی ساتھ دست پناہ کی آواز برآمدے کی فضا میں گونجنے لگی۔ دست پناہ کی مرثیہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کسی عورت نے چلا کر کہا "حرام زادے آگ میں مرنے کے لئے آ رہا ہے"! بے ساختہ میرے منہ سے "آگ!" "آگ" کی آواز نکل گئی۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ ابھی کوئی اس مکان سے نکلے گا۔ اور پھر وہ زور زور سے میرے اس جملے کو دہرانے لگے گا۔ اور پھر سرخ سرخ آگ کے شعلے بھڑکنے لگیں گے۔ چھت چٹ چٹا اٹھے گی۔ مٹی کے جلنے کی سوندھی سوندھی بو میرے کمرے میں پھیل جائے گی۔ میں مکان کی طرف نگاہیں لگائے ہوئے تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ اب شور اٹھے گا! اب اٹھے گا۔ مگر نہ ہی شعلے بھڑکے اور نہ ہی کوئی چلاتا ہوا مکان سے باہر نکلا۔ مکان کے صحن کے قریب دس بارہ بچے میلے کچیلے کپڑے پہنے جن کے چہروں اور کپڑوں پر مٹی اٹی ہوئی تھی کھیل رہے تھے۔ وہ مٹی میں کچھ اس طرح رینگ رہے تھے اور بالکل ایسے ہی معلوم ہو رہے تھے کہ زمین کے سینے پر ایک بہت بڑا ناسور پڑ گیا ہے اور جیسے اس میں بے شمار کیڑے رینگ رہے ہوں۔ وہ بچے مٹی کے لئے بنائے گئے تھے اور مٹی ان کے لئے۔ کچی سڑک کے درمیان بنی ہوئی نالیوں میں زندگی تھی۔ غلاظت۔ کوڑا کرکٹ اور ردی کاغذ کے پرزے ان نالیوں میں جان ڈال رہے تھے۔ کچھ بچے اس زندگی سے کھیل رہے تھے۔ بچے ان دونوں نالیوں سے اس طرح چمٹے ہوئے تھے اور وہ دور سے بالکل ایسے ہی دکھائی دے رہے تھے جیسے کہ وہ اپنی ماں کے سینے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ سڑک کے سینے پر بنی ہوئی دو نالیاں انھیں تسکین دے رہی تھیں۔ کھیلتے کھیلتے نہ معلوم ان بچوں کو کس بات کا خیال آ جاتا تھا کہ یکدم وہ اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر گھر میں داخل ہو جاتے اور آن واحد میں دوڑ کر پھر جونہی وہ اپنی جگہ واپس لوٹتے تو ان نالیوں کا آغوش ان کے لئے کھلا پاتے۔

دوسری رات بھی اسی طرح کا سایہ نظر آیا مگر آج سسکتی ہوئی روشنی کا زاویہ اگلی رات کی بہ نسبت بالکل مختلف سمت پر تھا۔ دن بیتتے گئے۔ راتیں آتی گئیں۔ مگر سسکتی ہوئی روشنی کا زاویہ ہر رات اگلی رات سے مختلف سمت پر ہوتا تھا۔ اور سایہ ہمیشہ روشنی کی سمت پہنچ کر غائب ہو جایا کرتا۔ اور روشنی بھی سائے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی۔ ایک رات ابھی سائے کو غائب ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ یکایک دروازے کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ یکدم میرے قدم دریچے کی طرف بڑھنے لگے۔ اسی سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان تیزی کے ساتھ اس مکان سے نکل کر شہر کی طرف چلا گیا۔ ابھی اس کو گئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز قریب سے قریب تر آنے لگی اور ایک تانگہ اسی مکان کے قریب آکر رک گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کچھ سامان ہاتھ میں سنبھالے اسی نوجوان کے ساتھ تانگے سے اتری اور تیزی کے ساتھ مکان میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد یکایک کسی عورت کے چیخنے کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ آواز میں ابھی ارتعاش باقی تھا کہ کسی چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی ادھیڑ عمر کی عورت اور نوجوان مکان سے باہر نکلے۔ مرد کی پیشانی پر اب بجائے اضطراب اور پریشانی کے خوشی ناچ رہی تھی۔ عورت کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ تانگے کی طرف بڑھنے لگے۔ عورت تانگے پر سوار ہو گئی۔ نوجوان کا ہاتھ اپنے جیب تک پہنچا اور ہاتھ جب باہر نکلا تو چند سفید سفید سکے اس کے ہاتھ میں چمک رہے تھے اور وہ سکے بھی عورت کی ہتھیلی پر رقص کرنے لگے۔ نوجوان مسکراتا ہوا مکان کو واپس لوٹ گیا اور تانگہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

ہر مہینے یا دو مہینے میں ضرور تانگہ اسی مکان کے آگے آکر رکتا۔ کوئی بابو ہی قسم کا نوجوان یا بوڑھا چپراسی یا فیکٹری کا ملازم یا کوئی دوسرا خدا کا بندہ ضرور اسی تیزی کے ساتھ اس بڑھیا کو لئے اسی مکان میں داخل ہوتا اور واپسی پر بڑھیا کے ہاتھ میں چند چاندی کے سکے کھن کھناتے رہتے۔ کسی کے چہرے پر خوشی رہتی اور کسی کے چہرے پر آئی ہوئی خوشی یکدم غائب ہو جاتی اور غم کا پرتو اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ سایہ فگن ہونے لگتا۔ نئی نئی صورتیں اور مختلف خدوخال کے بچے پہلے سے زیادہ نالیوں کی آغوش میں کھیلتے ہوئے نظر آنے لگے۔

ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اور شاہد اس محلے میں آکر بس گئے تھے۔ ہم کو آئے ہوئے تقریباً دو سال کا عرصہ ہونے کو آ گیا تھا۔ نہ ہی اس مدت میں مجھ سے سائے کا معما حل ہو سکا اور نہ ہی اس بڑھیا کے متعلق کچھ معلومات فراہم ہو سکی۔ ہم اس شہر میں بالکل نئے تھے نہ میرے کوئی جاننے

بچپا نہ تھے اور نہ کوئی رشتہ دار۔ بس میں تھی اور شاہد تھے۔ شاہد سرِ شام ہی کام سے واپس لوٹ آتے۔ ہم دونوں کا وقت زیادہ تر شطرنج اور دوسرے گھریلو کھیلوں میں گذر جاتا۔ نہ ہی ہم کو دنیا کی خبر تھی، اور نہ ہی دنیا کو ہماری۔ چند دنوں سے مجھے بھوک برابر نہیں لگتی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ طبیعت میں کچھ گرانی اور سستی سی محسوس ہونے لگی۔ ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ مجھ سے کچھ کھایا ہی نہ گیا۔

"دیکھو روحی! یہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ اگر تمہیں اپنی صحت کا خیال نہیں تو نہ سہی مگر مجھے تو تمہارا خیال رکھنا ہے۔ کئی دفعہ تم سے ڈاکٹر کے ہاں چلنے کے لئے کہہ چکا ہوں لیکن تم اس پر کان نہیں دھرتی ہو" شاہد نے بگڑتے ہوئے کہا۔

"میں تو اچھی ہوں مجھے کیا ہو گیا ہے جو ڈاکٹر کے ہاں جاؤں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! تم تو بالکل اچھی ہو۔ اسی لئے تو تم نے آج معمول سے زیادہ کھانا کھایا اور مجھے بھوکا اٹھنا پڑا" شاہد نے طنزاً کہا۔

"اچھا تو یہ بات ہے آج کچھ بھوک نہیں تھی اس لئے نہ کھا سکی"

"ہر روز تم یہی کہا کرتی ہو۔ آخر کچھ حد بھی ہے۔ آئینے میں شکل تو دیکھو کل کچھ بھی ہو میں تمہیں ضرور ڈاکٹر کے ہاں لے جاؤں گا۔ میری ہر بات تم مذاق میں ٹال دیا کرتی ہو۔ آخر مذاق بھی مذاق کی حد تک اچھا لگتا ہے" جھنجھلاتے ہوئے شاہد نے کہا۔

"ایک نہیں بلکہ دو مریضوں کے لئے دوائی لانی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیں! یہ کیا کہا تم نے دوسرا مریض کہاں سے پیدا ہو گیا" شاہد نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا! جناب کو دوسرے مریض کا پتہ ہی نہیں ہے۔ ہہ ہہ۔ ہہ ہہ۔"

"تم یہ کیا پہیلی بجھا رہی ہو۔ کچھ صاف صاف تو کہو"

"وہ تم ہو! اپنی فکر تو نہیں کرتے لگے دوسروں کی فکر کرنے۔ قاضی جی کیوں دبلے شہر کے اندیشے سے۔ چلو میں تمہیں ڈاکٹر کو دکھاؤں گی" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"اچھا.......... بشرطیکہ کہیں کی.......... شاہد نے میری ٹھوڑی ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

یکدم میرا سر جھک گیا۔ اور سارے جسم میں برقی لہر دوڑنے لگی نس نس میں تازگی اور توانائی عود کر آئی۔ خوشی کے دھارے دل میں اُبلنے لگے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ دل سینے سے نکل کر ہی چین لے گا۔ ساری کائنات جھومتی ہوئی نظر آنے لگی۔ فضا کی لہروں پر خوشی ہی خوشی ناچنے لگی۔ اور ہوا کا ہر جھونکا خوشی کے گیت گاتا ہوا نظر آنے لگا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کسی نے مجھے یکدم زمین کی پستی سے اٹھا کر ثریا پر بٹھا دیا ہے اور تارے مجھ پر نچھاور ہو رہے ہیں، اور میں قوس قزح کی لہروں پر کھیل رہی ہوں۔ اور مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہے۔ مگر شاہد کی ایک مسکراہٹ کے آگے مجھے ہفت اقلیم کی دولت بھی ہیچ نظر آنے لگی۔

"روحی! میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم میری ہو اور میں تمہارا۔ اور میں تمہیں اپنی کہہ سکتا ہوں اور جب کبھی میں یہ سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر تم میری نہ ہوتیں تو نہ معلوم میری زندگی کتنی نامکمل رہتی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم میری ہو۔ میری۔ اگر ایک طرف ساری کائنات کی دولت ہوتی اور دوسری طرف تم۔ تو تمہیں معلوم ہے کہ میں کس چیز کو پسند کرتا" جھومتے ہوئے شاہد نے کہا۔

"دولت کو"

"نہیں روحی! کبھی نہیں۔ میں اپنی روح کو پسند کرتا، تم کو روحی صرف تم کو! دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کر سکتی تھی"

"تم لگے خوشامد کرنے۔ خیر جانے بھی دو۔ نہ جانے یہ شاعری کیوں ہونے لگی۔ کچھ کل سے نئے بوجھ اٹھا رکھو۔ آج ہی سب تعریفیں ختم نہ کر دو۔ میرے سرکار میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔ میں اسی میں خوش ہوں کہ تم میرے ہو اور میں تمہاری" میں نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"میری روحی! تم کتنی اچھی ہو" انھوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔

"بس کیجئے! کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سر آپ کے قدموں پہ جھکنے کے بجائے غرور سے اونچا ہو جائے"

دوسرے دن وہ تج تج مجھے ڈاکٹرنی کے ہاں لے گئے۔ نہ معلوم ان میں اور ڈاکٹرنی میں کیا کیا باتیں ہوئیں، واپسی میں ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور ان کے چہرے پر تبسم رقص کر رہا تھا۔ اب وہ میرا پہلے سے زیادہ خیال کرنے لگے۔ خیال کیا کرنے لگے کہ ایک نئی مصیبت میرے سر آگئی۔ جب میں حسب معمول کوئی کام کرنے لگتی تو وہ میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیتے اور پھر میرے ہاتھوں کے بے شمار بوسے لینے لگتے۔ اور آہستہ آہستہ کہتے "روحی تم آرام سے بیٹھی رہو۔ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں خود لے لیا کروں گا۔"

"نہ معلوم تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ جب سے ڈاکٹرنی کے ہاں سے لوٹے ہو اس وقت سے تم مجھے بالکل کام کرنے نہیں دیتے۔ آخر کیا بات ہے۔ مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ میری جان۔ تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ چھوٹے موٹے کام کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ کیا میرے ہر کام کا کرنا تمہارا ہی فرض ہے۔ کیا یہ میرا فرض نہیں۔ ہم دونوں برابر کے شریک ہیں میری روحی!" شاہد نے صفائی میں کہا۔

"نہیں، کوئی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ باورچی خانے کے کام کو تو تم نے ماما کے حوالے کر دیا۔ اب دوسرے کام سے بھی روک رہے ہو۔ آخر کیا بات ہے کچھ تو کہو!"

"کوئی بات نہیں۔ روحی! میرے سر کی قسم کوئی بات نہیں!"

"خدا را قسم نہ کھاؤ۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے!" میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

جھٹ انھوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور میرے ہاتھوں کے بے شمار بوسے لینے لگے۔

"اوں۔ ہوں۔ اونہہ۔ چھوڑو بھی میرے ہاتھ۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا سمجھے گا؟"

"غضب ہو گیا روحی! غضب۔ میرے اللہ میں اب کیا کروں۔ دیکھنے والوں نے دیکھ لیا۔ اب کیا ہوگا؟" شاہد نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کس نے دیکھ لیا۔ جلد بتاؤ۔ آخر کس نے دیکھ لیا؟" میں پریشان ہوتے ہوئے سوال کر بیٹھی۔

"میں نہیں بتاؤں گا تم فکر نہ کرو۔ میں خود ان سے نپٹ لوں گا!" شاہد نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کہو بھی آخر کس نے دیکھ لیا؟"

"ٹھہرو بتاتا ہوں۔ وہ دیکھو!"

"وہاں تو کوئی نہیں اور دروازہ بھی تو بند ہے۔ مجھے کیوں پریشان کرتے ہو جلد بتا دو!" میں گڑگڑاتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"اگر بتا دوں تو تم کیا سزا دو گی؟"

"نہیں! میں ان سے منت کروں گی۔ التجا کروں گی!"

"تو اس سے کیا فائدہ۔ اگر منتیں بے اثر ہوئیں تو کیا کرو گی؟"

"میں منا لوں گی! تم بتا تو دو۔ میرے اچھے شاہد!"

"اچھا یہ بات ہے تو بس! تم اپنی آنکھیں بند کر لو میں ان کو بلاتا ہوں!"

"ہیں! یہاں تو کوئی نہیں۔ کہاں ہے وہ!" چاروں طرف نظر دوڑا کر کسی کو نہ پا کر میں سوال کر بیٹھی۔

"وہ تو یہیں ہے!"

"کہاں؟"

"یہاں! ادھر دیکھو!" شاہد نے اپنی دونوں آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم بڑے وہ ہو........"

آج نہ جانے کیوں میری طبیعت نڈھال ہوگئی تھی اور مجھے اس بات کا بھی پتہ نہ تھا کہ میں کب بے ہوش ہوئی تھی۔ اب جب ذرا ہوش آنے لگا تو پاس سے روتے ہوئے بچے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"مبارک ہو بی بی! لڑکا ہے بالکل تمہارے جیسا" کسی نے قریب سے کہا۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی تو وہی سامنے کے مکان والی پراسرار بڑھیا کھڑی مسکرا رہی تھی۔

اب ایک ایک کرکے سارے واقعات میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ سایہ...... شیطان........ دوسرا........ انسانی دھندلے دھندلے سائے........ بڑھیا........ بچے .... وہ معمہ جو کئی دنوں سے میری نیند اور آنکھوں کے درمیان حائل ہوکر رہ گیا تھا۔ اب ایک ایک کرکے اس پر سے پردے اٹھنے لگے۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا........ کبھی نہیں ...... پھر کبھی اس بڑھیا کی منحوس صورت یہاں نظر نہ آئے گی...... گندی نالیاں...... کیڑے مکوڑے........ مٹی سے اٹے ہوئے چہرے........ نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہوگا...... پھر کبھی نہیں ہوگا...... میرے اللہ...... " چیختے ہوئے میں نے کہا۔

"رومی........ رومی........ تمہیں کیا ہوگیا........ یہ دیکھو بچہ........ تمہارا بچہ...... میرا بچہ...... ہمارا بچہ...... کتنا خوبصورت ہے بالکل تمہارے جیسا...... یہ کیا کہہ رہی ہو...... وہی ...... ایسا نہیں ہوگا...... یہ سب کیا ہے رومی...... سایہ ...... شیطان...... دوسرا...... گندی نالیاں...... کیڑے مکوڑے" شاہد نے میری پیشانی پر سے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں میرے سرکار........ تمہارا بچہ...... ہمارا بچہ........ میرا بچہ........ " میرے پلکوں سے ڈھلکتے ہوئے موتی تکئے پر آرہے تھے۔

○

اقبال احمد

تضاد

مشرق اور مغرب میں ایک دوسرے کے متوازی مدرسے کی دو اونچی اونچی لال لال عمارتیں تھیں۔ ان پہ سفید سفید گنبد ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی پرندے نے انڈے دے رکھے ہوں۔ انھیں عمارتوں کے بیچ میں شمالی سمت کے بالکل سروں پر ایک اور عمارت بن رہی تھی۔

نہ جانے اچانک کیسے یہ خبر گرم ہوئی کہ آج اس نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جائے گا۔ اس ادارے میں اپنی نوعیت کا آج یہ پہلا اجتماع تھا۔ اس سے قبل جتنے اجتماع ہوئے اساتذہ اور طلبا نے مگر آن کی آن میں اس کا انتظام کر ڈالا مگر لڑکوں کو آج اسٹیج سے دور ہی رکھا گیا۔ اس کا انتظام چند اعتماد والے استادوں کی مدد سے سرکاری طور پر ہو رہا تھا۔ پولیس والوں کا پہرہ تھا، خفیہ والے الگ ترچھی ترچھی آنکھوں سے قریب سے گذرنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد اب رکھا جانا ایسے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کسی لڑکی کو اپنی جگ ہنسائی کے بعد نکاح کی رسم کی ادائیگی کا خیال آئے۔

سویرے سے ہی عمارت کے سامنے صفائی کا انتظام ہوا۔ اسٹیج بنایا گیا۔ پیچھے سب سے اوپر یو، این، او اور اس کے نیچے یونسکو کا جھنڈا لگایا گیا۔ موسم آج صبح سے ہی اپنے تیور بدلے ہوئے تھا۔ کالے کالے بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ سردی نے چلتے چلاتے ایک بار پھر ہلہ بول دیا اتنی غضب کی سردی کہ دانت کٹ کٹ بول رہے تھے۔ بوندا باندی نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔ ہوا کی تیزی سے درختوں کی ٹہنیاں اور شاخیں تک ٹوٹ ٹوٹ کر گری جا رہی تھیں۔ شامیانوں پانی پڑنے لگا، اور سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ سب کے حواس گم ہو گئے۔ سوال یہ تھا کہ اب اس رسم کی ادائیگی کہاں ہو؟ سب نے ہمدردی اور غم خواری شروع کر دی۔ ایک کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا تو دوسرا زار و قطار رونے لگا۔ مسئلے کا حل کسی کے ذہن میں نہ آتا تھا۔ کون کہے کہ جہاں نماز ادا کی جاتی ہے وہیں پر کیوں نہ انتظام کر لیا جائے۔ مگر نماز کی جگہ اور جوتے! اُف! جوتا گندہ اور ناپاک جوتا انجس اور غلیظ جوتا! مگر یہ تو مکمل مسجد بھی نہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا۔ "یہ ہال ہے اس پر مسجد کا اطلاق نہیں ہوتا۔" "ہوتا ہے۔" "نہیں ہوتا!" "ہوتا ہے۔" "نہیں ہوتا!" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ فیصلہ کون کرے! فیصلے کا حق تو خدا کی ذات کو ہے مگر یہاں خدا کی ذات کہاں ——— یہاں تو سب اس کے ادنیٰ اور گنہگار بندے تھے۔ اس وقت کون فیصلہ کرے۔

ایک دوسری آواز (یقین کے ساتھ) "ہاں اگر مسجد نہیں تو پھر جوتے پہن کر جا سکتے ہیں۔"

سب نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مبارکباد پیش کرنے لگے کہ "اب عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا سکتا ہے، یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر بودے کا خیر مقدم کیا جا سکتا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر اور آن کی آن میں چٹکی بجاتے جانبازوں اور وفاداروں نے مسٹر بودے کی آمد سے قبل ان کے استقبال کے لئے اپنی جان کی بازیاں لگا دیں۔ بارش کا مقابلہ کیا۔ سردی کے خلاف جد و جہد کر کے "ہال" میں جلسے کا انتظام کر دیا۔ بارش تھی کہ تیز ہی ہوتی جا رہی تھی۔ سڑک پر پانی کو چیرتی ہوئی کاروں پر امریکی اور برطانوی مہمان آتے رہے۔ سردی بڑھتی رہی۔ یورپین خواتین برانڈی اور وہسکی کے پیگ چڑھائے ہوئے گرم گرم اونی کپڑوں میں ملبوس لپ اسٹک لگائے کندھوں پر فر ڈالے ناخن بڑھائے محفل کی رونق بڑھاتی رہیں، ان کی مسکراہٹ کے پس منظر میں ان کے گندے اور پیلے دانت جھانکتے ہوئے نظر آ رہے تھے اور یہ اپنے ان دانتوں کی بدبو کو تیز قسم کے سنٹ کی خوشبو سے دبانے کی کوشش کر رہی تھیں اور اپنے گرم مصافحوں اور میٹھی مسکراہٹ سے لوگوں کے دلوں میں قدرت کے اس موسمی غیظ و غضب کے اثر کو زائل کرتی رہیں۔ امام صاحب الگ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے اپنی داڑھی پر ہاتھ

بیسر رہے تھے، اور یوریوں لدی پیٹ ہوئے ننگی پنڈلیاں دوا دیا ہے۔ ان مبنی کی تو بڑا مرکز سی رہا گویا کہ زندگی اگر کا ایک خوش اور زندگی کا ایک حوکن تو شہی ہوا گی
اسی طرح چند ہفتے قبل بادلوں کے دنوں میں جب کہ آسمان صاف تھا ہر طرف چہل پہل تھی اور ابھی اس عمارت کا کام شروع ہی ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا اور
سب لوگ شام کی دلفزا دھوپ میں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کہ ۔۔۔ ایک بچے نے سنگ بنیاد رکھنے میں گارے کو گاڑھا اور پتلا ہونے سے بچانے
پانی کی مدد کی تھا، اپنی جان دے دی تھی۔ ماں کو اپنی اکلوتی امید کی کرن اس عمارت سے نظر کر رہی تھی۔ اس وقت ایک بچہ اس بچی سائیکل سے میرا وہ پاک لڑکی باہم کپڑ
کو ملوا رہا تھا۔ ان بچے کا نور بھی مرحوم تھا۔ تنگی اور میری کوئی ارمنی و سماوی آفت بھی تو نہ آئی تھی۔ اس کا باپ ظلم دیکھنے والوں کی بستی اور دو جوانوں کی نئی عمارت
کی تشکیلات میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ ایک اجتماعی اور تہذیبی کام میں حصہ لے رہا تھا۔ انھیں کی بستی میں جو انسان کے ذہن کو شعور بخشتے ہیں ایک بچہ انھیں کھودنے کے
گڈھے میں ڈوب کر ایسی ہی تہہ میں بیٹھ گیا جیسے پتھر پانی کی تہہ میں جا کر پھر کبھی نہیں ابھرتا۔ اس کی ماں اپنے معصوم لعل کو ایک گڈھے کے قریب بٹھا کر کھیت
میں محنت مزدوری کرنے چلی گئی تھی کہ وہ شام کے وقت اپنے دل کے ٹکڑے کو پیار سے چوم چوم کر اور رات دودھ پلا کر اپنے لئے ایک مستقل تسم ہم دے گی
وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو کھلا کھلا کر کبھی تو زندگی کی ساری تلخیاں بھول جاتی۔ کہیں اس کے جگر کا ٹکڑا پیاسا تو نہ تھا۔ اسے بھوک تو نہ لگی تھی، اس نے
اپنے گرد ماں کے دودھ کو تلاش تو نہ کیا ہوگا؟ وہ بھوک کی شدت سے تلملا تو نہ اٹھا ہوگا؟ روتے روتے ہچکیاں تو نہ بندھ گئی ہوں گی؟ ۔۔۔ اور
اس نے اپنی بھوک دور کرنے کی خاطر اپنی ماں کی طرح جیسے کہ بچے بنا اوں میں چلا لگاتے ہیں گھوم تو نہ گیا ہوگا؟ وہ انھیں جنبشوں سے لڑھک کر گڈھے
میں تو نہ جا پڑا ہوگا؟ وہ گڈھا جس میں چار پانچ فٹ گہرا پانی تھا اور جس کے اوپر کی سطح آسمان کے منہ کو تک رہی تھی۔ اس میں سے پانی کے بلبلے نکلے
جو گویا ماتم کر رہے تھے کہ تم اس گڈھے میں اپنی اینٹیں بھگوتے ہو اس میں اس کی تشنگی بجھاتے ہو جو کہ گارے کے لئے پانی اکٹھا کر کے رکھتے ہو ۔۔۔
نئی اور عالیشان عمارتیں تعمیر کرتے ہو ۔۔۔ نئے نئے معنی تجربے کرتے ہو۔ وہ انسان کو تو پال لو، جس کے باپ نے اس گڈھے کی کھدائی کی، جس نے
پمپ لگایا اور نالی بنا کر گڈھے تک پانی پہنچایا۔ اس بچے کا باپ جو اپنی مشک کی منہ سے دھار بنا کر بنیادوں کی ترائی کرتا تھا۔ اس کا باپ بہشتی سمجھے جانے
کیا جاتا ہے۔ عاقبت میں اسے بہشت ملے گی یا نہیں بعید از عقل چیز ہے یہاں تو اسے ہر چیز سے جہنم کی آگ کی لپک سی آتی محسوس ہونے لگی۔ اس
کی زندگی ایسی ہی ہوگئی جیسے مشک سے سارا پانی نکل جائے تو خالی خولی لٹک جاتی ہے۔ اس کی گردن ویسے ہی لٹک گئی جیسے اس کی خالی مشک کندھے پر لٹکی رہتی
وہ اپنی مشک کو کسی نل یا کسی کنوئیں پر جا کر دوبارہ بھر سکتا تھا، اس کا پیٹ بھر دے گا مگر اس کا نور جگر کس نل اور کس کنوئیں سے دوبارہ حاصل کیا جا سکتا ہے
وہ ایک اجتماعی تخلیق میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ اس کی اینٹوں کی پیش بجھا رہا تھا۔ بھلا اس کی تخلیق کی کون حفاظت کرے گا؟ اس کے دل کی تپش کو کس آب زمزم
کے دھارے ٹھنڈا کر سکیں گے۔ اس کی ماں نے اس روز اپنے ہونٹ چبا ڈالے اور اپنی چھاتی کو پیٹ پیٹ لیا تھا۔ اس سانحہ سے اس پاکیزہ بستی میں کہرام
کیوں نہ مچ گیا۔ اس کی موت اس عمارت کی تعمیر میں کیا ایسی حقیقت رکھتی ہے کہ دو منزلہ عمارت سے اینٹ گری اور چور چور ہوگئی۔

اس جلسے میں مسٹر بودرے ڈائرکٹر جنرل یونسکو کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔ ان کی صفات کو سراہتے ہوئے یونسکو کی تعلیمی اور ملکوں کی عام ترقی
اور مرفع الحالی کا نگراں اور سرپرست تسلیم کیا گیا، اس تعلیمی ادارے کا مجمل طور پر تاریخی جائزہ لیا گیا۔ اس کے قومی وقار، شان اور ادارے کی اپنی روایات
پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ مگر آج جہاں اس ادارے کی شان امتیاز گنائی جا رہی تھیں اس کے ساتھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس کی اپنی تمام روایتیں
اس کا نمایاں پن اور اس کی ساری خصوصیتیں یکے بعد دیگرے بتاشے کے مینارے کی مانند ڈھلتی اور پھر چور چور ہوتی جا رہی تھیں اس لئے کہ اس ادارے
نے کبھی بھی کسی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ تعلیم کا تعمیری کام کرنے والے تعلیمے پہلوانوں کی طرح دوسروں کی طرف دادِ طلب نظروں سے نہیں
دیکھتے اگر آج اس ادارے کے ارباب حل وعقد کا خیال تھا کہ یونسکو یو، این، او کی سچی سچائی لونڈی اور اس کے ڈالروں کی تھیلی کا منہ کچھ اس طرف
بھی وا ہو جائے اور یونسکو بنت یو، این، او۔ این یو، ایس، اے ان کے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوگا۔ بدیسی مال۔ بدیسی تعلیم اور بدیسی رہن سہن
کا بائیکاٹ کرنے والے اب امریکہ کی مرتب کی ہوئی معاشی تعلیمی اور تہذیبی پروگرام میں اپنے ملک کی مرفع الحالی اپنے دیس کی اُنتی اور تہذیبی
اور تعلیمی بلندی کا راز مضمر سمجھتے تھے اس تعلیمی ادارے نے کبھی بھی کسی جماعت یا فرد سے کہ وہ صاحب جاہ و حشمت ہے کسی عمارت کا سنگ بنیاد
نہیں رکھوایا اور نہ ہی اس کے عطا کئے ہوئے روپے سے تعمیر شدہ عمارت پر اس کا نام ہی کندہ کروایا ہے بلکہ اس کے برعکس اس تعلیمی ادارے

نے پہلی سنگ بنیاد اس کے سب سے چھوٹے بچے نے رکھی تھی۔ اس نے سنگ بنیاد رکھنے کی زنجیر اتنی ہی خوشی اور اطمینان سے جھٹکا دے کر کھینچی تھی جیسے کہ وہ اپنی پتنگ کو بڑھانے کے لئے جھٹکے دیتا تھا تو اس کی پتنگ بادل کے سنگ ہچکولے کھانے لگتی تھی۔ آج اس نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے اور اس زنجیر کو کھینچنے کے لئے یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس زنجیر کا جھٹکا ہمارے حلق کو اپنے حلقے میں لے لیگا۔ وہ لال پتھر ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کی طرح عمارت کے بڑے دروازے پر نصب کر دیا گیا۔ اس پتھر پر سیاہ روشنائی سے یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل بودے کا نام کندہ ہے۔ وہ ادارہ جو تہذیبی اور تمدنی ترقی کے پروگرام کے تحت امریکی سامراج کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرے ممالک کے ذہنی شعور کو کند کرنے اور احساسات کو مفلوج کرنے والا لٹریچر فراہم کر رہا ہے کالجوں اور اسکولوں کے لئے درسی کتب بہم کر رہا ہے۔ نئے طرز کی ریڈریں تیار ہو کر آئیں گی جس میں الف سے آم کی جگہ "ایٹم" اور "ب" سے بلبل کی بجائے "بم" ہوا کرے گا۔ اور "ٹ" سے ٹٹو ٹروین کی شبیہہ اس انداز سے اختیار کرے گا کہ بچوں کو دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔

اس سرخ پتھر سے جس پر ڈائرکٹر جنرل مسٹر بودے کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بو دیا گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ سرخ پتھر اس معصوم بچے کے خون سے رنگ کر تیار کیا گیا ہے اور اس پر کندہ شدہ نام معصوم بچے کے ماں باپ کے وہ دل جو اب امید کی ہر کرن اور اس کی ہر شعاع کے نکل جانے کے بعد سیاہ ہو چکے ہیں ان کے ٹکڑوں کو کاٹ کاٹ کر اور تراش تراش کر اس میں جڑا گیا ہے یونیسکو ڈائرکٹر جنرل اس بستی سے چلے جائیں گے۔ دہلی ان کو الوداع کہہ دے گا۔ ہندستان کی فضا سے ان کا ہوائی جہاز پرواز کر جائے گا۔ مگر یہ پتھر یہیں نصب رہے گا، اور اس معصوم بچے "جمعہ" کی یاد کو تازہ کرتا رہے گا۔ "جمعہ" کے باپ کی مانند نہ جانے کتنے بہشتی عمارتوں کی ترائی کرتے رہیں گے اور عمارتوں کے خالق اپنی تخلیق سے محروم ہوتے رہیں گے۔

"جمعہ" کا باپ دن بھر کی سخت محنت کے بعد تھکا ہارا گھر آکر اپنے سخت اور کھردرے ہاتھوں سے اپنے بچے کے مخملی گالوں پر ہاتھ پھیرتا تو وہ زندگی کی ساری تلخیاں بھول جاتا۔ "جمعہ" جب مسکراتا تو اس کے ماں باپ کا دل قوس قزح کی مانند رنگین ہو جاتا اور میاں اور بیوی دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھ کر ارضی بہشت کی لذت سے سرمست ہو جاتے، جھوم جاتے اور زندگی ان کے سامنے رقص کرنے لگتی۔ مگر "جمعہ" کے والدین اب "جمعہ" سے اسی طرح محروم ہو گئے جیسے اندھیری رات میں کوئی تارا تیزی سے آسمان میں چمک کر تیز اور گہری لکیر کھینچتا ہوا ڈوب جاتا ہے تو پھر اس کی کوئی شعاع اور کوئی چمک ہم تک نہیں پہنچ پاتی۔

اس بستی کے کرتا دھرتا جو باہوش و باشعور ہیں اور صاحب جاہ و جلال ہیں ان پر اس معصوم شاہکار کے گم ہو جانے سے کوئی اثر نہیں ہوا یہ شام کے وقت حسب معمول قرب و جوار کی پہاڑیوں میں گھومتے اور آسمان کو تکتے رہے۔ یہ وہ ہیں جو دن کے وقت اختر شماری کے مسلک کے قائل ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی گھماتے ہی ان کا علم ان کے پیروں کو زمین سے اٹھا کر فضا میں معلق کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی مخلوق کی تلاش میں نکلتے ہیں جس کا وجود صرف ان کے ذہن یا ان کے ماوراء ذہن میں ہوتا ہے ماوراء ذہن کے مادہ اور وجود کی تلاش ان کے علم کی معراج ہے۔

○

غیاث احمد گدی

میرے دوست پال نے بستر پر لیٹے لیٹے ایک روز مجھ سے کہا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ زندگی خواہ کتنی ہی ہنگی کیوں نہ ہو وہ اسے ضرور حاصل کرے گا۔ زندگی اور موت کی اس کھینچا تانی میں وہ پل بھر کے لئے بھی زندگی کی ہار اور موت کی جیت گوارہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پال جانتا تھا کہ اس کی موت اس کی خوبصورت اور ہنس مکھ بیوی کی موت ہوگی۔ اس کے تین تندرست بچوں کی موت ہوگی۔ اس پیارے اور مسرت بھرے ماحول کی موت ہوگی جس کے سہارے سماجی زندگی میں ہزاروں دکھوں کے باوجود روح سکھ بار رہتی ہے۔

پال کی موت شطرنج کے اس مہرے کی طرح تھی جس کے اٹھ جانے پر سارا کھیل ہی بگڑ جاتا ہے۔ پھر سارے دوسرے مہرے بیکار ہو جاتے ہیں۔ فطرت ستم ظریف سہی مگر اتنی بھی تو نہیں کہ ایک ہرے بھرے چمن کو یوں ایک پھول کے لئے ویران کر دیگی۔ ٹی بی کے بیمار پال کو ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اعتراف تھا کہ وہ بے دست و پا ہے۔ اس کے پاس اس کے حملے کی مدافعت کے لئے بھی کوئی سامان نہیں۔ اس کے برعکس ادھر زندگی کی فوج کھڑی ہے۔ توپ ہیں گولے ہیں۔ بارود ہے، بم ہیں، زہریلی گیس ہے اور وہ اکیلا ہے۔ صرف ایک عزم۔ ایک خواہش کے سہارے ......

اس نے بہت کچھ کہہ چکنے کے بعد میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"کیوں تمہارا کیا خیال ہے۔ مجھے زندگی کو عزیز رکھنا ہی ہوگا۔ ہے نا۔ ؟ اپنے لئے نہ سہی۔ اپنے بچوں کے لئے۔ اپنی بیوی کی خاطر......"

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اچھا ہو جائیگا یہ سنکر اس کی آنکھیں مسکرا اٹھی تھیں۔

اس روز پال کے کمرے سے نکل کر جب میں نے اس کی باتوں کے بارے میں سوچا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ ٹی بی کے بیمار اور خون تھوکنے والے اس تلاش کلرک کے پاس معمولی دواؤں کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں اس کے باوجود جس جرأت کے ساتھ زندگی کے لئے موت سے لڑنے اور پھر لڑ کر فتح حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یہ واقعی ہنسنے کا مقام ہے۔ ٹی۔ بی ایک مرض نہیں ایک جوا ہے۔ شطرنج کی ایک بازی ہے۔ جس کے مہرے کھانسی بخار خون اور کمزوری ہیں۔ دوسری طرف کے مہرے وٹامن، دودھ، گھی دوائیں اور اسٹرپٹومائی سن کے انجکشن ہیں۔ آخر الذکر کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور روپے پال کے پاس نہیں۔ اس کے سارے مہرے پٹ چکے ہیں اور اس کھیل کی ہار موت ہے۔ وہ لوگ جو روپے کی کمی کے باوجود قدرت کی طرف سے یا حالات کے مجبور کرنے سے اس کھیل پر بیٹھ جاتے ہیں انہیں یقیناً شکست ہوتی ہے۔ یہ شکست صرف ان کی نہیں ان کے خوبصورت بچوں کی ہوتی ہے۔ ان کی تندرست بیویوں کی ہوتی ہے اور اس خانگی من بھاونے ماحول کی ہوتی ہے جس کی عظمت اور برتری کا ذکر ابھی ابھی میرا دوست پال کر چکا ہے۔

میرا دوست، روپوں کے بغیر اس کھیل پر بیٹھ چکا ہے۔ بیٹھ چکا نہیں بیٹھا دیا گیا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو مجھے اس بات سے بحث نہیں مجھے پال کی اس بات پر ہنسی آتی ہے کہ وہ اس طرح بھی بازی ہارنے کی بجائے جیتنے کا خواب دیکھ رہا ہے بازی جیتنے کی خواہش کا میں احترام کرتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ جن کے قریب صرف کانٹے ہی کانٹے ہوں اور یہ دیکھتے ہوئے بھی جو پھولوں کی تمنا میں انہی کے اندر الجھے رہنا چاہتے ہوں وہ پاگل ہی تو ہیں۔ اور پاگل پر دنیا ہنستی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں

لیکن میری ہنسی تحقیر آمیز نہیں۔ اس میں طنز اور استہزا کا شائبہ تک نہیں۔ بلکہ کوئی میری ہنسی پر غور کرنا چاہے تو میرے دل میں پال کے لئے ہمدردی کے سوتے پھوٹتے ہوئے پائیگا میری ہنسی در اصل اپنے دوست کی بدنصیبی اور بے چارگی پہ آنسو ہے۔ یعنی میری آنسو کے قطرے...... اس طرح میری ہنسی دنیا والوں کی عام ہنسی سے مختلف ہے۔

آج دس ماہ ہو گئے پال کو کو لیری چھوڑے اور وہ اس وقت تک مٹی کے ڈھیر میں تحلیل ہو چکا ہوگا یا پھر بستر مرگ پر پڑا زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہوگا۔ شاید اب اسے زندگی کی خواہش بھی نہیں رہی ہوگی۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش سے وہ قطعی تنگ آ چکا ہوگا۔ آخر پال انسان ہی تو ہے۔ پیالہ و ساغر تو نہیں

شاہراہ

یہی سب سوچتے ہوئے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی میری ننھی میرے پیروں سے لپٹ گئی۔ اور یوں جو دماغ پال اور پال کے جان لیوا مرض کے دھوئیں سے اٹا ہوا تھا یکلخت صاف ہو گیا جس طرح فضا پر چھائی ہوئی کہر کی چادر سورج کی ایک ہی کرن سے چاک ہو جاتی ہے۔ میں نے بچی کو گود میں اٹھاتے ہوئے چوم لیا اور حسب معمول اس کے پھولے ہوئے سرخ گالوں پر پیار سے دو طمانچے "میں تمہیں ایسے ماروں گا آں!"

حسب معمول میری بچی بھی میرے گال پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ایک تھپڑ مارتی ہے۔ "میں تمہیں ایسے ماروں گی آں......

میں ہنس پڑتا ہوں ساتھ ہی میری ننھی بھی کھلکھلا پڑتی ہے۔ سارا ماحول اس قدر خوشگوار اور روشن معلوم پڑتا ہے کہ اس کے بعد دنیا کی ہر تکلیف ہر مصیبت آنکھ اوجھل ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی کلی چٹک رہی ہو.......

عین اسی وقت ایک خیال میرے دل میں آتا ہے کہ اگر کل میں بھی ٹی بی کا مریض ہو کر زندگی اور زندگی کے ہنگاموں سے دور کسی نامعلوم مقام کو چلے جانے پر مجبور کر دیا جاؤں تو اس وقت میری ننھی منی کس کے گول گول پر طمانچے مار کر ہنس سکے گی۔؟ میرا دل کانپ اٹھا اپنے تصور کی اس پرواز پر میں قدرے جھنجھلا گیا۔ خیالوں کے جھاڑ سے نکلا تو ننھی کو تتلا تتلا کر کچھ کہتے سنا۔

"کیا بات ہے ننھی؟

"بابا! بلاقی آیا ہے۔!

"کون بلاقی۔؟

بچی گود سے اتر گئی اور میری انگلی پکڑ کر اندر صحن کی طرف لے جانے لگی۔

"وہ بابا بلاقی...... بابا دیکھو نا............ وہ بلاقی.......!

اندر صحن میں امرود کے پیڑ سے لگا ہوا بلاقی آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا تھا۔

"ارے بلاقی کو کہہ رہی ہے تو۔؟ میں بھی سمجھا کون بلاقی ہے بھئی۔"

"میری آواز سن کر بلاقی نے آنکھیں کھول دیں۔ "ہاں میں ہوں بابو۔"

بلاقی کوئلے کی گہری گہری کانوں میں کام کرنے والا ایک مزدور ہے۔ وہ بارہ بارہ گھنٹے اندھیری کھدانوں میں جہاں میرے جیسے کلرک بابو کو سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ سخت سے سخت کام کرتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا جوان لڑکا بھی ہوتا ہے۔ اور بیوی بھی۔ وہ باپ بیٹا تو اندر کھدانوں میں بڑی بڑی سیاہ چٹانوں سے فرہاد کی طرح الجھے رہتے ہیں اور بیوی کچھ سالوں سے کانوں کے اندر جانے کی ممانعت ہو جانے کے باعث دوسری درجنوں عورتوں کے ساتھ باہر لفٹ کے ذریعہ آئی ہوئی ڈولی میں سے کوئلے پلٹ پلٹ کر اور بید کی ٹوکری میں بھر بھر کر فرلانگ بھر دور بھٹے تک لے جاتی ہے۔

دن بھر کی سخت ترین محنت و مشقت کے بعد بھی بلاقی اور بلاقی کے گھر کے لوگ اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ اچھی طرح نہیں بھر سکتے۔ اس کا خاندان جو سات افراد۔ وہ اس کی بیوی، ایک بڑا لڑکا، ایک بوڑھی اندھی ماں اور تین چھوٹے چھوٹے بچوں پر مشتمل ہے۔ ہمیشہ اپنی اپنی قسمت کو روتے رہتے ہیں۔

یہ سب تو تھا ہی مگر اس پر بھی کوئیری کے مالکوں نے اچانک راشن بند کر دینے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ حاضری کے پیسے زیادہ ملا کریں گے۔ مزدور اشیائے خوردنی بازار سے خریدیں تو بلاقی اور بلاقی جیسے ہزاروں مزدوروں پر اچانک مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے شہر کے کالے بازار سے ایک روپیہ اور ایک روپیہ روز آنے سیر چاول کہاں سے خریدے جا سکیں گے۔ یونین کی سیر چپ چاپ کے بعد احتجاج کے طور پر بلاقی نے ہزاروں مزدوروں کے ساتھ مل کر ہڑتال کر دی۔ آج ہڑتال کا ساتواں دن تھا۔ مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مالکان نے فیصلہ کر لیا ہے کہ راشن سسٹم بند کر کے ہی دم لیں گے۔ ان کی ازلی فرعونیت سے کسی قسم کی نرمی اور لوچ کی امید بھی احمقانہ بات تھی۔ میں نے بلاقی کے قریب امرود کے پیڑ کے سائے تلے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کہو بھائی بلاقی آج ادھر کیسے چلے آئے۔؟

اس نے کان سے دھوتی بیڑی نکال کر سلگاتے ہوئے بالی دہری سنائی دکھائی۔ پھر ایک کش کھینچ کے اطمینان سے بولا۔

"آپ جانتے ہیں کہ پیدل میں آتے آٹھ دنوں سے ہڑتال ہے۔؟"

"وہ تو میں جانتا ہوں۔ مگر آج تم میرے پاس کیوں بیٹھ گئے"!

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ چاول ختم ہو گیا ہے۔ اور پاس میں پیسے کچھ نہیں۔ سوچا آپ سے کہوں اور جا رہے ہوں تو دیجئے۔ گھر جانے تک۔ ہمارا دوگا۔ شاید پڑوس کے گھر سے آتا ہوا میری بیوی کی نگاہیں مجھ پر پڑیں۔ وہ چونک سی گئی۔ "اے آپ! آفس سے اتنی جلدی آ گئے"! "یس تیرہ دن کے بعد چھٹی ملی تھی۔ کچھ ہڑتال کی وجہ سے دفتر میں کام ہی کون سا رہ گیا ہے۔"

میری بیوی نے درخت کے نیچے دھوپ سے کھیلتی ہوئی ننھی منی کے کان کو پکڑا ۔ "تو پھر دھوپ میں کھیلنے لگی۔"

بچی نے اچک کر ماں کے کان کو بھی اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے پکڑ لیا۔ "تو پھر مجھے کیسی چھوڑ کر چلی گئی"!

اس بات پر ہم سب ہنس پڑے سوائے اس بیٹھے ہوئے بلاقی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ یوں لگا وہ خود اپنے گھر میں ہو اور اپنے بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ اس کے آگے زمین اور آسمان ایک موہوم سا نقطہ بن کر رہ گئے ہوں۔ اس ہنسی میں انسانی زندگی کی کون سی عظمت ہوتی ہے کہ اس کے آگے ساری دنیا پھیکی اور بے وقعت رہ جاتی ہے۔ قہر زدہ سے عظیم خوشی کے انسانی دنوں میں برف کے ٹھنڈے۔ بدخوبصورت پھول اگ آتے ہیں۔ عین اسی وقت مجھے نہ جانے کیسے میرا دوست پال یاد آ گیا۔ پال کے وہ ننھے اور خوبصورت بچے جو چاہتے ہوئے میری گود میں آ بیٹھتے تھے اور اپنے بیمار بیٹا کی شکایت کرنے لگتے تھے جو بڑی طویل علالت کے باعث یا کسی وجہ سے بھی بچوں کو پیار کرنے کی بجائے انہیں جھڑک دیا کرتا تھا۔ اس وقت مجھے خیال ہوا تھا کہ یقیناً اس جھڑکی میں بھی پال کا پیار مضمر تھا اس لئے پیار ایک عظمت تھی۔ جانے کیوں یہ یتیم جو آج اس کے بچیوں کو کھرچ کھرچ کر کھا رہے ہیں کل اس کے بچوں کے بچھیڑوں پر بھی ٹوٹ پڑیں گے۔۔۔۔۔ میں نے ایک لمبی سانس لی ۔۔ نہ جانے پال ابھی تک زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔! مر ہی گیا ہوگا۔۔۔۔۔ زندگی کی بے بسی کا یہ چہرہ خواہش نہ ہونے پر بھی زبردستی اٹھا لیا گیا ہوگا۔۔۔۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔۔۔۔۔ پھر کس نے میرے اندر سے سوال کیا۔ مگر اس کے معصوم بچے اور بیوی کا کیا حال ہوگا!

دیر تک میں خیالات کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی کہ میری بیوی عین میرے کان کے پاس چلائی۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ! پھر جو گی باقی رہ گئی تھی کہ منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ میں نے ناشتہ بھی تیار کر لیا ہے۔ آپ بیٹھے ہی ہیں سے چلئے۔!"

"پہلے بلاقی کو دس روپے دیدو اسے پیسوں کی بہت ضرورت ہے!"

میری بیوی خاموش رہی۔ وہ سکہ بھی نہ سن پائی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مہینہ بھر کے بجٹ میں سے اس بجٹ میں سے جس کی رو سے جیسے میں دو چار دن نصف خوراک پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایکدم سے دس روپے دے دئے جائیں تو شاید مہینہ کے آخری دنوں میں ہمیں فاقے کرنے پڑیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے واقف ہونے کے باوجود یہ بھی جانتی ہے کہ میں ایسے موقعوں پر انکار رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لئے وہ گو مگو کی شکل کے عالم میں چپ چاپ کھڑی ہے۔

"تم فکر نہ کرو میں انتظام کر لوں گا۔" اس وقت بلاقی زیادہ ضرورت مند ہے"۔

پشپا اندر چلی گئی۔ پھر میں بلاقی سے مخاطب ہوا۔ "کیوں بھائی بلاقی تم لوگوں نے جو ہڑتال کر رکھی ہے تو کیا تم لوگوں کو یقین ہے کہ یہ ہڑتال کامیاب ہوگی؟ مجھے ان کو بیری مالکوں سے ذرا بھی امید نہیں۔ یہ لوگ ایسی ہی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر حکمران طبقہ بھی تو ان ہی لوگوں کے ساتھ ہے"۔

میرا خیال تھا کہ بلاقی میری ہاں میں ہاں ملائے گا اور سات دنوں کی ہڑتال سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتے نہ دیکھ کر مزدور مشترکہ طور پر ہڑتال ختم کر دینے پر آمادہ ہو گئے ہوں گے۔ اور بلاقی مجھے اس متفقہ فیصلے سے ایک ہمدرد کی طرح آگاہ کر دے گا۔ لیکن تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس نے میری توقع کے خلاف نفی میں جواب دیدیا۔

"جی نہیں! اب مالکوں کو ہماری مانگیں پوری کرنی ہی ہوں گی۔ آپ نہیں جانتے ہیں اب ہم آج سے کچھ سال پہلے والے بزدل مزدور نہیں ہیں۔ اب یونین نے ہمارے دلوں سے خوف اور ڈر ہٹا کر اس کی جگہ حوصلے اور ہمتیں بھر دی ہیں۔!"

اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ لوگ مر جائیں گے مگر ہڑتال نہیں توڑیں گے اور یہ کہ اس سلسلے میں بہت جلد یونین کے ماتحت ایک جلسہ ہونے والا ہے اس کے بعد مزدور مل کر مظاہرہ کریں گے۔

میری بیوی نے اتنی دیر میں پانچ پانچ کے دو نوٹ بلاقی کے ہاتھ میں رکھ دئے۔ "لو بھائی دس روپے"۔

بلاقی مجھے اور پشپا کو سلام کرتا اور یقین دلاتا کہ وہ بہت جلد روپے واپس کر دے گا، باہر نکل گیا۔ میں نے پشپا سے پوچھا۔ "کیا خیال ہے بلاقی وغیرہ کی

ہڑتال کے بانی ہیں۔ مجھے تو کامیاب ہوتی نہیں دکھتی۔!

بیویوں کو شاید ایسے سوالوں کے جواب دینے سے پہلے اپنے دن بھر دفتر کی فائلوں میں دبے رہنے والے بجائے شوہروں کے ناشتے کا زیادہ خیال رہتا ہے اور وہ قائل کی بجائے اپنی خانگی زندگی سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ تھک کر کچھ ناشتہ کر لیجئے۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ پھر میں آپ کی بات سنوں گی اور اس کا جواب دوں گی۔"

ارے منجو کہاں چلی گئی۔؟ میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"وہ اندر ناشتے پر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔" پھر کمرے کی طرف جھانک کر زور سے تاکہ منجو سن لے کہا۔ "آج منجو کو کچھ نہیں ملیگا۔ چائے بھی نہیں اور آلو کے چاپ بھی نہیں۔"

چائے اور آلو کے چاپ منجو کی مرغوب چیزیں تھیں اس لئے اس کی ماں نے خاص طور پر ان ہی چیزوں کا نام لیا جسے سن کر منجو اندر سے بولی۔

"میں تو تھا بھی لیتی ہوں آلو کے چاپ۔"

"ارے وہ کھانے بھی لگی۔؟" میں اندر کی طرف بڑھا۔

"شہر شیطان میں ابھی آتی ہوں۔" اس کی ماں بھی ساتھ ہولی۔

زندگی کتنی خوبصورت شے ہے۔ کتنی پیاری! جہاں پشپا جیسی بیوی اور منجو جیسی شوخ اور تندرست بچی ہو وہاں جنت اور پرلوک کا تصور بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شاید جنت میں بھی آدمی کو اتنا سکھ نہ مل سکیگا۔ اتنی مسرت میسر نہ آئیگی جتنی ایک پیار بھرے گھریلو ماحول میں انسان کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ جنت میں انسان کو پشپا جیسی بیوی اور منجو جیسی بچی کا وجود تلاش کرنے کے باوجود کہیں دکھلائی نہ دیگا۔ لیکن بساط کا صرف ایک مہرہ اٹھا لیا جائے تو یہی جنت اور پرلوک کے تصور کو دھندلا دینے والا پیارا ماحول جہنم زار میں بدل جاتا ہے۔ اور زندگی کا کھیل دیکھتے دیکھتے بگڑ کر رہ جاتا ہے کہ بنائے نہیں بنتا۔ سانس رکتا ہے اس تسلسل کو زندگی جیسا خوبصورت نام دیکر فطرت نے ایک ایسا معجزہ مرتب کر دیا ہے کہ اس کے تجزیہ کے بعد اس عظیم معجزہ کی عظمت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ پتہ نہیں سانسوں کے یہ تار کس وقت آپس میں الجھ کر رہ جائیں۔

(۲)

دوسرے روز میں ابھی دفتر سے واپس آ رہا تھا کہ کوپری گیٹ کے پاس ہی کچھ مزدوروں کو اکٹھا پایا۔ کوئی خاص بات تو ضرور تھی جو لوگ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ان کے سیاہ چہرے خون کی حدت سے سرخ دکھائی دے رہے تھے۔ ان مزدوروں میں بلاقی بھی تھا۔ میں قریب پہنچا تو بلاقی بھیڑ سے کٹ کر میرے پاس آیا۔

"کیا بات ہے بلاقی؟ یہ بھیڑ کیسی؟ خیریت تو ہے!؟"

"آج ہم لوگ مظاہرہ کرنے جا رہے ہیں۔ یونین کے لوگ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ کچھ دیر کے بعد دیکھیئے گا۔"

بلاقی کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو آج تک میری نگاہوں سے مخفی رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا جیسے طوفان کے بیچ ایک چٹان آگئی ہو۔ جو بہرحال اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی۔ یہ ڈسے ڈرے لوگ اچانک کیسے نیا ہو گئے۔

"خدا تم لوگوں کو کامیاب کرے" یہ کہکر میں آگے بڑھ گیا۔

"کہنے کو تو کہہ گیا مگر مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ آج ان مزدوروں میں سے کتنے کے سر پھوٹیں گے۔ کتنوں کے ہاتھ ٹوٹیں گے، ہو سکتا ہے کہ آج کا دن ایک دو مزدوروں کی زندگی کا آخری دن ثابت ہو اور اس کے بعد بھی وہی ہوگا جو کوپری کے مالکوں کو منظور ہوگا۔ کیونکہ آج سے ڈیڑھ سال پہلے جو ہڑتال ہوئی تھی اور جس میں شدید نقصانات اٹھانے کے بعد مزدوروں نے خود ہی ہتھیار ڈال دئے تھے۔ اس کی واضح تصویر میرے ذہن میں موجود تھی۔ اگلی ہڑتال کے موقع پر مزدوروں میں اتحاد بھی نہیں تھا۔ دلوں میں خوف و ہراس اور کشمکش تھی۔ ہڑتال فیل ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی اور یہی بات ممکن ہے اس بار بھی۔ میں نے سوچا بلاقی اور اس کے جیسے چند ایک مزدوروں کے علاوہ کتنے ہیں جو حوصلہ مند اور مستقل مزاج ہیں۔ شاید اسی مظاہرے میں سب کے سب ساتھ نہ دیں۔ یونین کی کوششوں سے یکجا ہو بھی گئے تو پولیس کی لاٹھیاں اور رائفلیں دیکھ کر لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگیں گے۔ اور یوں آٹھ دنوں کی ہڑتال ایک ہلکے سے جھٹکے سے ناکام ہو جائے گی۔ ریت کی اس دیوار کا اعتبار ہی کیا؟ میرے دل میں مزدوروں سے متعلق ہمدردی کا طوفان اٹھنے لگا۔

پھر مجھے میں خوبہ یاد آیا۔ اپنے دوسرے ساتھی کلرک یاد آنے۔ جو دن بھر شدید سے شدید محنت کرتے ہیں۔ موٹی موٹی فائیلوں میں سر کھپاتے ہیں۔ کوٹھری نما تنگ گھٹے ہوئے کمرے میں جہاں ایک پنکھا تو کجا ایک روشندان تک ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے۔ سارا سارا دن انتھک مصروفیتوں کے بوجھ تلے دبے رہتے ہوئے اور ستر پچھتر چالیس پچاس کی نامناسب رقم جو ہمارے خاندان کی ضروریات تک پوری نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے بیلوں کی طرح جتے رہتے ہیں۔ کبھی ہڑتال یا احتجاج کے بارے میں سوچتے تک نہیں۔ کبھی کبھی کوئی جوشیلا نوجوان کلرک کچھ کہہ بھی دیتا اور دوسرے کلرکوں کو اس کی حالت زار کی طرف اشارہ کر کے اسے کچھ سوچنے کی دعوت بھی دیتا تو ہم اسے سمجھا بجھا کر اور قضا و قدر کے فلسفے سے قائل کر کے خاموش کر دیتے۔ اور اسی روش زندگی پر چلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ خاص کر اس معاملے میں میں سب سے آگے رہتا ہوں۔ میں چونکہ دفتر میں جہاندیدہ معاملہ فہم اور دور اندیش سمجھا جاتا ہوں۔ میں برابر کوشش کرتا ہوں کہ ہمارے کلرک کان کے مالکوں کی ازلی کمینگی سے نہ ٹکرائیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس تصادم کا نتیجہ بجز یکطرفہ نقصان ہونے کے کچھ نہیں۔ اگرچہ ان میں کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی قلیل تنخواہ کے باعث اپنے کنبے کی تمام ضروریات تک پوری نہیں کر سکتے۔ مہینے میں چار پانچ دن ان کے یہاں ہانڈیاں الٹی رہتی ہیں۔ چولہا تک گرم نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے اسمعیل کی بیوی بیمار پڑی تو معمولی سردی کا بھی علاج نہ ہو سکنے کے باعث نمونیہ میں مبتلا ہو گئی اور "رحیما" کا پانی پی پی کر مر گئی۔ یا بنرجی کے پانچ چھوٹے ننگے دھڑنگے بچے جو ہمیشہ بھوک کے ستائے اور کمزور دکھائی دیتے ہیں۔ رگھوناتھ کی جوان لڑکی جو شادی کی راہ دیکھتی دیکھتی اٹھائیس برس کی عمر میں کسی اجنبی کے ساتھ بھاگ گئی۔ سب کچھ پیسوں کی کمی کے سبب سے ہوتا رہتا ہے۔ ستر اسی روپے ایک بیوی پانچ بچے اور خود ایک بنرجی کی کفالت کیا کرتے انہیں زندگی سے موت کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ اس کا بڑا لڑکا دن بھر شہر کے سینما اور اسٹیشن میں جیب کتروں کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہے۔ یا پھر میرا دوست پال جو ساٹھ روپے کی محدود آمدنی کے باعث کبھی اطمینان سے کھانا تک نہیں کھا پایا اور آخر میں ٹی بی جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر . . . . ہاں دس ماہ ہو گئے گاؤں میں اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ مر ہی گیا ہوگا . . . . یہ سب دیکھتے ہوئے اور سوچتے ہوئے میں نے اپنے ساتھی کلرکوں کو کبھی ہڑتال کرنے کی ترغیب نہیں دی۔ معمولی طور پر مطالبے کئے جائیں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ پتھر پر کبھی جونک لگ سکتی ہے؟ —— رائے میری ان دور اندیشانہ باتوں سے ہمیشہ چڑ جاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے موقع پر جب وہ دوسرے ساتھیوں کے درمیان اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر رہا ہو اور تحمل پوری مستقل مزاجی سے اپنے مطالبے منوانے کے متعلق ساتھیوں کو ابھار رہا ہو۔ اس وقت اگر میں زمانے کے اونچ نیچ اور کولیری مالکوں کی فرعونیت کا ذکر کر کے سمجھانے لگتا تو وہ بے حد خفا ہو جاتا۔ پرسوں ہی اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔

"پریم صاحب! آپ تو مجھے بے حد بزدل اور بے غیرت معلوم پڑتے ہیں۔ ہر طرح کی تکلیف برداشت کر لیتے ہیں۔ ہر طرح کی ذلت آپ سے گوارہ ہو جاتی ہے اور چہرے پر احساس کی ایک لکیر تک نہیں آتی . . . . آپ . . . . آپ تو . . . ."

اور قبل اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کرے میں مسکراتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ نادان کیا جانے کہ پتھر پر بہرحال جونک نہیں لگتی۔

ایک روز وہ مجھے سمجھانے لگا اور لمبی چوڑی دلیلیں اپنے خیالات کے جواز میں پیش کرنے لگا۔ میں اس کی ہر دلیل کا جواب دیتا گیا تو وہ قدرے جھلا گیا۔ جذبات کی رو میں بولا "پریم صاحب! آپ خود تو بزدل ہیں مگر اپنی باتوں سے دوسروں کو بھی بزدل اور پست حوصلہ بنا رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے انسان کے ارادوں میں کتنی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ آپ ہر طرح کی خانگی اور معاشی مشکلات کا سامنا کر لیتے ہیں مگر آپ کو اپنے حقوق کے مطالبے کی جرأت نہیں۔ آپ بی۔ اے ہیں۔ آٹھ برس سے کلرکی کر رہے ہیں۔ کیا آپ فقط اسی روپے ہی کے حقدار ہیں۔ جبکہ کولیری کے مالک ہر سال بینک بیلنس میں لاکھوں روپے کا اضافہ کر لیتے ہیں؟" وہ نادان پھر مجھے سمجھاتا ہے۔ "آپ ایک دفعہ کمپنی سے مطالبہ کر دیکھئے۔ یونہی ٹی بی کا مریض ہو کر خون تھوک تھوک کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی ایک ہی بار سچائی کے لئے بندوقوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائے . . . . . ." وہ بولتا ہے "بغیر لڑے بچوں کو دودھ تک نہیں ملتا۔ جب تک بچہ روتا نہیں ماں اسے دودھ تک نہیں پلاتی۔ پھر ہمیں آپ سے آپ کون دے گا!"

لیکن میں اسے ہمیشہ الٹی سیدھی سمجھا کر خطرناک ارادوں کی تکمیل سے روک لیتا ہوں۔ یا یوں سمجھ لیا جائے کہ میری ہی رائے نہ ہونے کی وجہ سے دفتر کا کوئی کلرک اس کا ساتھ نہیں دیتا۔

بعض وقت رائے کی بات سوچ کر میرے دل میں ایک عجیب سی خلش تیزی سے ہونے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک غلیظ اور بے حد میلے کمرے کو جس کا دروازہ بند ہے اور جو باہر سے بہت خوبصورت اور صاف دکھائی دے رہا ہے، کبھی کبھی کوئی اس بند کمرے کے دروازے کو کھول دیتا ہے۔ چند ثانیوں میں کمرے کی گندگی اور عفونیت میری آنکھوں میں جلن سی پیدا کر دیتی ہے اور جب کبھی رائے کی حوصلہ افزا باتیں یاد آتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ایک ایسی اندھیری گلی میں جس کے اندر میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہوں یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں گلی میں کانٹے ہوں، پتھر اور ناہموار سطح پر سے پاؤں پھسل جائے۔ یا کوئی بھوت اندر میرا منتظر بیٹھا ہو جو مجھے دیکھتے ہی دبوچ لیگا۔ اسی گلی میں کوئی ٹارچ جلا کر اجالا پھیلا دیتا ہے جس کی روشنی میں گلی صاف ستھری اور ہموار دکھائی دیتی ہے مگر یہ سب باتیں میرے ذہن میں تھوڑے وقفے کے لئے آتیں اور پھر ٹارچ بجھ جانے کے بعد گلی اور بھی اندھیری اور بھیانک ہو جاتی ہے۔

مظاہرہ

خوشی کی یہ موج پل بھر میں ٹکرا کر ختم ہو گئی۔

دوسرے روز مقامی اخباروں میں یہ خبر جلی حروف میں چھپی ہوئی ملی کہ گزشتہ آٹھ دنوں کی کی ہڑتال نوے فیصدی کامیاب رہی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ایک خواب کو سچ ہوتے ہوئے دیکھا ہو۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ہڑتال اس حد تک کامیاب رہے گی ۔۔۔ شام کو بلاقی آیا اور تمام تفصیلات سنا چکنے کے بعد بڑے وثوق سے بولا۔

"صاحب میں تو لگن ہونی چاہیئے۔ ایک اٹل بات پر جم جائے۔ پھر ساری مشکل یوں حل ہو جاتی ہے" اس نے چٹکی بجائی ۔۔۔ میں سر جھکائے بلاقی کی باتیں سن رہا تھا۔ میرا تو جی کے خلاف ایک بات ہو گئی تھی۔ جو مجھے مجرم کی طرح گردن جھکا لینے پر مجبور کئے ہوئے تھی۔

"ہاں بلاقی! بات تو ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔"

پھر بلاقی بہت سی ادھر ادھر کی باتیں سنا کر چلا گیا۔

ایک روز شام کے وقت جب میں کوارٹر کے باہر نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک نوجوان ہاتھ میں نیلی فائل لئے آیا۔ میں نے ایک نظر اسے اوپر سے نیچے دیکھا اور سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ چپ چاپ مسکراتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور کپڑے کچھ میلے اور بے ترتیب تھے۔ اس نے فائل کھول کر ایک کاغذ نکالا جس پر بہت سے دستخط پہلے سے موجود تھے، اور میرے سامنے رکھ دیا۔

"میں چاہتا ہوں آپ اس ۔۔۔۔۔ اپیل پر دستخط کر دیں۔ آج کل مغربی بلاک اپنے تجارتی مفاد اور ذاتی برتری کے لئے ساری دنیا پر تیسری جنگ مسلط کرنا چاہتا ہے۔ لیکن دنیا کے کروڑوں امن پسند انسان اس جنگ سے نفرت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ جنگ نہ ہو۔ پھر دنیا جیسی خوبصورت جگہ کے کسی حصہ پر ایٹم بم نہ برسائے جائیں۔ اور اسی لئے متحد ہو کر دنیا کے عوام اس اپیل پر دستخط کر کے اسے روکنا چاہتے ہیں۔ آپ بھی ان کروڑوں انسانوں کا ساتھ دیجئے۔ اور اس پر دستخط کر ڈالئے!"

مجھے یوں محسوس ہوا گویا قیامت کی آندھیوں سے بچنے کے لئے بے وقوف لوگوں نے اپنے گھر کے دروازوں پر کپڑے کے کروڑوں گز پردے لٹکا دئیے ہیں اور اس احمقانہ کوشش کے بعد مطمئن ہو بیٹھے ہیں کہ اب آندھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔۔۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ دستخط کاغذ پر کچھ آڑی سیدھی لکیریں ایٹم بم کو روک سکتی ہیں ہونے والی جنگ کے لئے رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ ؟ مجھے ہنسی آتی ہے جب میں آپ جیسے پڑھے لکھے نوجوانوں کی زبان سے اس قسم کی باتیں سنتا ہوں ۔۔۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں دستخط نہیں کرنا چاہتا، یا میں جنگ کو، ایٹم بم کو یا اسی قسم کے انسانیت سوز ارادوں کو پسند کرتا ہوں۔ میں دستخط کرنے سے پہلے مطمئن ہو لینا چاہتا ہوں ۔۔۔"

اس نے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے تسلی نہیں ہوئی۔ میں نے دراصل کوشش کر کے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا مگر جیسے میرے دل و دماغ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اندر سے پلیٹ میں دو پان لئے میری منی آئی اور اپنے ننھے ننھے خوبصورت ہاتھوں سے پلیٹ نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ماں بولتی ہیں پان کھا لیجئے۔" بچی کے توتلانے سے نوجوان مسکرا اٹھا۔ پلیٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا "بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ ماں منی بولتی ہے۔۔ اور ابا چھمدو ۔۔۔۔" بچی نے عجیب پیارے انداز میں کہا۔ وہ نوجوان ہنس پڑا۔

"آپ کی بچی بہت ذہین ہے۔ اور خوبصورت بھی" پھر اس نے بچی کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔

"ہاں یہ بچی بہت ہوشیار ہے۔ دراصل صاحب! یہ بچی ہی ہے جو ہماری زندگی کو برداشت کرنے کے قابل بنائے ہوئے ہے اور ہماری چھوٹی سی دنیا اسی کے دم سے روشن ہے ۔۔۔۔!"

"اس نوجوان کو جیسے موقع مل گیا۔ صاحب! فرض کر لیجئے اگر کوئی آپ کی اس خوبصورت بچی کے سر پر ایٹم بم گرانا چاہے تب آپ کیا کریں گے۔ ؟"

مجھے نوجوان کی یہ بات بری لگی۔ کم از کم میرے سامنے ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے تھی۔ میں ذرا تیزی سے بولا "کبھی نہیں میں کسی حالت میں بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ہر ممکن طریقے سے اس ہاتھ کو روکوں گا جس میں میری تباہی کا سامان ہو گا۔"

"اور اگر اس پر بھی وہ ہاتھ نہ رکے؟" اس نے تیزی سے کہا۔

"مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ نوجوان چاہتا ہو کہ ایسا ہو۔ میں نے جذبات کی ایک لہر اپنے اندر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میری کنپٹیوں کی لویں جل

کرشن بلدیو وید

اُن کے ہاں تین بچے تھے۔ ویسے ہونے کو تو بقول جوالا آٹھ گنت ہونے تھے۔ کئی بار رات کو یہی اپنی کھاٹ پر لیٹے لیٹے میاں بیوی حساب کرنے لگتے تو ان میں جھگڑا ہو جاتا۔ جوالا کے حساب کے مطابق آج تک کل سات بار اس کا پیٹ پھولا تھا۔ پانچ بار بات آخر تک پہنچی تھی۔ اور دو بار اسقاط حمل ہو گیا تھا یا بقول جوالا پھوڑا پکنے سے پہلے ہی گر گیا تھا۔ لیکن رام نواس کے حساب کے مطابق سلسلہ صرف چھ بار ہوا تھا۔ اور ساتویں یعنی آخری بار جوالا نے یونہی جلد بازی میں کوئی اوٹ پٹانگ دوائی پھانک لی تھی جس کی وجہ سے اس کی صحت کافی دیر تک بہت ڈانواڈول رہی تھی۔ اور وہ پورا ایک مہینہ اس کے لئے روز آدھ سیر دودھ اپنی آنکھوں کے سامنے نکلوا کر لاتا رہا تھا۔

جب بھی یہ بات چھڑتی جوالا پہلے تو ضد کرتی "ہٹو بھی مان جاؤ۔ ساتویں بار بھی بچہ ہو گیا تھا پورے دو مہینے اوپر ہو گئے تھے۔" رام نواس کہتا "کیسے ہو سکتا ہے۔ دو مہینے پہلے بیمار ہو گئی تھی۔" جوالا کہتی "یہ تو تم جانو مجھے تو یہ یاد ہے کہ پورے دو مہینے بعد میں نے وہ دوا ....." اور بات کو بیچ میں کاٹ کر رام نواس کہتا "دوائی کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ گر ہو بھی گیا تھا تو آفت کون سی .....؟" اور اس پر جوالا اکثر ہنس دیتی۔ اور رام نواس کی تیوریاں بھی سمٹ کر غائب ہو جاتیں۔ اور وہ ہنس کر کہتا "کیوں؟ اگر ساتوں کے ساتوں زندہ رہتے تو ایک سیڑھی سی بن جاتی" اور اس پر میاں بیوی دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور انہیں ہنستا دیکھ کر تیسری کھاٹ پر گتھم گتھا لیٹے ہوئے تینوں بچے بھی ہنسنے لگتے۔ اور انہیں دیکھ کر میاں بیوی اور ہنستے اور کافی دیر تک ہنسی کی لہریں اٹھتی مٹتی رہتیں۔

"ہنسی ہر مرض کی دوا ہے" رام نواس اکثر یہ مقولہ دہرایا کرتا۔ لیکن جس گہرائی اور بھرپوریت سے ان کی ہنسی پھوٹتی اسے دیکھ کر گمان یہی ہوتا تھا کہ وہ مقولہ ہنسی سے پیدا ہوا ہے نہ کہ ہنسی مقولے سے۔ بہرحال دونوں میاں بیوی بات بات پر ہنستے۔ ان کی ہر بحث تکرار کا خاتمہ ہنسی پر ہوتا۔ بس تفرقات کا قلع قمع ہنسی سے کیا جاتا۔ ہونٹ بھینچے تو ضرور۔ مگر ہمیشہ اس سنجیدہ و بھنچاؤ کی گرفت سے اچانک کوئی مسکراہٹ بھاگ نکلتی۔ بات سے بات ٹکرا ہی جاتی تو اس میں ہنسی کی چنگاری ہی اٹھتی۔
رام نواس ایک دفتر میں چپراسی تھا۔ تنخواہ وہی تھی جو چپراسیوں کی ہوتی ہے لہٰذا ہاتھ اکثر تنگ رہتا۔ اور اس کے ماتھے پر شکن پڑتی رہتی۔ اور اس کی بیوی جوالا کی پیشانی پر سائے منڈلاتے رہتے۔ مگر شکن مٹ ہی جاتی اور سائے ہٹ ہی جاتے۔ کیونکہ رام نواس کی ہنسی جب بجلی کی طرح کوند جاتی تو وہ سائے کانپ اٹھتے۔ اور جوالا جب ہنستی تو یوں لگتا جیسے چاندی کی گھنٹیاں دفعتاً بج اٹھی ہوں۔ اور شکن ٹوٹ ٹوٹ پڑتی۔ دانت کِل کِل کی نوبت ان کے درمیان شاذ ہی آتی۔

ان کے تین بچے سیڑھی تو نہیں تھے۔ مگر سیڑھی کا حصہ ضرور تھے۔ ان کے قد میں صرف دو دو   کا فرق تھا۔ جیسے بڑا دھرمو سات آٹھ سال کا تھا۔ اور اس سے چھوٹا کشنو پانچ چھ سال کا اور اس سے چھوٹی منیا تین چار سال کی۔ ان کی کوٹھڑی کے ساتھ ہی ایک بہت وسیع میدان سا تھا۔ وہ دن بھر وہیں کھیلتے رہتے۔ بھوک لگتی تو گھر لوٹ کر ایک سر سے روٹی مانگتے۔ اور جوالا اکثر انہیں گالیاں دینے کی بجائے روٹی ہی دیتی۔ اگر انہیں بھوک زیادہ لگی ہوتی تو وہ اپنے حصے میں سے کچھ نکال کر انہیں دے دیتی اور خود پانی کے دو گلاس زیادہ پی لیتی۔ جب سے منیا چلنے پھرنے لگی تھی جوالا نے گھر سے کچھ دور دو تین گھروں میں برتن صاف کرنے کا کام ڈھونڈ لیا تھا۔ اور اس کی تنخواہ رام نواس کی کمائی کے ایک تہائی کے قریب جا پڑتی۔ اور مل ملا کر ان کی تنخواہ ستر کے بہت قریب پہنچ جاتی۔ پھر بھی خرچ تو ہاتھ کھینچ کھینچ کر ہی کرنا پڑتا۔ کیونکہ بقول رام نواس ہر چیز سونے کے بھاؤ بکتی تھی۔

ساری گرمیاں قریب قریب ننگے بدن کٹ جاتیں۔ جوالا نے ان تینوں کو لکیردار کپڑے کے دو دو کچھے سی دیے تھے۔ جن کی لکیریں روز اس وسیع میدان کی گرد کے نیچے غائب ہو جاتیں۔ جب بارش ہوتی تو بچے وہ کچھے بھی اتار کر پھینک دیتے۔ اور دن بھر بارش میں نہاتے رہتے۔ اور اگر خوش قسمتی سے بارش موسلا دھار ہو جاتی اور ان کے گھر کے سامنے سے میدان پانی کا دریا بہنے لگتا۔ تو وہ اس میں تیرتے رہتے۔ ایک دوسرے پر پانی اچھالتے رہتے۔ اور اگر پانی کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا تو دھرمو منیا کو اپنے کندھے پر بٹھا کر پانی میں اتر جاتا۔ اور منیا کندھے پر بیٹھی اس کے سر کو تھامے چیخیں چلاتی رہتی۔ اور جب کبھی وہ مٹی سے لت پت

رام نواس کی گود میں اوندھے منہ گر کر تے تو رام نواس اُن کی ننھی پیٹھوں کو تھپتھپاتے ہوئے بھول جاتا کہ اُن کی پیٹھیں ننگی ہیں۔

سردیوں کے لئے جوالا نے بچّوں کے لئے روئی دار واسکٹیں بنا رکھی تھیں۔ دھرمو کی دونوں پرانی واسکٹیں منیا کے اور کشنو کے کام آگئی تھیں۔ واسکٹوں میں جگہ جگہ پر سوراخ تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر جوالا انہی سوراخوں سے روئی نکال نکال کر بچوں کے کانوں میں تیل کے کپڑے ٹھونسی رہتی۔ برسات کے دنوں میں اُن کے بھورے بھنسیوں کو چیرتی رہتی۔ اور جب کھیل کود میں اُن کے گھٹنے زخمی ہو جاتے تو جوالا انہی واسکٹوں سے ہی روئی نکال نکال کر ہلدی اور تیل کے پھاہے اُن زخموں پر رکھتی رہتی۔ اور ایک بار سردیوں کے شروع میں جب اُس نے دیکھا کہ دھرمو کی واسکٹ کا ایک حصہ روئی سے بالکل خالی ہو گیا ہے تو اُس نے اپنے منہ بھینچے لحاف سے کچھ روئی نکال کر اُس میں ٹھونس دی تھی۔ اور اُسے اوپر سے سی دیا تھا۔

گھر کے پاس والے وسیع میدان سے بچّوں کو عجیب و غریب چیزیں ملتی تھیں۔ شیشے کا ایک تکونا ٹکڑا، السٹریٹڈ ویکلی کی کچھ تصویریں، کئی دانت ٹوٹی کنگھیاں، سگریٹ کی بے شمار ڈبیاں، ٹوٹی پھوٹی خالی شیشیاں، رنگ برنگے چیتھڑے، فلمی گانوں کے چھوٹے چھوٹے پمفلٹ، لوہے کی پتریاں اور کابلے، کریم کی خالی شیشیاں، پوڈر کے ڈبے اور ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ بچوں نے گھر کے ایک کونے میں جمع کر رکھا تھا۔ اور جب کبھی اُن چیزوں کے بٹوارے پر وہ آپس میں جھگڑ پڑتے تو دھرمو اپنے حصّہ کی سب چیزیں منیا اور کشنو کے درمیان بانٹ دیتا۔ اور وہ دونوں اپنی چیزیں علیحدہ علیحدہ کونوں میں رکھ کر نئی چیزوں کی کھوج میں نکل جاتے۔ اور جب واپس گھر لوٹتے تو وہ الگ الگ حصّے پھر سے یکجا ہو جاتے۔ اور رات کو روٹی کھا کر اپنے نئے ڈھونڈ نکالے ہوئے کھلونوں کی باتیں کرتے کرتے اونگھ جاتے اور پھر ایک دوسرے سے چمٹ کر سو جاتے۔ اور اگر کبھی جوالا کو پیار آ جاتا تو وہ اُٹھ کر باری باری اُن تینوں کا مُنہ چوم لیتی۔ اور رام نواس ہنس کر کہہ دیتا "سو نے بھی دو بے چاروں کو"

منیا کو گڑیا کا شوق تھا۔ اور اُس کی دیکھا دیکھی کشنو بھی الگ گڑیا کی مانگ کرنے لگتا۔ اور جوالا کام سے واپس لوٹتے وقت کسی درزی کی دکان سے کچھ کترنیں مانگ لاتی۔ اور کچھ اچھے اچھے ٹکڑے بچوں کے اپنے عجائب گھر سے نکال کر راتوں رات چھوٹی بڑی گڑیائیں بنا ڈالتی۔ اور جب منیا اور کشنو صبح سویرے اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھولتے تو اپنے پہلو میں دو نئی گڑیائیں دیکھ کر اُچھل پڑتے۔ کشنو کہتا "میری ہے" منیا کہتی "یہ میری ہے" اور دونوں اپنی اپنی گڑیا کو گود میں لے کر ناچنے لگتے۔ انھیں چومتے جاتے۔ اور جب وہ رونے لگتیں تو انھیں چپ کراتے۔ اور انھیں اس طرح خوش دیکھ کر جوالا اور رام نواس ایک تبادلۂ نگاہ کے بعد مسکرا دیتے۔

دھرمو بڑا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا بھی تھا۔ اس لئے اُسے گڑیاؤں میں زیادہ لطف نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ پتنگ کے لئے ضد کرتا تو رام نواس ویکلی کے کسی کاغذ کو کاٹ چھانٹ کر اُسے ایک پتنگ بنا دیتا۔ اور جوالا اُسے دس بارہ گز گولی کا تاگہ دے دیتی۔ اور دھرمو دیر تک اُس پتنگ کو ہوا میں اُڑانے کی کوشش کرتا رہتا۔ ایک سرے سے تاگہ پکڑ کر بے تحاشا دوڑنے لگتا۔ اور بیچاری پتنگ اُس کے پیچھے پیچھے ناک رگڑتی ہوئی گھسٹتی رہتی اور دھرمو چلا چلا کر دُنیا بھر کو دعوتِ نظارہ دیتا۔ "دیکھو میری پتنگ آسمان پر اُڑ رہی ہے"۔

یا پھر دھرمو کو کتّوں کا شوق تھا۔ وہ جانے کہاں سے ہر دوسرے تیسرے روز کوئی نیا پِلّہ پکڑ لاتا۔ اُس کے گلے سے رسّی باندھ کر اُسے اِدھر اُدھر گھسیٹتا رہتا۔ اُسے نئے نئے نام دیتا۔ کشنو اور منیا کو ڈراتا۔ ڈرا کر ہنستا۔ جوالا روٹی پکا رہی ہوتی۔ اور وہ پِلّے کو اُٹھا کر دبے پاؤں پیچھے سے جا کر اُسے جوالا کی گود میں پھینک دیتا۔ اور جوالا چونک کر کہتی "بیٹا تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا"۔ رام نواس سے تقاضا کرتا کہ وہ اُسے چمڑے کا پٹہ لا دے۔ اور جب رام نواس ہنس کر کہتا "بیٹا پٹہ ڈالنے سے تو بیچارے کا دم گھٹ جائے گا" تو دھرمو فوراً اپنی مانگ واپس لے لیتا۔ دو تین دن کے بعد جب پِلّے کا ڈر اُتر جاتا تو وہ بھی بچّے سے کھیلنے لگتی۔ اور اُس کی خواہش یہ ہوتی کہ وہ پِلّے کی پیٹھ پر سوار ہو کر سارے شہر کی سیر کرے۔ اور دھرمو رو کر جوالا سے کہتا "ماں دیکھو میرے ڈبو کو مار رہی ہے"۔

اور کبھی کبھی رام نواس بچّوں کو گھمانے کے لئے باہر بھی لے جاتا۔ اگر جوالا فارغ ہوتی تو وہ بھی اُن کے ساتھ چل پڑتی۔ اور وہ اُس وسیع میدان کو پار کر کے ایک پارک میں جا بیٹھتے۔ پارک میں بیسیوں چھابے والے بیسیوں چیزیں بیچ رہے ہوتے۔ اور رام نواس بچّوں کو کچھ نہ کچھ لے دیتا۔ دھرمو اپنے حصّے کا چیزیں کچھ نکال کر اپنے پلّے کو پیش کرتا۔ اور اگر پلّا کھانے سے انکار کر دیتا تو ماں باپ سے کہتا "آپ لوگ آنکھیں بند کریں تو کھائے گا"۔ کشنو اور منیا اپنی اپنی گڑیا کو وہ چیز سُنگھاتے۔ اور جب چیز نیچے گر پڑتی تو دونوں چِلّا کر کہتے "گڑیا نے اچھا نہ کھایا"۔ کئی بار بچّوں کو پارک کی پرلی طرف والے کشادہ بازار میں لے جا

سے گذرتا۔ اور جب بچے قدم قدم پر ٹھٹکنے لگتے تو وہ کہتا "بیٹا، دیکھو کیا ہے" او بچے اُس کی طرف دیکھ کر کہتے "کہاں بابا" اور رام نواس آسمان کی طرف اشارہ کر دیتا۔ اور بچوں کو آسمان میں کوئی نہ کوئی چیز ایسی نظر آ ہی جاتی جسے دیکھ کر وہ زمین کی بات بھول جاتے۔ اور جب اُن کی نظر پھر واپس لوٹنے لگتی تو رام نواس ہوائی جہاز کی بات شروع کر دیتا اور بچوں کی گردنیں اوپر ہی کو اُٹھی رہتیں اور رام نواس بازار کی حدود (فینچ) سے باہر نکل جاتا۔ اور بچے گھر پہنچنے تک ہوائی جہازوں کے بارے میں ہی سوال کرتے رہتے۔ اور منیا بار بار کہتی "میری گڑیا بڑی ہو کر ہوائی جہاز پر چڑھے گی۔"

ایک دن دھرمو، منیا اور کرشنو دوڑتے دوڑتے ماں کے پاس آئے۔

"ماں دیکھو میدان میں کیا ہو رہا ہے۔"

"ماں دیکھو وہاں کتنے لوگ جمع ہوئے ہیں۔

"ماں دیکھو تو اتنی بڑی بڑی موٹریں کھڑی ہیں۔"

اور ماں کو یہ اطلاع دے کر بچے پھر بھاگ کر میدان میں جا پہنچے۔ میدان کے بیچ بیچ جگہ صاف کر کے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ اور میدان کے چاروں طرف کاریں ہی کاریں نظر آ رہی تھیں۔ اور تینوں بچے دوسرے بہت سے بچوں کے ساتھ پہلے تو اُن کرسیوں کا طواف کرتے رہے اور جب اُن کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے آنکھیں نکال نکال کر انھیں یقین دلا دیا کہ وہ وہاں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ تو وہ آس پاس کھڑی کاروں کا معائنہ کرنے لگے۔ ہر کار کو آگے سے پیچھے سے دیکھتے۔ ڈرائیوروں کی نظر بچا کر اُس کے ٹھنڈے اور چکنے جسم پر ہاتھ پھیرتے۔ اور منیا نے تو کئی بار کار کے اندر گھس کر بیٹھ جانے کی بھی خواہش کی۔ اور دھرمو کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اگر اُسے کار چلانے کا طریقہ معلوم ہوتا تو وہ سب کاروں میں ایک دم بیٹھ کر بھاگ جاتا۔ اور اس طرح دیکھتے دیکھتے وہ ایک بہت بڑی کار کے پاس آ کر رکے جس میں دو بچے بیٹھے تھے۔ اور کار میں سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ اور دھرمو سے بھی ایک بڑے لونڈے نے آہستہ سے کہا "سالوں نے کار میں بھی باجہ لگا رکھا ہے"۔ اور دھرمو نے جواب دیا۔ "باجہ نہیں ریڈیو ہے"۔ اور پھر سب بچے کار کے چاروں طرف گھیرا کر کھڑے ہو گئے۔ کار کے اندر بیٹھے ہوئے دونوں بچے پہلے تو اُن سب کا منہ چڑاتے رہے اور جب گھبراہٹ ہونے لگا تو وہ یکایک اونچی آواز سے یوں رونے لگے کہ سب بچے ڈر کر بھاگ گئے۔

اُس دن وہ وسیع میدان نیلام ہو گیا۔ اور اُس رات دھرمو، کرشنو اور منیا بہت دیر تک رام نواس اور جوالا کو اُس نیلام کے بارے میں قصے سناتے رہے۔ منیا بار بار کہتی "بابا بہت بڑی موٹر تھی وہ" اور دھرمو بار بار پوچھتا "بابا موٹر کے اندر بھی ریڈیو لگ سکتا ہے" اور کرشنو نے کہا "ماں اُس موٹر میں جو بچے تھے نا وہ ہمیں دیکھ کر یونہی رونے لگے" "اور انھیں روتا دیکھ کر ہم ڈر گئے ماں" اور بھاگ گئے۔ بھاگتے بھاگتے میں گر پڑا۔ یہ دیکھو میرا گھٹنا.....؟" اور جب جوالا نے پوچھا "تم ڈر کیوں گئے دھرمو تم تو بڑے ہو" تو کچھ لمحوں کے لئے بچے خاموش ہو گئے۔ اور پھر دھرمو نے کہا "ماں وہاں جو عورتیں آئی تھیں نا وہ سب کی سب موٹی بھینس [illegible] اس پر جوالا اور رام نواس ہنس پڑے تھے۔ اور آخر میں دھرمو نے کہا "بابا اُن بچوں کے پاس کچھ عجیب و غریب چیزیں تھیں"۔ اور پھر دیر تک بچے آپس میں جھگڑتے رہے کہ وہ کھلونے کیا تھے۔ اُس رات بچوں کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور جوالا نے اُٹھ کر دو بار پانی پیا۔ اور رام نواس کے خراٹے بھی کئی بار ٹوٹے۔

اس کے چند ہی دن بعد بچے پھر دوڑتے دوڑتے ماں کے پاس آئے۔

"ماں وہی موٹر آج پھر میدان میں آئی ہے"۔

"ماں بچے بھی وہی ہیں"

"ماں ایک لڑکی ہے بالکل منیا جیسی۔ اور ایک لڑکا ہے دھرمو سے ذرا چھوٹا" اور جوالا نے دور سے دیکھا کہ موٹر سے ایک عورت ..... بالکل موٹی بھینس اور ایک آدمی اور دو بچے نکل کر میدان میں گھوم پھر رہے ہیں۔ موٹی بھینس اُس آدمی کو کچھ سمجھا رہی تھی اور آدمی جھک کر بچوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور جوالا کے بچے دوڑ کر اُس بڑی موٹر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اور اب اُس کا چکر کاٹ رہے تھے۔

رات کو پھر دھرمو، کرشنو اور منیا ماں اور بابا کو بہت سی باتیں بتاتے رہے۔ اور اُن کی باتیں سن سن کر جوالا اور رام نواس ہنستے رہے۔ اور جب دھرمو نے کہا "بابا اُن کے پاس ایک بڑا زبردست کتا بھی ہے۔ اور وہ بچے اُس کتے سے بالکل نہیں ڈرتے۔ میرا ڈبو جب اُس کتے کے پاس جا کر دم ہلانے لگا تو اُس نے بھونک کر بے چارے ڈبو کو ڈرا دیا۔ اُسی وقت ڈبو نے چوں چوں کرنا شروع کر دیا۔ اور جوالا ہنس کر بولی "تمہارا ڈبو تو اُس کتے کے نام سے بھی ڈر رہا ہے"۔ اور رام نواس نے

ہنس کر کہا "نینوں میں ڈبڈبا رہا ہے میں اس کتے سے نہیں ڈرتا کیوں دھرمو" لیکن دھرمو شاید کسی اور سوچ میں تھا کہنے لگا "بابا اتنا بڑا لٹو کہاں سے ملتا ہے؟" اور یہی طرح باتیں کرتے کرتے بچے سو گئے۔

پھر اُس کے بعد وہ کار وہاں روز آنے لگی اور دنوں میں ہی سارے میدان کا حلیہ ہی بدل گیا۔ پہلے تو اُس کے گرد ایک چار دیواری ڈال دی گئی پھر اُس میں باغ لگنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بہت بڑا بنگلہ کھڑا ہو گیا۔ بچے روز رات کو جوالا اور رام نواس کو اُن بچوں اور اُس موٹی بھینس اور ان کے نئے نئے کتے، اور اُن بچوں کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کھلونوں کی باتیں سناتے سناتے سو جاتے۔ اور کبھی کبھی رام نواس جوالا سے کہتا "انہیں تو جلدی کا سودا ہو گیا ہے"۔ اور ایک دن اُس بنگلے میں بہت روشنی ہوئی۔ جوالا رام نواس اور بچے اور اُن کے آس پاس کے سبھی لوگ رات بھر اُس چکا چوند روشنی سے چندھیاتے رہے۔ اور دوسرے دن رام نواس نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اُسے ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔

دھرمو کشنو اور منیا صبح سویرے ہی آنکھیں ملتے ملتے بنگلے کے گیٹ پر جا کھڑے ہوتے۔ اور اندر لان میں جھانکتے رہتے۔ اندر دونوں بچے ہری ہری گھاس پر کھیل رہے ہوتے۔ اتوار کے دن اُن کے ساتھ اور بھی بہت سے بچے ہوتے۔ سب کے پاس پیارے پیارے کھلونے ہوتے جن میں سے اکثر کا نام بھی دھرمو کشنو اور منیا کو نہیں آتا تھا اور جب رات کو وہ جوالا اور رام نواس سے اُن نئے نئے کھلونوں کے نام پوچھتے تو کبھی کبھی جوالا جھنجھلا اٹھتی "تم سو کیوں نہیں جاتے" اور رام نواس بچوں کی آنکھ سے آنکھ نہ ملاتا۔

گیٹ پر کھڑے کھڑے بچے اُن کھلونوں کے بارے میں قیاس لگاتے رہتے۔ دھرمو تحیر آنکھوں سے کہتا "وہ موٹر دیکھی تم نے۔ ابھی وہ لے آئے چلنے کا۔ جانے سالے نے کہاں سے لی ہے"۔ کشنو کہتا "ارے ارے دیکھو وہ لڑکی کیا اٹھائے ہوئے ہے ..... کتنا بڑا غبارہ ہے" اور منیا کہتی "دھرمو مجھے غبارہ لے دو نا" لیکن اتنے میں دھرمو کی نظریں اُس زبردست گٹے پر جم گئی ہوتیں جو اپنی لمبی زبان نکالے بڑی موٹر میں بیٹھا اُن کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ وہ کہتا "اگر میرا ڈبو بھی اتنا بڑا ہو جائے تو مزہ آ جائے"۔ اور گھر لوٹ کر وہ اپنے حصّہ کی ساری روٹی توڑ مروڑ کر اپنے ڈبو کے آگے ڈال دیتا۔ اور جب ڈبو اُسے کھانے سے انکار کر دیتا تو اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا "بیٹا کھا لے دیکھتا نہیں وہ کتّا کتنا بڑا ہے"۔ کشنو اور منیا گھر لوٹ کر اپنی اپنی گڑیا کو سنوارنے لگتے۔ ماں کہتی "ماں ہماری گڑیا کے کپڑے کتنے میلے ہیں"۔ اور جوالا جاکر درزی سے کہتی "بھیا کوئی اچھی اچھی کترنیں دے دو بچوں کی گڑیا ننگا بیاہ ہے"۔ اور رات کو جب بچے سو جاتے تو وہ دیئے کی روشنی میں اُن کی گڑیا کے لئے نئے کپڑے سیتی، کالے تاگوں سے اُن کے بال بناتی۔ بچوں کے لئے راتوں رات مٹی کے کھلونے بناتی۔ گڑیا کے گھر کا سامان میں اضافہ کرتی رہتی۔ اور صبح کو اٹھ کر منیا اور کشنو اُن سب چیزوں کو دیکھ کر ناچنے لگتے۔ گڑیا کو شیشہ کا وہ ٹکڑا دکھا دکھا کر کہتے "دیکھو گڑیا ماں نے تمہیں کتنا اچھا بنا دیا ہے" اور پھر وہ اپنی اپنی گڑیا سنبھال کر اُس بنگلے کے گیٹ پر پہنچ جاتے جہاں دھرمو پہلے سے ہی اپنے ڈبو سمیت اُدھر جاکے بیٹھا ہوتا۔ لیکن جب منیا بنگلے والے بچوں کی دو فٹ بڑی گڑیا کو دیکھتی تو اُس کی آنکھیں حیرانی سے کھل جاتیں۔ اور اُس کی اپنی گڑیا سرک کر نیچے گر پڑتی اور کشنو کہتا "دیکھو منیا اُس کی گڑیا چلتی بھی ہے"۔ اور منیا کا جی چاہتا کہ گیٹ کو پھلانگ کر اندر گھس جائے اور اُس چلتی ہوئی گڑیا کو چوم لے۔

شروع شروع میں کافی دنوں تک تو دھرمو منیا اور کشنو گیٹ کے باہر کھڑے رہتے۔ گیٹ کی سلاخوں کے ساتھ چپٹے رہتے اور کبھی کبھی جب منیا اُن سلاخوں کے اندر سر گھسانے کی کوشش کرتی تو دھرمو کہتا "پھنس جائے گی منیا"۔ ایک دن منیا کا سر واقعی اُن سلاخوں میں پھنس گیا اور وہ زور زور سے چلانے لگی۔ دھرمو نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح سلاخوں کو کھینچ تان کر کھلا کر دے یا منیا کے سر کو اس طرح پچکا دے کہ وہ باہر نکل آئے۔ مگر بہت زور لگانے پر بھی بات نہ بنی تو کشنو دوڑ کر ماں کو بلانے چلا گیا۔ اتنے میں بنگلے کے اندر سے بچوں نے یہ تماشا دیکھ لیا۔ اور دوڑتے دوڑتے گیٹ کے پاس آ گئے۔ اور پہلے کچھ دیر تو ہنستے رہے اور پھر جب منیا بہت زیادہ رونے لگی تو انہوں نے زور سے زور سے آوازیں لگانی شروع کر دیں "می..... می..... می اِدھر آؤ....." اُن کی ممی دوڑی دوڑی آئیں "کیا ہے .... کیا ہے بچو .... کیا ہوا ....؟" "یہ دیکھو ممی بیچاری کا سر ....." اتنے میں جوالا بھی پہنچ گئی تھی۔ اُس نے آتے ہی منیا کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا "رو نہیں منیا۔ ہو گیا...... ابھی نکل آتا ہے ....." اور منیا روتے روتے چپ ہو گئی۔ اور آنسوؤں میں سے ہی اُن بچوں کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڑیا کو دیکھنے لگی۔ آج پہلی بار اُس نے اس دو فٹ لمبی گڑیا کو اتنے نزدیک سے دیکھا تھا۔ یہ سب شور سن کر اندر سے وہ زبردست کتا بھی باہر کو دوڑا آیا تھا۔ اور دھرمو نے پہلی دفعہ اُس زبردست کتے کو اتنے نزدیک سے دیکھا تھا۔ اور جب جوالا منیا کے سر کو سلاخوں

کی کوشش کرنے لگی اور مُنیا پھر رونے لگی تو دونوں بنگلے کے اندر والے دونوں بچے اور بھی نزدیک آ گئے۔ اور کشنو نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اُن کی چھوٹی سی موٹر کا ہارن دبا دیا۔ پوں کی آواز سُن کر وہ زبردست کتا بھونکا۔ اور کشنو ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ اور جب بڑی مشکل سے مُنیا کا سر باہر نکل آیا۔ تو بنگلے کے دونوں بچے پھر ہنسنے لگے والی حفاظت کی گڑیا کو مشکل سے سنبھالتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہوا...... اب تو نہیں گھساؤ گی اپنا سر گیٹ کے اندر" اُن کی ماں نے جیسے دھرمُو نے ہولی جیسی کو خطاب دے رکھا تھا مسکراتے ہوئے کہا "نہیں ڈارلنگ ایسا نہیں کہتے ...... چلو ... سکول کے لئے تیار ہو تمہاری موٹر آتی ہی ہوگی"۔
اور وہ دونوں بچے بنگلے کے پورچ کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ زبردست کتا اُن کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اور اُن کی ماں نے بچوں کی موٹر کو اُٹھا لیا۔ مُنیا نے رونا بند کر دیا تھا۔ اور جب جو الا نے کہا "چلو بیٹا گھر چلیں" تو مُنیا کہنے لگی "ماں تم نے وہ گڑیا دیکھی تھی۔ کتنی بڑی تھی"۔
اُس رات جب جو الا نے رام نواس کو بتایا کہ دھرمُو نے اپنے ڈبّو کو گھر سے نکال دیا ہے اور کشنو اور مُنیا نے اپنی گڑیوں کے سارے کپڑے تار تار کر کے انہیں نالی میں پھینک دیا ہے اور اُن سب نے مل کر اپنے سارے خزانے تہس نہس کر دیا ہے اور دن بھر تینوں بچے روتے بلکتے رہے ہیں۔ اور اب نیند میں بھی ٹھنڈے سانس لے رہے ہیں۔ تو رام نواس کی ہمت نہ پڑی کہ ہنس کر جو الا کے چہرہ پر سے سایوں کو پرے بھگا سکے۔

کشمیری لال ذاکر

پیاسی

حسن پورہ دہلی سے الور جانے والی سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

۱۸۵۷ء کا عظیم غدر ہوا اس وقت بھی یہ یہیں آباد تھا۔ مٹی کے کچے مکان تعداد میں جتنے ایک سو برس پہلے تھے اُتنے ہی اب بھی بلکہ کچھ کم ہی ہو گئے کیونکہ طوفان اور بارش سے جو مکان گرے انھیں دوبارہ بنایا نہیں گیا۔ جب جلیانوالہ باغ میں ہزاروں انسان گولیوں سے بھون دیے گئے اس وقت بھی حسن پورہ اسی حالت میں تھا۔ جب گاندھی جی نے نمک کا ستیہ گرہ کیا اس سمے بھی یہاں ایسا ہی سکون تھا، وہی ساہوکار کا راج اور کسان کا سوکھے پاؤں تک بہتا ہوا پسینہ۔ پر جب سن بیالیس میں انگریزوں کو نکالنے کی منظم جدوجہد کی گئی تو اس پر چھائے ہوئے جمود میں حرکت کی ایک ہلکی سی لہر تڑپ اٹھی۔ ایک صحت مند اور گٹھیلے جسم کا نوجوان اپنے تین دوستوں کے ہمراہ دہلی گیا تھا۔ اس کے دوست تو دوسرے ہی دن لوٹ آئے تھے لیکن وہ وہیں رہ گیا تھا۔ اسے ایک ٹامی کی گولی نے گھر آنے سے روک دیا تھا۔ چوک کے عین درمیان جب وہ ترنگا اوپر اٹھائے جوش سے بے خوف آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا تو ایک گولی اس کے چوڑے چکلے سینے میں آ لگی تھی۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا اور اس کا گاڑھے کا سفید کرتہ جو اسی دن دھلوا کر لایا تھا خون سے لتھڑ گیا تھا۔ اس کے دوست واپس گاؤں بھاگ آئے تھے اور وہ ابھی تڑپ ہی رہا تھا کہ اس پر پیڑول چھڑک کر اسے جلا دیا گیا تھا۔ اس کے سینے سے بہا ہوا ایک کسان کا خون کئی روز تک چوک کی چمکتی ہوئی سڑک پر جما رہا اور پاؤں تلے مسلسل روندے جانے سے آخر بالکل مٹ گیا۔

انگوری اس نوجوان کی بیوی تھی۔

اور بابو اس کا لڑکا تھا۔

انگوری کا خاوند جو خواب دیکھتا رہا تھا وہ اب پورا ہو گیا تھا۔

ہندوستان آزاد تھا۔

آزاد ہندوستان کے ایک آزاد صوبے کے گورنر ضلع میں پدھار رہے تھے۔ اور اُن کے سواگت کو ضلع کا قصبہ سجایا جا رہا تھا۔ ملک کے آزاد ہونے کے بعد گورنر صاحب پہلی بار تشریف لا رہے تھے۔ میونسپل کمیٹی کے بھنگیوں نے سڑکوں کو جیسے دھو ڈالا تھا۔ دھول سے اٹی ہوئی سڑکیں اب الھڑ دوشیزاؤں کی طرح بن سنور کر آنے والے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جگہ جگہ دروازے بنائے گئے تھے۔ کیلے کے پتے، نیم کی ٹہنیاں اور بوگن ویلیا کے سرخ سرخ پھول یوں جھول رہے تھے جیسے نرتکیاں ہاتھوں میں تازہ پھولوں کے ہار لیے دیوتا کی آمد کی منتظر ہوں۔ فٹ پاتھ جن پر سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے اب صاف کر دیے گئے تھے۔ اُن پر سرخ سرخ بجری بچھا دی گئی تھی جو لوگوں کے گذرنے سے یوں چرمراتی تھی جیسے سواگت کے گیت گنگنا رہی ہو۔ بازاروں میں جھنڈیاں لہرا رہی تھیں اور لوگوں نے رات کو چراغاں کرنے کے لیے دیے جمع کر رکھے تھے۔

سڑک کے کنارے آباد تمام گاؤں سے پرائمری اسکول بھی اُن کے سواگت کی تیاریاں کر رہے تھے۔ حسن پورہ کے ہیڈ ماسٹر نے بھی اپنے اسکول کے لڑکوں کو ضروری ہدایتیں دے دی تھیں۔ بابو نے گھر آ کر انگوری سے کہا کہ اسے ایک سفید قمیص، خاکی نیکر، گاندھی ٹوپی، سفید فلیٹ بوٹ اور ایک ترنگا چاہیے۔ ٹوپی اور بوٹ اس نے اب تک نہ پہنے تھے۔ بے چارہ ننگے پاؤں اور ننگے سر ہی رہتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ضد کرنا شروع کر دی۔ سوچا تھا کہ اس بہانے اسے نئی ٹوپی اور نیا بوٹ تو مل جائے گا۔ اس کی ایک دیرینہ حسرت تو پوری ہو جائے گی۔ لیکن انگوری کے پاس تو دو وقت پیٹ بھرنے کو بھی نہ تھا، وہ اتنی ساری چیزیں کہاں سے کر دے گی۔ جب بابو کا کرتہ کئی پیوند لگ چکنے کے بعد بھی پہننے کے قابل نہ رہتا تو وہ اسے نیا کرتہ سلوا دیتی تھی اور جب اس کی

مختصر سی دھوتی جو اس نے اپنی ہی بوسیدہ ساڑھی کو پھاڑ کر تیار کی ہوئی تھی تو ہار جانے کے قابل نہ رہتی تو وہ بابو کو اسی قسم کی ایک اور دھوتی بنا دیتی اور اب اُسے قمیص، نیکر، ٹوپی اور بوٹ سب چاہیئے تھا۔ ایک ساتھ اتنی چیزیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسکول کے اُن ہیڈ ماسٹر کو تی بھر کر گالیاں دے جن نے جان بوجھ کر اس کی غربت کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی تھی۔ انگوری کو گاؤں کا کوئی سا گوا نہ جانتا تھا۔ کبھی کبھی لگتا تھا کہ وہ زندگی کو عذاب سمجھ کر کاٹ رہی تھی۔

پھر ایک دم اُسے بابو کے باپ کا خیال آیا۔ کیس شان سے جلیانوالہ میں جیا۔ لینے کے لئے گیا تھا وہ۔ کتنا سعد مقابلہ شہید ہونے اس کے ذہن میں وہ جب کبھی اپنے خاوند کی قربانی کا خیال کرتی اس کا ماتھا بھیمان سے اونچا ہو جاتا۔ وہ ایک شہید کی پتنی تھی اور بابو ایک شہید کا اکلوتا لڑکا۔ ملک آزاد ہونے کے بعد پہلی بار گورنر صاحب ان کے گاؤں کے پاس سے گذر رہے تھے۔ بابو جس کی رگوں میں ایک شہید کا خون ہے کیوں ان کا سواگت نہ کرے اُس کو خود بھی اس تقریب میں شامل ہونا چاہیئے۔ یہ اور بات تھی کہ خاوند کے مرنے کے بعد اس کی دنیا ہی اُجڑ گئی تھی۔ جہاں وہ ایک مالکن کی حیثیت سے رہتی تھی وہیں اب اُسے دوسروں کے گھروں میں کام کر کے اپنا اور اپنے لاڈلے کا پیٹ بھرنا پڑ رہا تھا۔ صبح سویرے اُٹھ کر چکی پیسنا ہوتی تھی پھر کئی گھروں میں پانی بھرنا پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر اپنے گھر کا کام کاج کر کے شام کو پھر وہ دوسروں کے برتن مانجھنے اور دھونے میں لگ جاتی تھی۔ کئی بار بابو اسکول سے گھر لوٹتا تو اُسے خود ہی تھوڑی اَن چپڑی روٹی نکال کر کھانا پڑتی تھی۔ ماں کے پاس اتنا سمے تھا ہی کہاں جب وہ ماتھا جتا۔ یہ میں صرف کرے نیتجہ دور سے پانی ڈھو کر لانا پڑتا تھا اُسے۔ اُس کے کندھے دُکھنے لگے تھے اور اگر کوئی گھڑا پھوٹ جائے تو اُسے نیا گھڑا خرید کر دینا پڑتا تھا۔

اُس نے اچانک ہی یہ فیصلہ کیا کہ وہ نمبردار کے پاس جا کر منت سماجت کر کے بیس روپے اُدھار لے آئے اور بابو کو سب چیزیں خرید دے بلکہ اس نے تو یہاں تک سوچ لیا کہ وہ خود بھی سڑک کے کنارے کھڑی رہے گی اور گورنر صاحب کا سواگت کرے گی اور جب وہ اپنی کار سے اُتر کر بچوں کو پیار کریں گے اور انھیں مٹھائی کے لئے روپے دیں گے تو وہ بھی آگے بڑھ کر اُن کے پاؤں پر ماتھا ٹیک دے گی اور کہے گی "ان داتا میرا پتی بھی آزادی کی جنگ میں لڑتے لڑتے مارا گیا ہے۔ یہ بچہ اُسی کا نام لیوا ہے۔ میں اس کی پرورش کی خاطر جان جوکھوں میں ڈال رہی ہوں —— اور پھر وہ اُسے کیس سرکاری آفر میں چلنے کو کہیں گے اور بابو کی تعلیم کا خرچ سرکار کے ذمے ہو گا۔ اس کا لاڈلا پڑھ لکھ جائے گا اُس کے دن بھی پھر یں گے —— اس خیال سے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ہنسی کی لہریں اُبھر آئیں۔ وہ اپنی پھٹی ہوئی اوڑھنی کو سنبھالتے ہوئے نمبردار کے گھر کی طرف چل پڑی۔

"مجھے بیس روپوں کی ضرورت ہے نمبردار جی" اُس نے گھونگٹ کھینچتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"بیس روپے! کیا کرو گی اتنی بڑی رقم؟" نمبردار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بابو کے کپڑے سلانے ہیں" اُس نے جواب دیا۔

"اب تو چھوراشہزادہ بن رہیا ہے، کیوں انگوری؟" نمبردار کا بھیانک قہقہہ انگوری کے دل میں بھالے کی طرح اُترنے لگا۔

"گورنر صاحب کا سواگت جو کرنا ہے۔"

"گورنر کا سواگت خوب —— میری بات مان جاؤ انگوری، ہزاروں میں کھیلو گی" اور انگوری آج پہلی بار نمبردار کے گھنونے چہرے کو دیکھ کر مسکرائی جیسے ایک بڑا سا زخم نشتر کو دیکھ کر مسکرا اُٹھے۔ نمبردار نے دس دس کے دو نوٹ تھماتے ہوئے انگوری کے ہاتھ کو زور سے دبا دیا اور انگوری نے سمیں کی طرح اُسے گالیاں نہیں بلکہ خاموش رہی۔ اب وہ گورنر صاحب سے اپنی دُکھ بھری کہانی کہے گی اور وہ اُسے سدا کے لئے اس دوزخ سے نکال کر اُس پر جنت کے دروازے کھول دیں گے۔ چند ہی گھنٹوں کی تو بات تھی۔ نمبردار اپنی کامیابی پر مسکرایا اور انگوری کانپتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دی۔

بابو اسکول سے گھر آچکا تھا اور اکیلا بیٹھا رو رہا تھا۔ ماں کو دیکھتے ہی چیخا "اماں میری قمیص، نیکر، ٹوپی اور بوٹ؟"

انگوری کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے پر اُس نے مسکرانے کا جتن کیا اور دو نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی شہر جاتی ہوں تمہارے لئے سب چیزیں خریدنے کے لئے۔"

کچھ ہی دیر کے بعد جون کی آگ اُگلتی ہوئی دوپہر میں انگوری شہر کی طرف چل پڑی۔ پیاس کے مارے اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ لُو کے تھپیڑے اُسے نڈھال کر رہے تھے۔ پھٹی ہوئی اوڑھنی میں وہ آگ میں تپائے ہوئے بھالوں کی طرح اس کے جسم سے ٹکراتے تھے۔ اُس کے پاؤں کے تلوے سڑک پر

بکھری گرم گرم دھول سے جھلس رہے تھے لیکن ایک ہی جذبہ! ایک ہی خیال! ایک ہی اُمید اُسے آگے بڑھائے جا رہی تھی صوبہ کا گورنر اُس کے بچے کو پیار کرے گا۔ ایک یتیم بچے کو پچکارے گا اور وہ اپنی رام کہانی اُس سے کہے گی اور اُس کا جیون سنور جائے گا۔

دوپہر میں شہر پہنچی۔ شہر تو یوں سجا تھا جیسے آسمان سے دیوتا اُتر آئے ہوں۔ پھول ہی پھول۔ خوشبو ہی خوشبو۔ جھنڈیاں ہی جھنڈیاں اور درجنوں سبیلیں۔ اُس نے ایک سبیل سے برف کا ٹھنڈا پانی پیا اور اُس کے جلتے ہوئے جسم میں گویا ٹھنڈک رچ گئی۔ اس کا دماغ اس خنکی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ ایک بزاز کی دوکان کی طرف بڑھی لیکن اچانک ہی اس کی نظر ریڈی میڈ خاکی نیکروں اور سفید قمیصوں پر جا پڑی جو سامنے کی دوکان میں لٹکی تھیں۔ اُس نے سوچا کپڑا خرید کر بھی تو درزی کی ہی منتیں لینی پڑیں گی اور گورنر صاحب تو کل ہی آ رہے تھے۔ شام تک کیسے سل سکے گی نیکر اور قمیص۔ اُس نے سیلے سلائے کپڑوں میں سے بابو کے لئے ایک نیکر اور قمیص چن لی اور جب دکاندار نے دونوں چیزوں کو کاغذ میں تہ کر کے اور اُس کے اوپر سفید ڈوری لپیٹ کر اُس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ سا پکڑا دیا تو وہ اپنی جگہ سے جیسے ایکدم اُوپر اُٹھ آئی۔ کئی سالوں کے بعد پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ وہ بھی عزت سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پورے بازار کا ایک چکر لگائے پھر اُسے کب ایسا موقع ہاتھ آئے گا۔ وہ آگے بڑھی اور بوٹوں کی ایک دوکان سے اُس نے دس آنے کا فلیٹ بوٹ بھی لے لیا۔ اور پھر کھدر کی ایک گاندھی ٹوپی بھی اور پھر ایک ترنگا بھی۔ سینکڑوں ترنگے بازار میں لہرا رہے تھے۔ کتنا عجیب سماں تھا۔ دن ڈھلنے کو تھا اور اُس نے یوں ہی پاگلوں کی طرح بازار میں گھومنے میں بہت سے منٹ کر دیا تھا اور جب وہ بازار سے نکل کر شہر سے باہر جانے لگی تو اُس کے دل میں چبھن سی ہو گئی۔ اُس کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہ اس جنت سے باہر نکلے۔ جانے سے پہلے اُس نے بابو کے لئے تیل میں تلی ہوئی میٹھی سیونیاں لے کر پلو میں باندھیں اور خود ایک سبیل سے جی بھر کر ٹھنڈا پانی پیا۔ پھر جب وہ اپنے گاؤں کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر پہنچی تو ایک لمحہ کے لئے رک گئی۔ اُس نے ایک آخری حسرت بھری نظر شہر کی رونق اور تیل میل پر ڈالی اور اپنی راہ ہو لی۔ کاغذ کے اُس پیکٹ کو اُس نے یوں سینے سے لگا رکھا تھا جیسے کوئی نہایت قیمتی خزانہ سنبھال کرلے جا رہی ہو۔ آج اُس نے گھروں میں پانی بھی تو نہ بھرا تھا۔ برتن بھی نہ مانجھے تھے۔ بنیئے کے کپڑے بھی نہ دھوئے تھے۔ اُس کا دل ایک لمحہ کے لئے بیٹھ گیا۔ اگر انھوں نے اُسے کل جواب دے دیا تو پھر وہ کیا کرے گی؟ کہاں جائے گی؟ بابو کا کیا ہوگا اور فوراً ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے گورنر صاحب کی خیالی تصویر گھوم گئی جو اُسے اس ذلیل زندگی سے سدا کے لئے نجات دلا دیں گے۔ صرف چند ہی گھنٹوں کی تو بات تھی اور جب وہ گھر پہنچی تو بے حد تھکن اور شانت تھی۔ بابو اُس کی راہ دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا اور اُن گھروں سے جن میں وہ کام کرتی تھی کئی بلاوے آ چکے تھے۔

اُس نے بابو کو جگایا۔ وہ بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر اُس نے چراغ جلایا۔ چراغ کی مدھم سی روشنی میں گھر کی تاریکی اجالے کی آغوش میں سسکنے لگی۔

"میں تمہاری سب چیزیں لے آئی ہوں میرے لال" اُس نے ایکدم سب چیزیں کھول کر اپنے بیٹے کی جھولی میں ڈال دیں۔

"تو بڑی اچھی ہے اماں" بابو اس سے چمٹ گیا اور انگوری کی پلکوں پر ممتا کی شبنم کانپنے لگی۔

انگوری نے اُسے سارے کپڑے پہنائے۔ گاندھی ٹوپی اُس کے سر پر رکھی سفید بوٹ کے تسمے باندھے اور اُس کے ہاتھ میں ترنگا تھما دیا۔

"کتنا اچھا لگتا ہے میرا بیٹا" انگوری نے اُس کا ماتھا چوم لیا۔

" اماں میں وہ گیت سناؤں جو ہم نے کل گانا ہے" بابو نے خوش ہو کر کہا۔

" ہاں ہاں ضرور سناؤ" انگوری کا رنگ رنگ متحرک اٹھا۔ آج پہلی بار اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماں کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔

" کوئی بھوکا نہ رہے گا، کوئی ننگا نہ رہے گا۔

دیش اب آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے "

بابو کی معصوم آواز اندھیرے اور اجالے کے الجھاؤ میں گونجی۔

انگوری دیوار کے ساتھ بیٹھے ٹکٹکی اُس ترنگے کو دیکھ رہی تھی جسے بابو نے دائیں ہاتھ میں اونچا پکڑ رکھا تھا۔

" آج کام کرنے نہیں آئی تو گھر میں پانی کا ایک گھونٹ نہیں" کواڑ کھٹ سے کھلا اور رامو مہاجن کی بیوی کی آواز کڑکی۔

" میں ذرا شہر چلی گئی تھی جی" انگوری نے عاجزی سے کہا۔

"اب چار پیسے ہو گئے ہیں تو رانی بننے لگی ہو، کیا ٹھاٹھ ہیں لونڈے کے" کینہ صاحب کی بیوی نے کہا۔
"چپ چپ" انگوری بھڑک اٹھی اُس سے اتنا اپمان نہ سہا گیا۔ آج کی رات اس جہنم میں آخری رات تھی۔ کل تو جنت کے دریچے اُس پر کھل جائیں گے۔
"چل نکل یہاں سے"——— بجاجنائن چیخی اور انگوری نے اُسے بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ یہ سب جیسے اُس نے نیند میں کر ڈالا تھا۔
کچھ دیر گم صم پڑے رہنے کے بعد وہ اُٹھی، پلو میں بندھی ہوئی تیل کی سویاں لے کر ایک طشتری میں ڈالیں۔ وہ چاہتی تھی کہ بابو کو کچھ کھانے کو دے لیکن وہ نئے کپڑے پہنے ہی سو گیا تھا۔ انگوری نے اُسے جگایا نہیں۔ اُس نے اپنی جگہ سے سکا ہوا چھپر اور میلی دھوتی اتاری اور دونوں کو دھو کر الگنی پر ڈال دیا۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہوں تو کیا اُجلے تو ہونے چاہئیں۔ ایک شہید کی بیوہ گورنر کا میل سے اٹے ہوئے چیتھڑوں میں کیسے سواگت کرے گی۔
انگوری کھاٹ پر گر پڑی۔ وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی لیکن آنے والی صبح کے سندر سپنے بڑے پرکشش تھے۔ وہ دیر تک انہیں میں کھوئی رہی اور جانے کس وقت اُسے نیند آگئی۔

صبح وہ جلد ہی اُٹھ بیٹھی۔ قریب کی چارپائی پر پڑے بابو پر اُس نے نگاہ ڈالی۔ ڈوبتے ہوئے چاند کی روشنی اُن کے آنگن میں بکھر رہی تھی۔ اُس ملگجے اُجالے میں اُس نے بابو کو نئے کپڑوں میں ملبوس لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک بندگی کی طرح محوخواب تھا۔ اُس نے اُس کے گالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہاں سے اُٹھ کر وہ چکی کے پاس جا بیٹھی۔ چکی کو پونچھ رہی تھی کہ اُسے خیال آیا اس کی گھر گھر سے بابو کی نیند خراب ہو گی۔ حالانکہ اسی گھر میں تاروں کی چھاؤں میں روز چکی پیستی تھی اور بابو کھری چارپائی پر پڑا رہتا تھا لیکن آج تو اُس نے گورنر کا سواگت کرنا تھا۔ آج اُس نے اُن پھولوں کو دیکھنا تھا جو اُس کے شہید خاوند کے خون کے قطروں سے کھلے تھے۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ آج وہ چکی نہ پیسے گی۔ اب وہ کبھی چکی نہ پیسے گی۔ چند گھنٹوں کے بعد اس کی زندگی اس تنگ اور دشوار گزار راستے کو چھوڑ کر پھولوں بھری پگڈنڈی پر گھومے گی۔ اُس نے پچھلی صبح کا بھرا ہوا پانی بالٹی میں انڈیلا اور نہانے لگی۔ سرد پانی کے چھینٹے اس نے اپنے چہرے پر لگائے اور اپنے جوان گدرائے ہوئے جسم پر چپکتی سی نظر ڈالی جیسے وہ اپنا نہیں کسی غیر کا جسم چوری چھپے دیکھ رہی ہو۔
اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کی نظروں کے سامنے نمبردار کا مکروہ چہرہ گھوم گیا اور اُس نے یکدم بالٹی کو اُٹھا کر اپنے اوپر انڈیل لیا جیسے اس اسنگت خیال کو وہ تیز دھارے میں بہا دینا چاہتی ہو۔ پھر اُس نے رات کی دھوئی ہوئی ساڑھی کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اُلجھے ہوئے بالوں میں تیل لگایا اور اُن میں کنگھی کی۔ اس سے فارغ ہو کر اُس نے بابو کو جگایا۔ اُسے کپڑے دھونے والے صابن سے مل مل کر نہلایا۔ اُس کے بالوں کو سجایا، آنکھوں میں کاجل ڈالا۔ اور نئے کپڑے پہنا کر اُسے تیار کر دیا۔ بابو اپنی اس کایا کلپ پر اترا اُٹھا۔ وہ ترنگا ہاتھ میں لئے اپنے تنگ آنگن میں اکڑ اکڑ کر چلنے لگا۔ انگوری ایک طرف کھڑی اُسے پیار سے دیکھ رہی تھی۔

جب سورج کی پہلی کرنیں گاؤں میں پھیلیں تو ماں بیٹا دونوں گورنر کے سواگت کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہیں سے کچھ پھول مل جاتے تو ایک ہار تیار کر لیتی آزاد ہندوستان کے دیوتا کے گلے میں ڈالنے کو۔ اب اس حالت میں صبح صبح وہ جائے بھی کہاں۔ کئی برسوں سے لوگ اُسے ایک میلے اور پھٹے ہوئے لباس میں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اُسے خود جھجک ہو رہی تھی اس طرح باہر جانے میں۔ دو ایک گھروں میں پانی بھی بھرنا تھا۔ اُس نے سوچا بابو کے جانے میں بہت وقت ہے۔ پانی بھی بھر آؤں اور چودھری کی پھلواڑی سے پھول بھی توڑ لاؤں۔ اور وہ ڈیوڑھی سے باہر نکلی تو یوں شرما رہی تھی جیسے کوئی نئی نویلی دلہن سسرال کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے سہم رہی ہو۔ گھر سے باہر نکلتے ہی اُس نے پانی بھرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ اب پانی نہ بھی بھرا تو کیا ہے۔ ساری عمر پانی ہی تو بھرا ہے۔ آج نہیں بھروں گی۔ آج میرا جیون بدلنے والا ہے۔ وہ گاؤں کی تنگ تنگ گلیوں میں سے گھونگھٹ کاڑھے گزر گئی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد پھول توڑ کر واپس آگئی۔ کچھ لوگوں نے اُسے دیکھا اور حیران ہوئے۔ نمبردار نے بھی اُسے اپنے مکان کی ڈیوڑھی سے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے من ہی من میں سمجھا کہ اب اس کی تپسیا سپھل ہونے والی تھی۔

انگوری نے ہار تیار کر کے اپنے پلو میں باندھ لیا۔ بابو کو ستو گھول کر پلائے اور اُسے اسکول بھیج دیا۔ خود وہ چھت پر چڑھ گئی۔ اُس نے دیکھا لڑکے اسکول کے سامنے جمع تھے اور قطاروں میں کھڑے ہو رہے تھے۔
"آزاد ہندوستان زندہ باد"

یہ نعرے گونجنے لگے۔ اور اس کے دل میں جیسے جوش اور خوشی کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا۔ لڑکے نعرے لگاتے ہوئے سڑک کی طرف چل پڑے۔ اُن کے اُستاد بھی ساتھ تھے۔ وہ بھی مکان کے پچھواڑے سے نکل کر گاؤں کے باہر ہی باہر گھومتی ہوئی سڑکوں کے جلوس کے قریب پہونچ گئی۔ اُس نے دیکھا پاگو سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس کا ترنگا سب سے بڑا تھا اور اُس نے اُسے سب سے اونچا اُٹھا رکھا تھا۔ اس کی آواز سب سے زیادہ اونچی تھی۔ اُس کے کپڑے سب لڑکوں سے زیادہ صاف تھے اور اس کے لباس میں ایک خاص تناسب تھا۔ کسی لڑکے کی قمیص صاف تھی تو نیکر میلی تھی۔ کسی نے دُھلی ہوئی نیکر پہن رکھی تھی تو قمیص گندی تھی۔ کوئی سر ننگا تھا۔ دو چار تو دھوتی میں ہی آگئے تھے۔ لیکن سب ماسٹروں نے سفید قمیص، خاکی نیکریں اور گاندھی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ یا پھر ایک پاگو تھا جو ایک انفرادی شان سے چل رہا تھا۔ انگوری نے یہ سب دیکھا تو اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی بچوں کے اس جلوس میں شامل ہو جائے اور اونچی آواز سے نعرے لگائے۔

وہ جلوس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ ماں کی ممتا اپنا خنک سایہ کئے کر سورج کی تڑپتی ہوئی گرمی میں اپنے بچے کے پیچھے پیچھے رینگ رہی تھی۔ جلوس سڑک کے کنارے پہونچ گیا۔ سڑک کے کنارے آگے نیم کے درختوں کی بہت سی ٹہنیاں کاٹی جا چکی تھیں۔ درختوں کا سایہ فقط نام ہی کو تھا۔ نہ اُن کی چھاؤں میں بیٹھ کر دھوپ سے بچنا مشکل تھا۔ اُس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہیں کوئی درخت نہ تھا۔ وہ خود ایک ٹھنٹھ کے سہارے کھڑی ہوگئی۔ ماسٹروں نے لڑکوں کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا اور خود قریب ہی درختوں کے نیچے کھڑے ہو کر بیڑیاں پینے لگے۔ پاگو قطار میں سب سے آگے کھڑا تھا اور گا رہا تھا۔

کوئی بھوکا نہ رہے گا، کوئی ننگا نہ رہے گا۔

اور اُس کے پیچھے سب لڑکے گا رہے تھے

دیش اب آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے۔

دھوپ اب تیز ہونے لگی تھی۔ بچوں کے جسموں سے پسینہ بہنے لگا تھا اور اُستاد لوگ درختوں کے تنوں کے اور قریب سرک گئے تھے۔ انگوری بھی اپنی جگہ پر کھڑی تھی اور سورج کی تیز کرنوں سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"نعرے لگاؤ سور کے بچو" گنجے ہیڈ ماسٹر کی آواز گونجی

آزاد ہندوستان ——— زندہ باد

لیکن اب بچوں کی آواز میں وہ پہلی سی تازگی اور جوش نہ تھا۔

پھر کافی عرصہ خاموش رہی۔

لڑکے ادھر اُدھر جھانک رہے تھے۔ اُنھیں پیاس محسوس ہو رہی تھی اور وہ کسی کوئیں کی تلاش میں تھے۔

"یہاں کوئی کنواں نہیں، قطار سے باہر مت نکلو۔ کھڑے رہو وہیں" ایک اور ماسٹر چیخا۔

انگوری نے پاگو کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور وہ بے کل ہو رہا تھا۔ اُس نے سوچا گورنر صاحب سے ملنے پر سب سے پہلی بات وہ یہ کہے گی کہ یہاں پانی کی بہت قلت ہے۔ کھیت، ڈھور ڈنگر اور انسان سبھی پیاسے ہیں، یہاں پانی کا انتظام کرائیں۔ گاؤں میں کم از کم چار کنوئیں اور ہونے چاہئیں۔ میں یہاں نہ بھی رہوں پر میرے جیسی کئی اور بیوہ عورتیں ہیں جنھیں لوگوں کے گھروں میں پانی ڈھونا ہوتا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اُس نے ایک بار پھر اُن معصوم بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے پیاس سے تڑپنے لگے تھے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ اُن کے قریب چلی جائے لیکن وہ کسی کی نظروں میں آنا نہ چاہتی تھی۔ وہ اس درخت سے ہٹ کر ایک اور درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی جو سڑک کے ذرا زیادہ نزدیک تھا۔

"زور سے بولو حرامیو، خاموش کیوں ہوگئے" گنجا ماسٹر پھر چیخا۔

آزاد ہندوستان ——— زندہ باد

لیکن آواز جیسے حلق ہی میں اٹک رہی تھی۔

"او پاگو اونچا بول حرامی کے ———" ہیڈ ماسٹر زور سے چیخا اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کرتا پاگو ایک بار پورے زور سے

کردا جیسے وہ نہ چاہتا تھا کہ اُس کی ماں ماسٹر کے کہے ہوئے الفاظ سنے۔

آزاد ہندوستان ــــــــــ زندہ باد

اور اُس کی ماں قریب ہی ایک درخت کے نیچے کھڑی گورنر صاحب کا انتظار کر رہی تھی جو پہلی بار دھرت گدر رہے تھے اور اپنے پھولوں کے ہار کو سورج کی تپش سے بچانے کے لئے پلّو سے ڈھانپ رہی تھی۔

اور پھر انگوری نے دیکھا کچھ فاصلے پر گرد سی اُڑ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ میں ایک کار چمکی۔ ماسٹر درختوں کی اوٹ سے نکل کر دوڑ کر سڑک کے کنارے آ گئے لڑکوں کو قطار میں کھڑا کیا، خود سنبھل کر کھڑے ہو گئے اور پالو نے اپنا ترنگا سب سے اونچا اُٹھا کر گانا شروع کیا۔

کوئی بھوکا نہ رہے گا، کوئی ننگا نہ رہے گا۔

باقی لڑکے اُس کے پیچھے بول رہے تھے۔ یوں تو وہ چیخنے کی حد تک اونچی آوازیں گا رہے تھے لیکن وہ تیزی، تازگی اور جوش جو اُن کی آواز میں کچھ گھنٹے پہلے تھا اب مفقود تھا۔ دھوپ تیز پڑ رہی تھی، لو چلنا شروع ہو گئی تھی اور دھول کے تپے ہوئے ذرّے اُن کے جسموں کے ننگے رنگوں سے انگاروں کی طرح ٹکرا رہے تھے۔

کار کے آگے ترنگا لہرا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کھڑے معصوم بچّوں کے ہاتھوں میں بھی ویسے ہی ترنگے تھے۔ وہ بھی ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اُن کی آوازیں تپتی ہوئی دوپہر میں گونج رہی تھیں۔ کار قریب سے گذر گئی۔ وہ پل بھر کو بھی نہ رُکی۔ اُس کی رفتار ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ صرف دھول کا ایک بادل سا سڑک کے دونوں کناروں پر چھا گیا۔

انگوری کے ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا اور اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

ایک کار اور پاس سے گذر گئی۔

ایک اور

پھر ایک اور

اور دھول کی کئی تہیں ایک دوسرے میں گتھ کر سڑک کے دونوں کناروں پر منڈلانے لگیں۔

بچّوں کی آواز بیٹھے ہوئے گلوں سے نعروں کی شکل میں نکل رہی تھی۔ سب موٹریں ایک جیسی تھیں، کچھ بھی تو فرق نہ تھا، سب کے آگے ترنگے تھے سب میں کھدر کے کپڑے اور گاندھی ٹوپی پہنے لوگ براجمان تھے۔ گورنر صاحب جانے کس موٹر میں تھے۔ وہ کیسے پہچانے جائیں گے۔ جانے وہ رُکیں گے بھی کہ نہیں؟ دھول کے بادل میں آنکھیں ملتے ہوئے انگوری سوچے جا رہی تھی اور ہار کو دیکھ رہی تھی جس کے پھول تپش سے مُرجھا رہے تھے۔ گرمی سے اُس کا اپنا آپ بھی نڈھال ہو رہا تھا۔

اُسی سمے ایک کار اور گذری۔ اس کی رفتار بھی سب کاروں سے زیادہ تیز تھی۔ اس کے آگے سب سے بڑا ترنگا لہرا رہا تھا، اس کا رنگ سب سے زیادہ شوخ تھا۔ عین اس وقت پالو کی آواز گونجی۔

آزاد ہندوستان ــــــــــ زندہ باد

اور وہ چکرا کر تپتی ہوئی دھول پر گر پڑا۔ انگوری کی نظر غبار کے بادل کی وجہ سے کار سے ہٹ کر پالو کی طرف نہ جا سکی۔ وہ ایک لمحے وہ سڑک کے کنارے مٹی پر پڑا رہا۔ ماسٹر لوگ گھبرا گئے۔ انگوری اُس کی طرف بھاگی اور اُسے اس طرح دھول میں گرے دیکھ کر چیخ اُٹھی۔ مُرجھائے ہوئے پھولوں کا ہار اُس کے ہاتھوں سے گر گیا۔

ایک کار اور گذر گئی۔

ایک اور

ایک اور

کاریں گذر رہی تھیں بچے قطار میں خاموش کھڑے تھے۔ ماسٹر پالو کے گرد جمع تھے اور انگوری اُسے اپنی گود میں لٹائے جلتی ہوئی ریتلی زمین پر بیٹھی تھی اور اُس کے پاؤں تلے اُس کے ہاتھوں کا گجرا بچھا ہوا مسلا جا رہا تھا۔ اس بچے کو پانی کی چند بوندوں کی ضرورت تھی اور ارد گرد دھول کے گھنے بادل چھائے تھے اور جلتی ہوئی دوپہر میں کوئی پنچھی بھی فضا میں اُڑتا نظر نہ آتا تھا۔ صرف کاروں کی آواز گونج رہی تھی۔

جیلانی بانو

مٹی کی گڑیا

جلدی جلدی پوری کہانی بالکشیا کے کانوں میں انڈیل کر ملیشم نے سانس لی تو اسے چکر سا آگیا اور فرطِ مسرت سے وہ کانپنے لگا اور بالکشیا اچھل کر اپنے بیٹے سے لپٹ گیا۔

"چل جھوٹا نہیں تو — جھوٹ بول رہا ہے —" وہ اُمید و بیم کے ملے جلے لہجہ میں بولا اور ملیشم کی کمر ٹٹولنے لگا۔

"اچھا تو بتا کہاں ہیں وہ سو روپے —" اس نے دونوں ہاتھ یوں پھیلا دئے جیسے ان روپوں کا حق دار صرف وہی ہے۔ ملیشم نے جلدی سے اپنے ہاتھوں کا میل رگڑ رگڑ کے کمر سے پونچھا اور پولے پولے ہاتھوں سے دھوتی کی بندھی ہوئی گرہیں کھولنے لگا۔ بے شمار گرہوں کے بعد اس نے ایک ہاتھ سے گرہ پکڑی اور دوسرے ہاتھ میں بالکشیا کا ہاتھ تھام کے خوب اچھی طرح صاف کیا اور اپنی دھوتی میں بندھے ہوئے نوٹ کو یوں چھوا جیسے اپنے زخم کو چھو رہا ہو۔

"ہے —؟" وہ خوشی سے آنکھیں پھاڑ کے چلایا اور خوشی سے گھٹی ہوئی آواز میں بولا "پورے سو روپے کا ہے۔ چار پچیس —" ساتھ ہی اپنے ہاتھ کی چار انگلیاں پھیلا کر بالکشیا کی آنکھوں میں گھسا دیں۔ لیکن ملیشم کے اس رویے سے بالکشیا بجھ سا گیا۔

اسی وقت رات کو بھی آنا رہ گیا تھا۔ ورنہ وہ اپنے باپ کے چہرے پر پھیلے ہوئے حسد اور شکست کو کتنے مزے سے دیکھ سکتا تھا — اطمینان کی لمبی سانس لے کر وہ بالکشیا کو جلانے کے اور بہانے ڈھونڈنا چاہتا تھا لیکن اپنے سر کے اوپر درالکشمی کا سایہ دیکھ کر سہم گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے درالکشمی اس کی گردن دبوچنے والی ہے۔ لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے جلتا ہوا چراغ تھامے ہوئے تھی۔ نیچے سے گردن اُٹھا کر دیکھنے پر درالکشمی کتنی اونچی نظر آرہی تھی۔ کسی مندر میں رکھی ہوئی مورتی کی طرح پُر ہیبت — اس کی آنکھوں میں ملیشم نے جو چیز دیکھی اسے کوئی نام نہ دے سکا۔ وہ بیک وقت خاموش اور چیختی ہوئی نظر، جو ملیشم کے دل کو دہلا گئی مگر پگھلا نہ سکی۔ کیونکہ اس جادو کا توڑ اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔

یہ درالکشمی کتنی عجیب ہے — اس نے آنکھیں بند کر کے گھومتے ہوئے دماغ کو ٹھکانے پر لانا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ ہے مگر پھر بھی ساری دنیا کا اندھیرا اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہے۔ مہادیو کی طرح جس نے دنیا کے سارے سمندروں کا زہر پی لیا تھا تاکہ آئندہ انسان اس زہر سے ہلاک نہ ہو سکیں۔

اس لمحہ اسے پھر درالکشمی کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وہ خوفناک چمک یاد آئی لیکن اپنے ختم ہوتے ہوئے چیٹے کے ساتھ اس نے اس خیال کی گردن زمین پر رگڑ کر اپنے کان میں اُڑس لی۔

اس کے پیروں کے نیچے کی زمین روئی کی طرح نرم ہو گئی تھی اور وہ اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ زندگی کی ساری مردہ اور نیم مردہ خواہشیں اس کے آس پاس ناچ رہی تھیں۔ اپنی لنگڑی ٹانگ کے بھروسے پر وہ اتنا اونچا ہو کر پریشان سا ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر درالکشمی کو پکڑنا چاہا مگر اس کا ہاتھ سو روپے کے نوٹ پر جا پڑا۔ کرکراتا ہوا نوٹ — جس پر ہاتھ پڑتے ہی درالکشمی کا ہیولا مدھم پڑ گیا اور وہ چونک پڑا اور جلدی سے چاروں طرف دیکھ کر کمر سے بندھے ہوئے نوٹ کو ٹٹولا۔ اس نوٹ پر ہاتھ پڑتے ہی کتنے ستار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ جدھر دیکھو چراغ جلتے نظر آتے ہیں۔

چوہے کے بل جیسے کوارٹروں سے دھوئیں کے ساتھ ساتھ چیخ و پکار بھی پوری جنگم بستی (دھیڑوں کی بستی) میں پھیل رہی تھی اور محلے میں اس وقت بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو خاموش ہوں۔

ہر روز رات ہوتے ہی اندھیرا ان کے دلوں میں بھر جاتا اور وہ دن بھر کی ناکامی کا غصہ اتارنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑ پڑتے۔ سب اپنے سے کمزور ہستی کو قصوروار ٹھہرالتے۔ مائیں بچوں کو مارتیں۔ ماؤں کو ان کے شوہر پیٹتے۔ بہوؤں کی خبر ان کی ساسیں لیتیں اور صرف بہوئیں رہ جاتیں جو دن بھر کی محنت

محنت کے بعد شام کو ساس کی گالیاں، شوہر کی مار اور رات بھر کی بھوک کما پاتی تھیں۔ تھوڑے دنوں وہ قسمت کا لکھا سہہ جاتیں۔ روتی چلاتی لڑتے جاتیں۔ جادو گر عورتوں سے دوائیں لاکر شوہر کے کھانے میں ملا دیتیں۔ آخر ایک دن بستی میں خبر پھیلتی کہ فلاں کی بہو کسی مزدور کے ساتھ بھاگ گئی یا اسے کوئی صاحب لے اُڑا۔

"اونہہ —" ملیشم نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ "یہ بستی کب تک روتی رہے گی جانے ۔"

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر بالکشیا اس کے قریب سرک آیا۔

"کیا — ؟ کیا کہہ رہا ہے تُو —" اس وقت بالکشیا نے اپنے لہجے سے تحکم اور حقارت کو کھرچ کھرچ کر صاف کر دیا تھا۔

"تجھ سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔" اس نے شانِ بے نیازی سے جواب دیا اور خود ہی بالکشیا سے دور ہو بیٹھا۔

آج بالکشیا کی اکڑ اور گھمنڈ نہ جانے کہاں منہ چھپا کے بھاگ گئی تھی۔ وہ کتنی دیر سے اپنی زبان کو آرام دے رہا تھا، ورنہ روزانہ ملیشم اور دور لکشمی کے گھر میں گھستے ہی وہ گالیوں سے سواگت کرتا تو پھر وہ سب سو جاتے لیکن بالکشیا کی زبان نہ تھکتی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اُپلوں کے دھوئیں میں گھری ہوئی دور لکشمی کا ہیولا بالکل چھپ گیا تھا — ڈری بچاری — آج اسے ڈری پر بے اختیار پیار آ رہا تھا۔ بہت سے میٹھے ناموں سے پکارنے کو جی چاہ رہا تھا مگر وہ ڈری کی طرف دیکھ کر بھی گھبرا رہا تھا۔ دماغ میں بہت سی چکیاں چل رہی تھیں اور وہ گھبرا کے سوچتا کہ کیا سوچے — ؟ آج سے پہلے اس کی دنیا میں خوفناک بھوک چھائی ہوئی تھی۔ چیونٹیوں کی طرح تنکے کی بھری تھالیاں اس کے سامنے قطار بنائے رینگتی چلی جاتیں۔ وہ سوچ رہا ہے اور کلال خانے میں رکھے ہوئے سیندھی کے مٹکے اسے لوریاں سنا رہے ہیں۔ وہ اپنی ٹوٹی ٹانگ پر گھسیٹ رہا ہے اور کسی شوخ بچے کی طرح روپوں کے ستارے اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر بار اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل بھاگتے۔ ان دنوں وہ اپنے خالی پیٹ کو ہاتھوں سے دبائے ٹھنڈے پتھروں پر جس کروٹ بھی لیٹتا، اس کے تصور میں ڈر لکشمی کے سوائے کوئی اور چیز ہوتی۔ پیٹ بھرنے کی کوئی مزیدار چیز۔ دنیا کتنی خوبصورت تھی۔ آرزوؤں اور تمناؤں سے املی کے پیڑ کی طرح لدی ہوئی۔ لیکن آج سے پہلے ملیشم نے ان باتوں کے متعلق کیوں نہ سوچا تھا — ؟

آج ڈر لکشمی کی بدولت وہ سو روپے کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اور ڈر لکشمی کا دھیان آتے ہی زندگی میں پہلی بار، آج اس کا جی بسیج جاتا۔ دوسری عورتوں کی طرح وہ دن میں کئی کئی بار ملیشم اور بالکشیا کی مار کھا کے بھی گالیاں نہیں دیتی تھی۔ بھاگ جانے کی دھمکی نہیں دیتی تھی — لیکن ڈر لکشمی کو مارے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا۔ اپنی ٹوٹی ٹانگ لئے وہ دن بھر گھر میں پڑا مٹی کی گڑیاں بنائے جاتا۔ ایک ہی سی بے شمار گڑیاں، جنہیں بنانے میں وہ آرٹ کا ہر پاؤ یہ استعمال کرتا تھا اور جنہیں خوبصورت بنانے میں وہ اتنی محنت صرف کرتا کہ ماتھے سے پسینے کی دھاریں ٹپک کر گڑیوں کا کچا رنگ بگاڑ دیتیں۔ لیکن بازار میں پہنچ کر ان گڑیوں کی کوئی قیمت نہ رہتی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں گڑیوں کی خوبصورتی پر مچل جاتیں، لیکن بچیوں کی مائیں ان کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھ جاتیں۔

"مٹی کی گڑیا ہے۔ ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہے۔"

اور دن بھر میں وہ چار پانچ آنے سے زیادہ کبھی نہ لایا۔ پھر جب ڈر لکشمی نوکری سے واپس آتی تھی تو مجبوراً دل کی بھڑاس نکالنے کو اس سے ذرا جھگڑنا پڑتا۔ لیکن ڈر لکشمی نے کبھی محنت کرکے احسان نہیں جتایا۔ کبھی اپنی تنخواہ میں سے ایک پیسہ نہیں مانگا۔ ہمیشہ نوکری پر سے اپنے حصے کا آدھا کھانا اس کے لئے لاتی رہی اور اب کتنی خاموشی سے سو روپے کے عوض ان صاحب کے پاس چلی جائے گی۔ شریف گائے کی طرح جبھی تو بڑی بوڑھی عورتیں لڑکیوں کو گائے سے تشبیہ دیتی ہیں۔ دونوں کا ہی فرض ہے کہ مالک کے اشارے پر چلیں۔ بچاری گائیوں کے سپرد بھگوان نے کتنا مشکل کام دیا ہے۔ ساری دنیا کو اپنی سینگ پر اٹھائے کھڑی ہیں اور جب تھک کر اپنی سینگ بدلنا چاہتی ہیں تو دنیا میں کتنے بھونچال آ جاتے ہیں — مگر آج تو اسے کوئی بھونچال نظر نہ آیا۔ ڈر لکشمی نے اس کی پوری بات سن لی تھی لیکن اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ وہ چراغ ہاتھ میں تھامے بالکل ساکت کھڑی رہی اور جب چراغ کی لَو نے بڑھ کر اس کی کلائی کو ڈس لیا تو جلدی سے اس نے چراغ نیچے رکھنا چاہا لیکن لڑکھڑا کے گر پڑی اور گڑیوں سے بھری ٹوکری لڑھک گئی۔ جھنجھلا کر اس نے چراغ پٹک دیا۔

"کیسی کمزور گڑیاں بناتا ہے تو۔ ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ گئیں۔ کھیلنے والے بچے کیا جانیں یہ کتنی نازک ہوتی ہیں۔"

وہ ڈر لکشمی کے غصے پر حلق پھاڑ کے ہنسنا چاہتا تھا مگر اس کا دل خالی گھڑے کی طرح ہنسی سے خالی تھا۔

"جانے دے۔ جانے دے —" وہ ہنسی سے مایوس ہو کر بولا۔ "بگاڑ چیز ہے ہماری جا سے ٹوٹے یا رہے۔"

آج پہلی بار اس نے ذرالکشمی کے غصے کو ہنس کر برداشت کیا تھا۔ بچاری کا ہاتھ جو زور سے جل گیا تھا۔ خیر اب صاحب کے بنگلے میں جا کر اس کی زندگی سدھر جائے گی۔
اس وقت اسے بگلی ذرا گا یاد آئی جو کسی بنگلے سے نکال دی گئی تھی اور اب سڑکوں پر برہنہ چیختی چلاتی پھرتی تھی۔ مگر جسنگم بستی کے مرد اسے دیکھ کر غصے میں آجاتے —" اسے بنگلوں میں پہنچ کر ہمارے نصیب جاگ اٹھتے تو بھلا ہی تھا۔ بھاگتے وقت یہ کیوں نہ سوچا تھا کہ تو بنگلے کی بیگم صاحب نہیں ہے جو سدا راج کرے گی۔"
لیکن ذرالکشمی بڑی نصیبوں والی ہے۔ وہ ضرور بنگلے کی بیگم صاحب بنے گی۔ وہ اپنے دل کو سمجھانے لگا اور ذرالکشمی کے ساتھ گزارے ہوئے دن ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے سامنے سے گزرنے لگے۔

ذرا ہمیشہ اس کے قریب رہی۔ ان کے جھونپڑوں کے درمیان ایک بانس کی دیوار حائل تھی۔ اسے ذرالکشمی کی پیدائش کا وقت بھی یاد تھا جب لڑکی ہونے پر اس کے باپ نے بیوی کو خوب مارا تھا اور اپنے باپ کی فلک شگاف چیخوں کو سن کر ذرالکشمی نے اپنے کمزور احتجاج کو فضول سمجھا تھا اور سہم کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس دن سے ملیشم نے پھر کبھی ذرالکشمی کی چیخیں نہیں سنیں۔ ہر احتجاج کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا اس کی فطرت بن چکی تھی۔

جب تک وہ کھانے کمانے کے قابل تھا اس نے کبھی ذرالکشمی نے خلوص اور محبت کا جواب نہ دیا۔ مزدوری کرتے وقت جب وہ سیڑھی پر سے گرا تھا تو سب سے پہلے دوڑتی ہوئی ذرالکشمی ہی اس کے پاس آئی تھی۔ وہی اس کے ساتھ اسپتال گئی تھی اور اپنے نو بہن بھائیوں کا دھندا سمیٹ کر وہی اس کی ٹانگ پر مالش کرنے آتی تھی۔ اصل میں وہ ملیشم کی صحت اور جوانی کی بجائے اس کی بے بسی اور بیماری پر ریجھی تھی۔ بہت ان کے داروں میں ایسے ہی نامکن دروازوں سے داخل ہوتی تھی۔ دن بھر بالکشیا کی جھڑکیاں، بڑے بھائیوں کے طعنے اور بھاوجوں کی گالیاں سننے کے لئے وہ زخمی کتے کی طرح ایک کونے میں پڑا رہتا تھا۔ ایسے وقت صرف ذرالکشمی ہی اسے ڈھارس بندھاتی تھی اور لولی ٹانگ اس کے لئے ایک پل بن گئی تھی جسے لانگھ کر ذرا اس کی جانب آگئی۔ اس نے مستقبل کا خوفناک اندھیرا دیکھ کر ذرالکشمی نے اس سے بیاہ کرنا بھی منظور کر لیا تاکہ وہ ہر وقت ملیشم کے قریب رہ سکے۔ یہ ذرا ہی تھی جس کی بدولت اس کے نامرادسوں پر دو پر نکل آئے تھے اور وہ نامکن فضاؤں میں پرواز کرنے لگا تھا۔ پھر وہ رات آگئی جب نئے کپڑوں اور باجوں کے بغیر ہی ذرالکشمی دلہن بن کے اس کے گھر آگئی تھی۔ ہلدی میں رنگی پرانی ساڑی میں ہی وہ دلہن بن گئی تھی اور سیندور کا ٹیکا ملیشم کی غلامی کی مہر بنا اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔ اس کی ماں لنگڑے بیٹے کی شادی پر کچھ بھی خرچ کر سکی تھی۔

اس رات آتے ہی ذرالکشمی نے اس کے لئے دوا بنائی تھی اور ملیشم نے دوا لینے کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ شرمائی جھٹک کر ہٹ گئی تھی۔
"تو میرے لئے آئینوں والی چوڑیاں بھی نہیں لایا۔ ایسی اُجاڑ دلہن۔ کیا میں دلہن لگتی ہوں ——"
اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تو ملیشم نے ہاتھ میں مٹی اٹھا کر قسم کھائی تھی کہ وہ بہت جلد چوڑیاں لا دے گا۔ چمکیلی والی چوڑیاں ——
اس دن سے ذرا نے ہزار بار اسے وعدہ یاد دلایا تھا اور ہزار بار اس کا جی چاہا کہ مٹی کی گڑیا ایک آنے میں بکنے کی بجائے سو روپے میں بکنے لگے تو کتنا اچھا ہو۔ وہ پچاس روپے میں اپنی ٹانگ کا علاج کروا لے اور دونوں ٹانگوں پر دوڑتا ہوا باہر نکل جائے۔ پھر جب شام کو گھر واپس آئے تو اس کے ہاتھوں میں چھم چھم کرتی چوڑیاں ہوں۔ ایک لال ساڑی ہو۔ چاول ہوں اور ایک تھیلیا بھری سیندھی ہو اور وہ ہنس ہنس کر ذرالکشمی کو دلہن بنائے گا۔ اسے سرخ ساڑی پہنا کر ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگائے۔ جوڑے میں گیندے کے پھولوں کی بینی اور پیروں کو ہلدی لگا کے نئی کھنکتی ہوئی چوڑیاں پہنا دے، تاکہ ذرالکشمی کا دلہن بننے کا ارمان پورا ہو سکے۔ پھر نائیتا کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ صرف بوڑھا بیل ہی نہیں ہے جسے مفت میں کھانا دیا جاتا ہے۔ "یہ کیا مٹی کی پتلیاں بنائے جاتا ہے کبھی ان سے بھی ہماری قسمت جگی ہے ——؟"
لیکن آج ملیشم کی قسمت ایک ایسی ہی گڑیا کی بدولت جاگ چکی تھی۔ اور آج وہ ذرالکشمی کی ہر فرمائش پوری کر سکتا ہے۔ صرف چوڑیاں ہی کیا —— سو روپے جیب میں ڈال کر تو کئی ذرالکشمیاں خریدی جا سکتی ہیں —— لیکن آج رات گیارہ بجے صاحب اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پھر اس گھر کے آنگن میں جوہی کے پھول کھلانے والا کوئی نہ رہے گا۔ اس کی ٹانگ پر مالش کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔ دن بھر بھوکا رہ کر اس کے لئے اپنا کھانا لے کر کون آئے گا۔ وہ اپنا غصہ کس پر اتار کے اپنا جی ٹھنڈا کرے گا —— ذرالکشمی کے بغیر زندگی کا تصور کتنا نامکمل ہے —— ابھی ابھی ذرا ہی کے لئے وہ کیا کرے۔ کیسے بتائے کہ یہ سو روپے کتنے مہنگے ہیں جو آج ذرا کو اس سے دور کر رہے ہیں —— کاش وہ بھی ایک لنگڑا مرد ہوتی جس کی قیمت دنیا کے بازار میں کچھ بھی نہیں ہے —— ایک بے جان مٹی کی گڑیا نہ تھی۔
سو روپے کے نشے پر تلخ سی لہریں ابھرنے لگیں۔
جیسے آج اس کی دوسری ٹانگ بھی گر کے ٹوٹ جائے گی اور وہ ہوا میں معلق رہ جائے گا۔

پھر بستی والے بھی اپنے وقت پر تو بھیگی بلی بن جاتے ہیں مگر دوسروں کی باتوں کو یوں گھر گھر پہنچاتے ہیں جیسے کسی پوجا کا پرشاد بانٹ رہے ہوں۔ اس کا پڑوسی رامتیا ایک سال پہلے ہی پچاس روپے میں اپنی بیٹی کو کسی سیٹھ کے ہاتھ فروخت کر چکا تھا۔ مگر آج اپنے آنگن میں کھڑا ہو کے محض ملیشم کو سنانے کے لئے کہہ رہا تھا۔

"پیٹ کی خندق بہت بڑی ہے وہ صرف ایک عورت کی لاش سے نہیں بھر سکتی۔"

ملیشم نے رامتیا کی بات آگے سننا ہی نہ چاہی۔ جب سے اس کی بیٹی گئی تھی وہ ایسی ہی خوفناک باتیں کرتا تھا۔ اصل میں وہ چھوٹوں ماموں وانی آ جانے اپنی جوتوں کی طرح یہ بات شام ہی سے پوری بستی میں پھیلا دی تھی۔ اور نگما کی ساس نے بیچ باڑے میں کھڑے ہو کے محلے کی بہوؤں کو ڈرالکشمی کی یہ سعادت مندی سنائی تھی۔ پھر محلے کو اڑتوں کو پھلانگتی یہ بات چاروں طرف پھیل گئی۔

جھنگم بستی کی ساسوں کو بالکشیا کی قسمت پہ رشک آ رہا تھا۔ کاش ان کی بہوئیں بھی اتنی قیمتی ہوتیں۔ لیکن جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے وہ نل کے پاس جمع ہو کر خوب جلی کٹی سنا رہی تھیں۔

"باڑا آئی پونو۔ آگی دگنی ری موتی موگرکی (نارت ہو۔ بڑی اسپے شوہر کو آگ لگے)

اور وہ حیدر واڑے کے مرد اپنی سوکھی ماری، بچے لٹکائے ہوئے بیویوں کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگے۔ انکے محلے میں تو آج تک کوئی دھیڑلی نکی تھی۔ کوئی بڑا نصیبوں والا ہوا تو دس بیس روپے لے مرا۔ ورنہ بنگلے کے صاحب لوگ تو حیدر بیویوں پہ بیاہا حق رکھتے تھے —— یہ عورتیں بھی کتنی منفعت بخش ہوتی ہیں۔ کاش ہر انسان یوں ہی اپنی قیمت وصول کر سکے۔

یوں بھی عورتوں کو روکنے کے لئے کوئی بند ھ نہیں باندھا جا سکتا۔ جانے کتنے صاحب لوگ شکار کھیلنے آتے تو جاتے وقت کھیتوں میں تتلیوں کی طرح اڑنے والی لڑکیوں کو بھی اٹھا کے موٹر میں ڈال لیتے۔ پھر ان کے شوہر اور بھائی ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر روتے چلاتے بھاگتے جاتے۔ خود ہی اپنی حماقت پر کھسیا کر دونوں کا پیچھا چھوڑ دیتے۔ ان تیز رفتار موٹروں کو کون پکڑ سکتا ہے۔

چند دنوں بعد وہ لڑکیاں شہر کے چکلے میں بیٹھی ہوتیں یا کسی دوسرے گاؤں میں بھیک مانگتی نظر آتیں۔

اس باڑے کی جتنی عورتیں نوکری کرنے جاتی تھیں وہ بنگلوں کی ملکیت ہو جاتیں۔ اسی لئے تو شہر بھر کے عورتیں سو طرح سے کمانے لگتی تھیں۔ بوڑھی عورتیں بھیک مانگ لاتیں۔ بچے معظم جاہی مارکیٹ کے کوڑے میں سڑے پھل ڈھونڈنے نکل جاتے اور مرد کاندھے پر پھاوڑا رکھے مزدوری کی آس میں گھومتے پھرنے۔ لیکن شام ہوتے ہی دن بھر کی ناکامی ایک شور بن کر ابلتی۔ ہر گھر میں چیخ پکار مچ جاتی۔ تین تین گز کے کمروں میں بالشت بھر کے آنگن میں بارہ بارہ آدمی رہتے تھے۔ وہیں کھانا پکتا، وہیں بچے غلاظت بکھیرتے اور مرد جلتی لکڑیاں کھینچ کر عورتوں کو مارتے۔ بچوں کی چیخوں اور عورتوں کی سسکیوں میں چولہے کا دھواں مل جاتا۔ یہ گیلی لکڑیاں ہمیشہ رس رس کر جلتی ہیں۔ نہ جانے کب لپک کر شعلہ بن جائیں —— مگر اب کیا ڈر ہے۔ اب ڈرالکشمی کی بے پناہ جوانی سے اسے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔ ان دو برسوں میں اس کا قد دروازے کی چوکھٹ کو چھونے لگا تھا اور ساری کی دھجیاں جسم کے بہت سے لے قابو حصوں کو چھپانے سے قاصر تھیں۔ ان کے سامنے محلے کے غنڈے ڈرالکشمی کو دیکھ کر گانے لگتے۔

او نلا سیرا پلا، او تیرا رانیکے پلا —— بیڑی ایکڑ چو سودے او بلگاری ڈرا۔

(او کالی ساڑی اور لال چولی والی لڑکی۔ کبھی ادھر بھی دیکھ او سونے کی ڈرا (لکشمی))

اپنی ٹوٹی ٹانگ پر صبر کر کے وہ خاموش ہو جاتا۔ لیکن ہر وقت اسے خدشہ لگا رہتا کہ کسی دن ڈرا ان چھوکروں کی طرف دیکھنے لگے گی۔ نہ جانے کیوں جو بھی ڈرا کو دیکھتا نظریں وہیں جم جاتیں۔ اس کا سیاہ فام جسم سیاہ پتھر کی مورتیوں کی طرح خوبصورت تھا۔ پھر اس کی بڑی بڑی بھرپور آنکھوں کی معصوم خاموشی ہر ایک کو اس کی جانب جھکا دیتی تھی۔ جس دن نوکری سے واپس آنے میں ڈرالکشمی کو دیر ہو جاتی تو وہ خود ہی گھسٹتا ہوا بنگلے پر چلا جاتا۔ ایک دن کار میں سوار ہوتے وقت صاحب نے اسے دیکھا تو تعجب کے مارے نیچے اتر آئے۔ ڈرالکشمی کے یقین دلانے پر بھی وہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ یہ لنگڑا اکبڑا اس کا شوہر ہے لیکن وہ ملیشم پر بہت مہربان ہو گئے اکثر ٹوٹی پھوٹی تلگو میں اس کی ٹانگ کا حال پوچھتے اور ملیشم کے پیہم سجدوں سے مجبور ہو کر ایک آدھ آنہ بیڑی پینے کو دیدیتے۔ مگر آج انھوں نے سو روپے پہاڑ کی طرح اس کی طرف پھینک دئے —— ایکدم —— اتنے اچانک طور پر کہ ملیشم ان روپوں کے بوجھ سے دب کر حرکت بھی نہ کر سکا۔ صرف اتنا یاد رہا۔ آج رات

گیارہ بجے دُرالکشمی چلی جائے گی ——— بیچارے یہ صاحب کتنے شریف نکلے۔ یوں ہی کسی دن وہ دُرالکشمی کو روک لیتے تو ملیشم کیا کر لیتا۔ آج دُرالکشمی اپنی قیمت پر جتنا چاہے ناز کر سکتی ہے۔

چولہے کے سامنے جھکی ہوئی دُرالکشمی کے چہرے پر شعلوں کا عکس ناچ رہا تھا۔ جیسے وہ بھڑک بھڑک کر جل رہا ہو۔ بالکشیا اس سے مایوس ہو کر اونگھ رہا تھا۔ لیکن ملیشم چاہتا تھا کہ آج خوب جی بھر کے اسے جلائے۔ اسے جلانے ترسانے کے سارے بدلے گن گن کر چکائے۔

اپنے باپ سے نفرت کی یادیں بہت لمبی تھیں۔ جب ان کے آخری سرے کو دیکھنا ہوتا تو ملیشم کو وہ دن یاد کرنا پڑتے، جب وہ دن بھر گندے چیتھڑوں میں لپٹا دودھ کے لئے روتا رہتا تھا۔ ماں صبح اٹھ کر اس کے حلق میں دو بوندیں بھی نہ ٹپکا پاتی کہ بالکشیا ملیشم کی ٹانگ پکڑ کر زمین پر پٹک دیتا تھا۔ دھکے دیدے کر بیوی کو مزدوری پر بھیجتا تھا۔ اس وقت ملیشم کو ساری دنیا میں کوئی اپنا ہمدرد نظر نہ آتا تھا۔ لیکن شام کو جب وہ دن بھر رونے کے بعد ماں کی چھاتی سے چمٹ کر اچھل اچھل کے دودھ پیتا تو ماں دنیا کی سب سے پیاری چیز بن جاتی۔ ماں کے پیروں تلے سورگ کا تصور کسی ایسے ہی بچے کا ہوگا۔

عورت ہر روپ میں کتنی بڑی نعمت بن جاتی ہے ——— ؟

پھر روتے روتے نڈھال ہو کر وہ اونگھنے لگتا تھا تو ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا۔ چاروں طرف خوبصورت بادل، سنہرے تارے اور ماں کے ہزاروں ہاتھ منڈلاتے پھرتے۔ کوئی دودھ بھری پیالیاں مسلسل دیے جاتا۔ پھر اچانک بالکشیا کا ہاتھ اس کے منہ سے چھین لیتا اور وہ سوتے میں ہی بسورنے لگتا۔

یہ مضبوط ہاتھ اس کی مسرتوں کے درمیان ہمیشہ سے حائل رہا۔

پھر رفتہ رفتہ ماں کا دودھ چھوٹ گیا۔ اب ماں اسے باسی چاول کھلا کے سیندھی پلا دیتی تھی تاکہ وہ نشے میں خاموش پڑا رہے۔ ماں کا خون چوسنے والی اب ایک اور جونک آ گئی تھی، جس کا حق مار کے اب بھی وہ کبھی کبھی ماں کے سینے سے چمٹ جاتا تھا۔

روز رات کو ماں اپنے پلو میں تھوڑے سے چاول باندھ کر لاتی تھی، اور اس کے آتے ہی گھر میں دیوالی کا اجالا چھا جاتا۔ سب بچے چیختے چلاتے، ایک دوسرے کو مار پیٹ کے اپنی خوشی کا اظہار کرتے تھے، اور ماں سب کو مار پیٹ کے چولہے کے پاس چلی جاتی۔ لمحوں، منٹوں کا شمار کر کے سب بچے چاول پکنے کا انتظار کرتے تھے جو ماں سب کو تقسیم کر دیتی تھی۔ اس بار پھر چھوٹے بڑے حصے پر شور مچ جاتا اور ماں لکڑی اٹھا کے دوڑتی۔

"بھگوان تمہیں غارت کرے، تمہارے حلق تنگ ہو جائیں۔ کچھ اس کے لئے بھی رکھوں یا نہیں جس کے دم سے گھر میں چراغ جلتا ہے۔" شاید ہر عورت اس غلط فہمی میں رہتی ہے کہ کبھی نہ کبھی اس کا شوہر زندگی میں اُجالا بکھیر دے گا۔ لیکن یہ روشنی تو اس کے جلنے سے نکلتی ہے۔

جس کے دم سے گھر میں چراغ جلنے کی امید تھی وہ ان کا باپ بالکشیا تھا۔ دن بھر کمانے کے بعد سب پیسوں کی سیندھی پی لیتا اور نشے میں جھومتا ہوا گھر آتا تو اس وقت بھی اس کی کمر یوں ہی جھکی رہتی جیسے منوں بوجھ اٹھائے ہو۔ اونٹ کی طرح گردن جھکائے۔ ہونٹ لٹکائے۔ ملیشم نے اپنی زندگی میں کبھی نائینا کو ہنستے ہوئے نہ دیکھا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ گھر میں گھستے ہی اس نے مار پیٹ نہ کی ہو۔ کسی بچے کو اٹھا کر نہ پٹکا ہو۔

اپنے بہت بڑے حصے کا ایک ایک دانہ کھا کر بھی وہ انگلیاں چاٹتا رہتا اور تھالی میں کوئی گرا پڑا دانا ڈھونڈے جاتا۔ بچوں کی صورت دیکھ کر تو اسے مارنے کیلئے لاتعداد بہانے مل جاتے تھے۔ سات برس کے ملیشم کو وہ رات کے چار بجے کان پکڑ کے اٹھاتا تھا اور دن بھر ساہوکار کے کھیتوں میں کام کرواتا۔ اس وقت کھیتوں میں اڑتی ہوئی تتلیوں اور منڈیروں سے مایوس ہو کر وہ زمین کو کریدنے لگتا تھا۔ کاش مٹی میں دبا ہوا کوئی خزانہ مل جائے، اور وہ بڑی شان سے نائینا کے سامنے لے جا کر پھینک دے۔ پھر وہ ملیشم کو سینے سے لگا کے مزے دار پیار کرے گا۔ اس کے کانٹوں سے لہولہان ہاتھوں پر ٹھنڈا پانی ڈالے گا اور گڑ کی پٹی خریدنے کے لئے ایک پیسہ اسے بھی مل جائے گا۔ مگر ایسا وقت کبھی نہ آیا۔ اس کے ہاتھوں کے زخم دل تک پھیلنے لگے۔ جب وہ اپنی ایک ٹانگ کھو کر گھر میں آ پڑا تو بہن بھائی اپنے اپنے ٹھکانوں سے لگ چلے تھے۔ صرف وہی نائینا کی گالیاں کھانے کو موجود تھا۔ ان دنوں کئی بار اس نے تالاب میں ڈوب مرنے کی ٹھانی مگر دُرالکشمی کی شفقت نے روک لیا۔ دُرالکشمی اس کی زندگی کے ہر کونے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی صلاح سے وہ نائینا کو لے کر شہر آ گیا تھا اور دونوں محنت کر کے اس کی دوزخ بھرتے تھے۔ نہ جانے کیوں اسے بھگوان اپنے پاس بلانا بھول گئے تھے۔ آج بھی بالکشیا اسے جی بھر کے خوش نہ ہونے دے گا۔ اس وقت سے کونے میں بیٹھا، آنکھیں مچا مچا کر یوں گھور رہا تھا جیسے آنکھ جھپکتے ہی سو روپے کا نوٹ لے کر بھاگنے والا ہو۔ لیکن ملیشم پہلے ہی سے مقابلے کو تیار تھا۔ آج اس کے جسم میں نئی طاقت آ گئی تھی۔ یہ سو روپے ہر گھڑی ایک نئی لے میں

بجنے لگتے ــــ اب وہ اپنی ٹانگ کا علاج کرائے گا۔ ایک نئی دھوتی خریدے گا۔ ساڑھے چار آنے والا سینما دیکھے گا اور عابد شاپ کے ہوٹل میں کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھائے گا ــــ کھانے کے نام پر اسے خان صاحب یاد آ گیا جب چاول کی گنجی بھی نہ ملتی تو خان صاحب سے ادھار لینا پڑتا۔ اب اس کے اتنے روپے ہو گئے تھے جتنی گنتی بھی ملیشم کو نہ آتی تھی۔ کئی بار وہ سیتا پھل کے بیج یا املی کے چیئے لے کر حساب کرتے بیٹھا لیکن پھر اٹھا کر پھینک دیے۔ جو خان کہے وہ تو دینا ہی پڑے گا۔ بچارا خان تھا بھی بڑا شریف آدمی۔ روز شام کو سائیکل لئے بستی میں آتا اور سب پر ترس کھا کے ان کی ضرورتیں پوری کر دیتا۔ پھر گلی کے موڑ پر پہنچ کر اندر آنے والے ہر مزدور کی جیبیں وہیں جھٹک لیتا تھا۔ لیکن ملیشم کی آمدنی دو چار آنے سے زیادہ نہ ہوتی تھی اس لئے جب خان اسے ہنٹروں سے مارنے لگتا تو دُرالکشمی خان کے پاؤں پر گر جاتی۔ اس کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری خود لیتی۔ لیکن خان جانتا تھا کہ دُرالکشمی ان دھیڑ مرنیوں میں سے نہیں تھی جو ہر رات کئی کئی روپے کما لاتی ہیں۔ اس سے تو کوئی جنس کر بات بھی کرتا تو ساری بستی کو اکٹھا کر لیتی تھی۔ پھر ملیشم کے زخم دھوتے میں خود رو دیتی تھی۔ ان ہی مہربانیوں کو دیکھ کر تو ملیشم نے سوچا تھا کہ وہ آج بھی انکار نہ کرے گی۔ ــــ بچاری کی آج تک ایک خوشی بھی اس گھر میں پوری نہ ہو سکی۔

آج اس کی ساری مہربانیاں یوں یاد آ رہی تھیں جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے پتے آ رہے ہوں۔

اپنی لاٹھی ٹٹول کر وہ باہر جانے لگا تو بالکشیا چونک پڑا۔ "رات میں کہاں جا رہا ہے۔ اس وقت سڑکوں پر موٹروں کا میلا ہوتا ہے۔"

وہ دل میں خوش ہونے لگا۔ آج کسی مندر کے پجاری کی طرح نابینا اس کی دیکھ ریکھ کر رہا تھا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔ تم دُرا دُرا کو دیکھے رہنا۔" اس نے آہستہ سے بالکشیا کے کان میں کہا مگر وہ اپنی عادت کے مطابق چیخ کر بولا۔ ــــ "ارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ خود ہی اس صاحب کے ساتھ بھاگنے والی تھی۔ اچھا ہوا تو نے دیکھ لیا۔ اگر اس نے کچھ چوں چرا کی تو باندھ کر تالاب میں پھینک آؤں گا۔ مگر تو آتے وقت سیندھی ضرور لانا۔" پھر وہ مڑ کے خوف زدہ دُرالکشمی سے بولا۔ "مرد جس چھری سے تجھے قتل کرے اس چھری کے بھاگ جاتے ہیں۔ سمجھی دھیڑ کی اولاد؟" دھیڑ کی اولاد نے پھٹی ہوئی نظروں سے ملیشم کی طرف دیکھا اور کوٹھری کے اندھیرے میں ڈوب گئی۔

سیندھی کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا ملیشم جب واپس آیا تو صاحب موٹر لئے گلی میں کھڑے تھے۔ اور گھر میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا ــــ اس نے باہر جاتی ہوئی دُرالکشمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سیندھی کا لذت آگیں سرور اس کے حلق میں آ کر پھنس گیا اور وہ منہ کھول کر چیخ بھی نہ سکا۔ "میں نے تجھ سے چوڑیاں لانے کا وعدہ کیا تھا نا ــــ لے آج لے آیا ہوں۔" وہ رک رک کر بولا اور چراغوں کی طرح چمکتی ہوئی چوڑیاں کاغذ میں سے نکال کر اس کے ہاتھوں میں ڈالنے لگا۔

"کتنے دنوں سے میں نے وعدہ کیا تھا ــــ" وہ گھٹی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"مگر اب ان کی کیا ضرورت تھی ــــ" دُرالکشمی کی آواز میں صرف نصیحت ہی ٹٹولی جا سکتی تھی۔

"واہ ــــ کیوں نہیں ــــ آج تیری ایک تمنا پوری ہو گئی نا۔ تو بڑی اچھی ہے دُرا ــــ تو دیوی ہے ــــ تو بھاگیہ ہے۔ آج تو نے میری زندگی کا سارا زہر پی لیا ہے۔ آج میں بھی تجھے خوش کرنا چاہتا ہوں۔" وہ اندھیرے کو ہٹا کر دُرالکشمی کا پر مسرت چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔

"بول ــــ بول تجھے اچھی لگیں ــــ؟" موٹر کے مسلسل ہارن سے گھبرا کے وہ جلدی جلدی پوچھنے لگا۔ مگر دُرالکشمی نے کچھ نہ کہا۔ اس کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چوڑیوں کے نگ چمک رہے تھے اور ایسے ہی دو نگ اس کی پلکوں پر تو دسے آ مٹھے۔

لڑکھڑا کے وہ پیچھے ہٹ گیا۔

"حرام زادی ــــ مردار ــــ اور کیا سے نئے کے کپڑے لے گی۔" بڑی مشکل سے بے قابو ہاتھ کو اٹھا کر وہ دُرالکشمی کی طرف جھپٹا اور اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کے گر پڑا۔ دُرالکشمی جا چکی تھی۔ اس نے اپنے آس پاس ہاتھوں سے ٹٹولا۔ بہت سی گڑیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ اچانک اسے چکر سا آنے لگا۔ سیندھی ابکائیوں کے ساتھ الٹ کر پھر منہ میں آنے لگی اور وہ پیٹ پکڑ کے چلایا۔

"سالی یہ مٹی کی گڑیاں، ذرا سی ٹھیس برداشت نہیں کر سکتیں۔"

صدیقہ بیگم

یہ کہانی

مجھے آج چھ سال کے بعد بھی یہ بات اچھی طرح یاد ہے اور بالکل ایسے ہی گویا آج ہی کی ہو اور اسی لئے میں اس واقعہ کو افسانہ نہیں بنا رہی ہوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ اس عرصے میں کہانی لکھنے کا خیال ہی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا بلکہ جب کبھی میں کوئی کہانی لکھنے کے لئے بیٹھی تو یہ موضوع میرے ذہن کے کسی چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ اب یہ کہانی لکھ ڈالوں، یہ بھی تو کہانی کا موضوع ہے لیکن پھر میری آنکھوں کے سامنے تمہاری شکل پھر جاتی ہے۔ میں تمہاری بے بسی دیکھتی ہوں اور پھر تمہاری اتنی دولت، اتنی عزت اور ثروت، تمہارا شاہانہ مزاج اور تمہارے اس بے پناہ حسن نے باوجود حسین ہونے تم کو [illegible] کر دیا ہے مجھے تمہارے اوپر رحم آنے لگتا ہے آخر تم ہی سوچو کہ جو شخص رحم کئے جانے کے لائق ہو، اس کی شخصیت کتنی سمٹ جاتی ہے جب چھ سال پہلے کی بات یاد آ جاتی ہے، تمہاری شکل میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے جب تم اپنی تمام تر شخصیت سے بے پرواہ ہو کر بار بار مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ "مجھ پر افسانہ نہ لکھنا" اور میں پہلے تو سوچتی رہی کہ تم سے وعدہ کر دوں یا نہ کروں اور پھر جب میں نے غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ تمہارے اندر افسانے کے موضوع بننے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے اور وہ بھی ترقی پسند افسانے کی، بھلا یہ بھی کوئی شخصیت ہے جس کا چہرہ غازے اور سرخی کی آڑ میں اتنا چھپا ہوا ہو اور اصلی شکل بھی نظر نہ آ سکے۔ اس روز جب میں تمہاری طرف غور سے دیکھ رہی تھی تو یہی فطری شکل تلاش کر رہی تھی اور تم ہی بتاؤ جب مجھے تمہاری شکل ہی نظر نہ آ سکے تو افسانہ کیسے لکھ سکتی ہوں۔ بھلا کوئی کسی کے لباس پر افسانہ لکھ سکتا ہے۔

میں نے جس وقت تمہارے گھر میں قدم رکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تم ہمہ تن خیر مقدم ہو۔ تمہاری دو دو ڈالی ساری مجھے خوشامد کرتی ہوئی نظر آئی اور مجھے کچھ عجیب بھی نہ معلوم ہوا کیونکہ تم کو میرے آنے کی اطلاع تھی اور پھر اگر تم نے میرے آنے کی خوشی میں اتنی قیمتی ساری پہن رکھی تھی تو یہ کوئی عجیب بات نہ تھی اس لئے کہ میں تم سے پہلی بار مل رہی تھی، حالانکہ تم چھ مہینے پہلے ہی میری بھابی بن چکی تھیں۔ تاہم مجھے تمہارے چہرے کی بشاشت غازے کی تہوں کے باوجود نظر آ گئی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کبھی باک نہ ہو گا کہ تمہاری شادی کی خبر سن کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ جب میں نے یہ سنا کہ تم ایک لکھ پتی اور حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے باپ کی بیٹی ہو اور میرے بھائی درمیانے طبقے کے معمولی سے انسان، تو مجھے یہ شادی اتنی ہی بے جوڑ معلوم ہوئی جتنی کسی ۱۶ سالہ دوشیزہ کی شادی کسی ۶۰ سالہ بڈھے کھوسٹ سے۔ مجھے اپنے بھائی پر بے حد غصہ آیا، ان کی نظر انتخاب تم پر پڑی۔ نہ جانے ان کو تمہارے اندر ایسی کون سی خوبی نظر آ گئی کہ وہ اپنے طبقے کو بھول گئے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔ مجھے سچ مچ ان کے اوپر بڑا غصہ آیا، عجیب آدمی ہیں۔ تیرنا نہیں آتا اور دریا میں کود پڑے۔ لیکن میں بھائی جان کی عادت سے واقف ہوں ان کو کوئی نہیں روک سکتا وہ جب کوئی بات سوچ لیتے ہیں تو کر کے چھوڑتے ہیں۔ اگر وہ آگا پیچھا سوچتے تو ہمارے بھائی جان ہی کیوں ہوتے۔ مجھے اس کا رنج نہیں کہ انھوں نے مصلحت سے کام کیوں نہیں لیا۔ ———

——— بلکہ غم تو اس کا ہے کہ میں ان سے مصلحت کی امید ہی کیوں کرتی ہوں مگر پھر بھی مجھے ان کے انتخاب سے شکوہ تھا میں جانتی ہوں کہ وہ کوٹھی میں رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تب پھر انھوں نے کوٹھی میں سر کیوں چھپا لیا۔ اگر وہ تم سے شادی کرنے کے بجائے خودکشی کر لیتے تو شاید مجھے حیرت نہ ہوتی، اس لئے کہ وہ دو سال سے مسلسل بے کار تھے۔ جہاں نوکری کی تلاش میں جاتے وہیں ٹکا سا جواب مل جاتا۔ اب اگر اس طرح بے کار رہنے کے بعد کوئی خودکشی کر لے تو تم ہی بتاؤ یہ بھی کوئی حیرت کی بات ہے۔ لیکن میں تم سے یہ سوال ہی غلط کر رہی ہوں۔ بھلا تم اس طرح کے مسئلوں کو کس طرح سمجھ سکتی ہو۔ اگر تم بے کاری کا لفظ سن کر لغت میں اس کے معنی تلاش کرنے لگو تو مجھے حیرت نہ ہو گی اس لئے کہ انسان، زبان تو اپنے ماحول سے سیکھتا ہے، بھلا تمہارے ماحول میں بے کاری اور بے روزگاری جیسے الفاظ کس طرح گھسنے کی جرأت کر سکتے ہیں جہاں پھاٹک پر دو دو سنتری بندوق لئے ہر دم کھڑے رہتے ہوں یہ بے کاری اور بے روزگاری تو ہمارے گھروں میں بے تکلف ہے جب چاہتی ہے بلا جھجک ہمارے یہاں گھس آتی ہے

ہاں تو میں اپنی بات سے ہٹ گئی۔ میں یہی تو کہہ رہی تھی کہ تمہاری شادی میرے بھائی سے بالکل بے جوڑ تھی جیسے لوہے کے ٹکڑے سے کسی دوشیزہ کی شادی لیکن بس وہ جب میں نے پہلی بار تم کو دیکھا ہے اور تمہاری کوٹھی میں داخل ہوئی تھی تو مجھے تم بہت خوبصورت معلوم ہوئیں۔ مجھے تمہاری نیلگوں آنکھوں میں قفات کی پریاں نظر آئیں اور میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ الف لیلہ کے داستان گو نے اب سے ہزاروں برس پہلے تم کو اپنے تصور میں دیکھا ہوگا، کیا اس نے اپنی شکنتلا کی تصویر بناتے ہوئے تمہارا ہی تصور کیا ہوگا۔ تم سچ مچ بڑی حسین ہو اور تمہارے وہ بڑے بڑے سیاہ بال جو تمہارے صاف شفاف کتابی چہرے کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھے، تمہارے سینے پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ مچل رہے تھے اور وہ ایک لٹ جو تمہارے عارض پر بار بار آ جاتی تھی اور جس کو تم بار بار جھٹک رہی تھیں اور بھی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ واقعی تم حسن کا دوسرا نام ہو اور یہی وجہ ہے کہ میں سب کچھ بھول گئی۔ اپنے آپ کو بھول گئی اپنے پہلے تصورات کو بھول گئی، بھائی جان کو بھول گئی اور اس ماحول کو جو میرے لئے اجنبی تھا اور ایک خیال میرے ذہن میں دوسرے لمحہ آیا۔ تمہارے انتخاب میں بھائی جان مجبور ہوں گے، اور میں نے اسی لمحہ بھائی جان کو معاف کر دیا۔ تم کو خیال ہوگا کہ میں کتنی دیر بے وقت تک کھڑی رہی اور شاید تم نے میری بدتہذیبی کو محسوس بھی کیا ہو، سچ سچ میں تمہارے ماحول میں اجنبی تھی مجھے تمہارے ماحول کے آداب بھی نہیں آتے اور اس بات کو محسوس کرنے کے بعد بھی میں کھڑی رہی۔ پھر تم مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ اور اتنی دیر میں چار پانچ خوبصورت لڑکیاں ملیں۔ معاف کرنا میں پہلی نظر میں ان کو تمہاری بہن سمجھی۔ ان کے زرق برق کپڑوں کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ تمہاری ملازمائیں ہوں گی، وہ کس قدر صاف شفاف نظر آ رہی تھیں اور تھوڑی دیر کے لئے تو مجھے ان پر رشک محسوس ہوا۔ لیکن میں وہ لمحہ کبھی نہیں بھول سکتی جب ایک ملازمہ کے دوپٹہ پر پانی کی کچھ چھینٹیں پڑ گئی تھیں اور تم نے اسے بلا کر ڈانٹا تھا۔

شمع! اس دوپٹے پر پانی کی چھینٹ کیسی پڑی ہے اور تو اسے پہنے پھر رہی ہے اور کام کر رہی ہے۔ مہمانوں کا بھی خیال نہیں ہے۔ جا جا کر آ اور یہی نہیں تم نے ذرا سی دیر کے بعد دوسرے کمرے میں جا کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ کھینچ مارا اور کیوں نہ مارتیں صاف شفاف کمرے میں جس میں ہزار روپے کے قالین بچھے ہوں اگر اگالدان گر جائے تو اس کمرے کی آبرو ہی رہ جائے گی۔ تم نے اس کو ملازمت دی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ صاف رہے لیکن اگر بالفرض وہ اس طرح پانی کی سرخی کپڑے پر ڈال لے تو یقیناً تمہاری شان میں، تمہاری دلکشی کے حسن میں فرق آ جائے گا اور ظاہر ہے کہ داغدار شیشہ کون خریدتا ہے۔ تم جس معاشرت کی عادی ہو اس میں یہی ہوا کرتا ہے۔

خیر اس کا ذکر چھوڑو، نہ جانے میں نے اس خادمہ کا ذکر کیوں چھیڑ دیا وہ جو لمحہ تھا کہ تم سے کچھ نہیں کہہ سکی۔ تمہارے شان سے رہنے کے باوجود تمہارے صوفوں پر بیٹھنے کی ہمت نہیں کر سکی نہ جانے اس کا ذکر کیوں آ گیا۔ مجھے اپنے اوپر اکثر غصہ آتا ہے۔ میں جب بھی تمہارا تصور کرتی ہوں تو مجھے یہ عکس نظر آتی ہے جو مجھے۔ یہ سب کچھ کہنا ہے ایک کہنی ہے یہ میں تم کو پھر کبھی بتاؤں گی۔

ہاں تو مجھے صوفے پر بٹھا کر تم اس بڑی کوٹھی میں کہیں غائب ہو گئیں اور اتنے بڑے کمرے میں جس میں رنگین قمقمے لگے ہوئے تھے، میں تنہائی محسوس کرنے لگی۔ اور ڈر لگنے لگا کہ کہیں میرا وجود اتنے بڑے کمرے میں کھو نہ جائے اور اسی سے میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک تصویر نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور پھر جیسے سورج کی پہلی کرن پڑنے کے بعد کنول منہ پھیلائے بانہیں پھیلا کر جاگ اٹھتا ہے اسی طرح میری تنہائی ختم ہو گئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس تصویر نے ساری کمی پوری کر دی۔ ایک عورت کی تصویر، عام عورت جو بڑے سادہ لباس میں ملبوس تھی اور اس کی سادگی ہی اس کی جان تھی۔ اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی اداسی تھی جس میں فکر کی پرچھائیاں چھائی ہوئی نظر آتی تھیں یہ تصویر نہ جانے اتنے والی شان کوٹھی میں کیوں آ گئی اور کیسے اس کونے میں جگہ حاصل کی۔ بعد میں تم نے بتایا کہ یہ تصویر ٹیگور کی تھی۔ میں بڑے غور سے تصویر دیکھ رہی تھی کہ اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی اور تم چلی آ رہی تھیں۔ مجھے ذرا سی دیر پہچاننے میں وقت ہوئی اس لئے کہ تم ساری کے بجائے غرارہ اور جمپر پہنے ہوئے تھیں اور میں سوچنے لگی کہ مجھے یہاں آئے ہوئے جیسے صدیوں ہو گئے لیکن میں تو ابھی آدھ گھنٹہ پہلے آئی تھی اور اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ تم نے وہ ساری حسب معمول پہن رکھی تھی۔ لیکن میرے اوپر تمہاری شخصیت کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا اور میں احساس کمتری کے بوجھ تلے دبی چلی جا رہی تھی۔ تم اس وقت مغل شہزادی معلوم ہو رہی تھیں اور تم آ کر صوفے پر دراز ہو گئی تھیں اور میں سمجھی کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ اتنے میں دوسرے کمرے

سے بھائی جان داخل ہوئے۔ بھائی جان تیزی سے آ رہے تھے مگر میں نے دیکھا کہ تم کو دیکھ کر ان کے قدم آہستہ ہو گئے اور تم نے بڑی عجیب و غریب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ معاف کرنا اس وقت تم مجھے بہت بدصورت معلوم ہو رہی تھیں اور پھر تم نے کہا۔

"پیارے، دوا کی ایک خوراک پی لو، تم بڑے بے وقوف ہو، گھڑی دیکھو۔ ۱۰ منٹ زیادہ ہو چکے ہیں، شہلا زرا صاحب کی دوا کی ایک خوراک تو فنجان میں لانا۔ تم نے ایک اور خادمہ کو آواز دی اور میں تمہارے گھر کی تیز رفتاری کی قائل ہو گئی۔ اس لئے کہ ادھر تمہاری زبان سے بات نکلی تھی اور ادھر شہلا فنجان لے کر آموجود ہوئی اور میں نے دیکھا کہ شہلا کی نظریں بھی گویا قالین میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں، تمہارے یہاں سب ملازمائیں قالین ہی کو کیوں دیکھتی ہیں۔ تمہاری حسین آنکھوں کو کیوں نہیں دیکھتیں بڑی بدمذاق ہیں۔

بھائی جان نے فنجان لے کر دوا غٹاغٹ پی لی اور تمہارے حکم کا انتظار کرنے لگے اور تم نے فوراً کہا "جاؤ اب۔ ۲۰ منٹ بستر پہ آرام کرو، ۲۰ منٹ دوا پینے کے بعد آرام کرنا ضروری ہے۔"

بھائی جان نے آہستہ سے کہا "لیکن دوا بڑی کڑوی ہے۔ سارا منہ خراب کر دیا" "دوائیں ہمیشہ کڑوی ہوتی ہیں" میں نے دل ہی دل میں بھائی جان کو جواب دیا۔ لیکن تم نے اپنے پہلے حکم پہ نظرثانی کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی اور بھائی جان نے میری طرف بڑی حسرت سے دیکھا اور میں نے بھی ان کو دیکھ کر اسی طرح سر جھکا دیا جیسے بھائی جان نے تم کو دیکھ کر سر جھکا لیا تھا، جیسے خادمہ نے تم کو دیکھ کر قالین کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اور بھائی جان سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میرا دل دھڑکنے لگا، میں نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیا اور ڈرنے لگی کہ کہیں یہ دھڑکن کی آواز تم تک نہ پہونچ جائے۔

پھر تم میری طرف مخاطب ہوئیں۔

"تو آپ افسانے لکھتی ہیں"

"جی ہاں" مجھ سے غلطی ہوئی جو میری زبان سے "جی ہاں" نکل گیا۔ اس لئے کہ اپنی زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے افسانہ نگار ہونے سے شرمندگی ہوئی۔ تم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"افسانے تو مجھے بھی پسند ہیں لیکن انگریزی اور فرانسیسی زبان کے اور منہ کا مزا بدلنے کے لئے کبھی کبھی چینی کہانیاں بھی پڑھ لیتی ہوں، لیکن اردو افسانے مجھے خاک پسند نہیں، بھلا یہ بھی کوئی افسانے ہوئے، اسی لئے میں نے آج تک اردو کا ایک افسانہ بھی نہیں پڑھا"

میں نے کہا "جی ہاں یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔"

اور تم نے میرے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے کہا "آپ افسانہ کیسے لکھتی ہیں"

میں نے کہا "بس قلم اٹھا کر کاغذ پر لکھنا شروع کر دیتی ہوں۔"

"نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ افسانہ کا پلاٹ کہاں ملتا ہے" تم نے اپنی بات کی اپنی نظر میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

جب کہانی کا موضوع مل جاتا ہے تو پلاٹ بھی بُرے بھلے بن ہی جاتا ہے" میں نے اس بار ذرا سنجیدگی سے کہا۔

لیکن یہ موضوع کہاں ملتا ہے؟ میں تمہارے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہتی تھی لیکن تم ہی سوچو اگر اس کا جواب نہ دیتی تو کتنی بڑی بداخلاقی ہوتی اور اسی لئے میں نے کہا۔

"موضوع ــ ہر جگہ مل جاتا ہے۔ اس کی ہمارے دیس میں کوئی کمی نہیں"

"ہر جگہ!" میں نے دیکھا کہ تم یہ سن کر دنگ رہ گئی تھیں، لیکن میں نے تمہاری حیرت کا پھر بھی جواب دینا چاہا۔

"جی ہاں، ہر جگہ"

"اچھا تو آپ کو یہاں بھی موضوع مل سکتا ہے"

"جی ہاں، کیوں نہیں" لیکن یہ کہنے کے بعد میں نے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کیا اور سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے

جم گئے اور نہ جانے ابھی میرا کیا حال ہوتا کہ تمہاری ملازمہ شمع کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے اپنے جملے کی ساری قوت شمع کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی۔ تم نے بھی شمع کی طرف دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا اور پھر بڑے شفقت آمیز لہجہ میں شمع کی طرف مخاطب ہو کر بولیں۔

"شمع! اپنے اوپر افسانے لکھوالے گی، یہ بھی اب افسانہ نگار ہیں۔" اور اس کے جواب میں شمع نے قالین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ضرور" اور میں نے شمع کی طرف غور سے دیکھا کہ اس سے یہ کہتے ہی تمہارے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو ڈرتے ڈرتے دیکھا اور دیکھنے کے بعد جیسے اطمینان کا سانس لیا، اس لئے کہ تم خوش تھیں اور تمہاری خوشی کو دیکھ کر شمع کے لب پر ایک ہلکی لکیر سی ہویدا ہوئی، عارض پر ایک حلقہ سا بنا اور پھر سارا چہرہ دوسرے لمحے پُر سکون ہو گیا۔ جیسے وہ بالکل خالی الذہن ہو۔

اور شاید بھائی جان کو لئے ہوئے دو منٹ ہو گئے تھے کیونکہ وہ آہستہ آہستہ چلے آ رہے تھے اور تم نے ان کو پہلے تو گھور کر دیکھا پھر اپنی گھڑی دیکھی اور شمع سے کہا "جاؤ صاحب کے لئے سوپ لے کر آؤ۔"

شمع الٹے پاؤں چلی گئی اور صاحب صوفے پر بڑے ادب سے بیٹھ گئے۔ اس وقت میرا بڑا جی چاہا کہ بھائی جان سے کچھ بات کروں لیکن نہ جانے کیوں بڑی دیر تک میری ہمت نہ پڑی۔ آج جب میں یہ بات سوچ رہی ہوں تو مجھے اپنے اوپر ہنسی آتی ہے۔ لیکن ذرا سی دیر بعد میں نے جھجکتے ہوئے کہا "کہئے بھائی جان آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

لیکن بیشتر اس کے بھائی جان کوئی جواب دیں تم نے فوراً کہا۔

"آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ اب زکام کی شکایت ہے کل رات بستر پر جانے سے پہلے دو چھینکیں آئیں۔ میں تو گھبرا گئی تھی مگر پایا آ گئے انھوں نے ڈاکٹر کو فون کیا۔ پھر ڈاکٹر نے آ کر دوا دی۔ اور آرام کرنے کی تاکید کر دی۔ مگر یہ کہیں مانتے ہیں۔ خدا کا نام لو جو انھوں نے ایک لمحے کے لئے بھی آرام کیا ہو اور پھر جب سے تمہارے آنے کی خبر سنی ہے اور بھی چل پھر رہے ہیں ـــــ میں نے لاکھ منع کیا کہ اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں وہ خود آ جائیں گی کار جا رہی ہے۔ ویسے یوں بھی تم کو ہماری کوٹھی کا پتہ معلوم ہے مگر بھلا یہ ماننے والے تھے۔ جا کر ہی دم لیا ـــــ یوں تو میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ کار آہستہ لے جانا۔ مگر پھر بھی اس موسم میں ان کے لئے باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ اب تم ہی ان کو سمجھاؤ۔ دیکھتی ہو تندرستی کتنی خراب ہو گئی ہے" ـــــ میں نے غور سے بھائی جان کی طرف دیکھا واقعی وہ بہت دُبلے ہو گئے تھے۔

اتنے میں شمع سوپ لے کر آ گئی۔ بھائی جان نے سوپ پیا ـــــ تمہارے الفاظ میں سوپ لیا۔ معاف کرنا یہ ہماری زبان کی خرابی ہے کہ ہم سوپ پینا کہتے ہیں۔ پھر انھوں نے تمہاری طرف حسب معمول دیکھا اور تم فوراً بولیں جیسے پہلے ہی اپنے ذہن میں جملہ سوچ چکی تھیں۔

"اب ذرا پانچ منٹ کمرے میں چہل قدمی کر آئیے۔ یہ سوپ ذرا بھاری ہے۔ ہاضم ہونے میں آسانی ہو گی۔"

اور میں نے سوچا کہ تمہارا مطالعہ انگریزی اور فرانسیسی افسانے تک ہی نہیں محدود ہے تم طب سے بھی خوب واقف ہو۔

پھر تم نے گھنٹی بجائی اور ایک نئی خادمہ آئی جس کو تم نے میری چائے کے لئے حکم دیا۔

ذرا سی دیر کے بعد ہم دوسرے کمرے میں چائے کی میز پر پہنچے۔ اس درمیان میں تم نے سفر کے بارے میں دو ایک باتیں دریافت کیں۔ اس زمانے میں سفر کی دقتوں کا ذکر کیا جب ہر ڈبہ چار پانچ آدمیوں سے بھرا رہتا ہے اور جب تک کہ پہلے سے انتظام نہ کر لیا جائے جگہ ملنا مشکل ہوتی ہے۔ معاف کرنا مجھے یہ ساری گفتگو بے معنی محسوس ہوئی ـــــ چائے کے ساتھ بیسیوں قسم کی چیزیں تھیں۔ مجھے اس وقت بڑی بھوک لگ رہی تھی لیکن میں تمہارے ماحول میں اتنی اجنبی تھی کہ میری ہمت نہ ہوتی تھی کہ بسکٹ کا ایک ٹکڑا بھی کھاؤں۔ میں نے چائے پیتے ہوئے ڈرتے ڈرتے ایک بسکٹ اٹھایا۔ تم نے بڑے انداز کے ساتھ کہا "معاف کیجئے گا۔ میں اس وقت چائے نہ پی سکوں گی۔ ابھی ایک دوست آ گئی تھیں ان کے ساتھ ڈیڑھ پیالی پی چکی ہوں۔ اب صرف ایک چمچ جیلی لوں گی۔"

اور میں نے تمہارے چہرے کی طرف غور سے دیکھا "اچھا ہوا جو بھائی جان آ گئے"، اور تم نے مجھے نہیں دیکھا، اور بھائی جان نے کہا۔

اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میں بھی ایک پیالی چائے پی لوں؟"

لیکن تم نے ان کو صرف چوتھائی پیالی پینے کی اجازت دی، مجھے بھائی جان پر بڑا رحم آیا کیونکہ یہ وہی بھائی جان تھے جن کے سامنے کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی ایک پیالی کو بھی توڑے۔ لیکن میں بھی کوئی مدد نہ کر سکی کیونکہ مجھے بھی تمہاری بڑی بڑی نیلگوں آنکھوں سے ڈر لگنے لگا تھا اور اتنی ہمت نہ تھی کہ میں کچھ کہہ سکوں۔ اس درمیان میں کافی دیر خاموشی رہی میں دوسری پیالی پی رہی تھی جب تم نے سکون کو توڑتے ہوئے کہا۔

"بھئی میرے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آپ سچ مچ کی زندگی سے افسانہ کیسے بنا لیتی ہیں۔ آپ کو یہ لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا کہاں سے ہر جگہ مل جاتے ہیں"

"کیا ضروری ہے کہ ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں ہی پر کہانی لکھی جائے۔"

"تو کیا روزمرہ کی زندگی پر لکھی جا سکتی ہے" تم نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

جی ہاں روزمرہ کی زندگی ہی پر کہانی لکھی جاتی ہے" میں نے اپنی بات پر نہ جانے کیوں زور دیتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ روزمرہ کی زندگی کیا دلچسپ ہوتی ہوگی۔"

"جی نہیں۔ بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔"

"اب بتائیے میری زندگی پر کہانی لکھی جا سکتی ہے"

"جی ہاں —— کیوں نہیں" اور میں نے اس ہی لمحے دیکھا کہ تمہارے چہرہ پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا اور تم بے حد پریشان ہو رہی تھیں۔

"لیکن دیکھئے —— تم نے کہنا شروع کیا "میرے اوپر کوئی کہانی نہ لکھئے گا" اور میں نے بھائی جان کی طرف دیکھا جو بڑی دیر سے اپنے چوتھائی پیالی لئے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ میرے ذہن میں اتنے بہت سے خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے کہ میری کچھ دیر تو سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے کیا پوچھا ہے اور میں کیا جواب دوں، لیکن پھر میں نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں"

اور اتنے میں ہم لوگ جانے کی میز سے اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھے۔ تم ایک اور کمرے میں "بس دس منٹ" کہہ کر چلی گئیں۔ لیکن بھائی جان اپنی کرسی پر بیٹھے رہ گئے تھے اس لئے کہ جیسے ہی میں نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا تو شمع بڑی بے چینی کے ساتھ ان کی پیالی میں چلتے ڈنڈل رہی تھی اور شمع کے چہرے پر بھائی جان کے لئے بڑی ہمدردی کے آثار نظر آ رہے تھے اور بھائی جان جیسے ہمہ تن شکر یہ ہوں اور میں نے اندازہ لگایا کہ بھائی جان تمہارے مقابلے میں شمع سے زیادہ قریب تھے یہ ہو سکتا ہے کہ میرا واہمہ ہو ——

میں قدم بڑھاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور جب تم پندرہ منٹ کے بعد آئی ہو تو سیاہ ساڑی میں ملبوس تھیں اور بالوں کی لٹیں عجیب طرح سے بکھری ہوئی تھیں۔ واقعی آرائش حسن تو کوئی تم سے سیکھے۔ مگر اس وقت میں تمہارے حسن کی طرف متوجہ نہ تھی بلکہ یہ سوچ رہی تھی کہ آخر اتنی جلدی کپڑے بدلنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اب مجھے حیرت نہیں ہے اس لئے کہ یہ تو تمہاری عادت تھی اور تم کوئی بات خلاف عادت نہیں کرتیں اور پھر تم نے ادھر ادھر کی بے ربط باتوں کے بعد مجھ سے یہی کہا کہ "بھئی سچ بتاؤ تم میرے اوپر تو کہانی نہیں لکھو گی۔"

میں نے تم کو نہ جانے کتنی بار یقین دلایا کہ میں تم پر کہانی نہیں لکھوں گی مگر نہ جانے تم کو میری بات پر یقین نہ آیا اور تم نے پھر اچانک میرے افسانوں کے بارے میں کہنا شروع کر دیا "بھئی مجھے تو تمہاری کہانیاں بہت پسند ہیں بڑی اچھی کہانیاں لکھتی ہو۔ تمہارے بھائی جان بھی بہت پسند کرتے ہیں تمہاری کہانیوں کو" اور مجھے یہ سوچ سوچ کر تکلیف ہو رہی تھی کہ یہ ساری گفتگو بے مقصد اور بے معنی۔ کاش ذرا سی بھی رکھی ہوتی۔ لیکن میں برابر محسوس کر رہی تھی کہ تم یہ سب کچھ یوں ہی کہہ رہی ہو۔

میں نے دیکھا کہ شمع بار بار کمرے میں آ رہی تھی اور مجھے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی کہ یہ مجھ سے اپنی کہانی کا تقاضا کر رہی ہے۔ واقعی وہ اس کی مستحق ہے کہ اس پر کہانی لکھی جائے۔ میں اس پر کہانی ضرور لکھوں گی اور اس کی نظروں کا قرض ادا کر دوں گی۔ لیکن پہلے تم کو یقین دلا دوں کہ تم پر کوئی افسانہ نہ لکھوں گی اس لئے کہ تمہاری شخصیت میں افسانہ کا ایسا کوئی مواد نہیں ہے اور تم خود جانتی ہو کہ افسانے کے لئے دلچسپ ہونا ضروری ہے۔ اور تمہاری زندگی میں ایسی کوئی دلچسپی نہیں ہے جس سے کوئی دلچسپی لے سکے۔ شمع سے کہنا اگر میں اس پر کہانی ضرور لکھوں گی اور کبھی کی لکھ چکی ہوتی اگر میں شمع کی زندگی سے تم کو الگ کرنے میں کامیاب ہو سکتی لیکن جو کام میں اپنی کہانی کے لئے نہ کر سکی کاش شمع اپنی زندگی کے لئے کر سکے اور یہ بھی نہیں تو نہ سہی بس ایک نظر اٹھا کر تمہاری طرف دیکھ سکے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کتنی خوبصورت ہو، لیکن وہ بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں جن میں مجھے حسن نظر آیا تھا غالباً شمع کو اس سے ڈر معلوم ہوتا ہوگا اور آج بھی اس کی سہمی سہمی نظریں مجھے اس قالین میں کچھ تلاش کرتی نظر آ رہی ہیں نہ جانے وہ اس کشمیری قالین کے سینے کو چیر کر کیا دیکھنا چاہتی ہیں۔

شمالہ

رضیہ سجاد ظہیر

معجزہ

ڈھول زور زور سے بجنے لگا: "ڈم، ڈگڑ ڈگڑ ڈگڑ ڈگڑ ڈم ڈگڑ ڈگڑ" کھمبوں کے بیچ میں ڈوری کا بندھ چکی تھی۔ ڈوری کے دونوں سروں پر کھمبوں میں ہار پیٹ دیئے گئے تھے۔ اور ولاؤ ھاگا بھی ڈیڑھ گز دیکر بندھا تھا۔ دہنے ہاتھ والے کھمبے کے پاس مجو شاہ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ گلے میں پھولوں کا موٹا سا ہار۔ لال لنگوٹ، سر کے بال تیل سے خوب چمکتے ہوئے اور ناک اور اوپر والے ہونٹ کے بیچ ایک چھوٹا سا سیاہ مسّہ جو ہر بار گردن ادھر ادھر ہلانے سے دکھائی دے جاتا تھا۔

چاروں طرف لوگ جمع ہوتے جا رہے تھے۔ آج مجو شاہ بہت دنوں کے بعد پھر اپنی نٹ بازی کے کمالات دکھلانے والے تھے۔ اور ہجوم رسی بندھے ہوئے کھمبوں کے چاروں طرف ایک گھیرے کی شکل میں اکٹھا ہو گیا — ڈھول پھر بجنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اعلان کرنے والے کی آواز "ڈم ڈگڑ ڈگڑ — معجزہ پروردگار کا — شکر پالنہار کا — رب ہی کو سب حمد واجب ہووے ہے۔ معجزہ پروردگار کا۔ انسان جو کچھ کر دکھاوے ہے وہ سب اس کی ہی کرپا ہووے ہے — شکر پالنہار کا — آج دیکھو لوگو — مجو شاہ کا کمالات — ایسا کمال، شہر بھر، ملک بھر، دنیا بھر میں دیکھنے میں نہ آوے گا — دیکھو لوگو — آئیو لوگو — ڈم ڈگڑ ڈگڑ ڈگڑ ڈگڑ — آئیو لوگو، پھر مت پچھتائیو لوگو — ڈم ڈگڑ..."

ایک آدمی انگوچھا گلے میں باندھے اس کے ایک سرے پر جھولی بنائے سب سے ایک ایک آنہ اکٹھا کر رہا تھا —

پھر مجو شاہ کھڑا ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس نے نظریں اٹھا کر ڈوری کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ مڑ کر اپنے ایک ساتھی سے کچھ پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔ جیسے کہتا ہو "ہاں"۔ مجو شاہ نے ایک ہاتھ سے کھمبے کو ہلا کر دیکھا۔ ڈوری پر پھر ایک نگاہ ڈالی۔ ایک ہاتھ کو ادھر رکھ کے ایک پاؤں کھمبے پر جمایا اور دوسرا اٹھایا — اتنے میں پیچھے بھیڑ میں سے ایک لڑکا ایک بڑی سی ٹوکری لئے نکلا۔ اس میں بہت سے گھڑے بھرے تھے۔ سرخ سرخ مٹی کے گھڑے جن پر سفید کھریا سے پھول بوٹے بیلیں بنی ہوئی تھیں۔ مجو شاہ کھمبے سے اتر آیا۔ گھڑوں کو قریب لانے کا اشارہ کیا۔ ان میں ایک کو اٹھا کر سے اونچا کر کے گھمایا اور پھر رکھ دیا — مجمع میں اشتیاق کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"اب گھڑے آ گئے۔ اب دیکھیو۔ کتنے کتنے گھڑے سر پر رکھ کر چلے ہے" فخرو بولا۔

"کیا بات ہے میرے شیر کی! کمالات کا بنا ہوا ہے" اشرف نے جوش میں آ کے ہاں میں ہاں ملائی۔

"ابی وہ پچھلے سال جو سرکس آیا تھا۔ اس میں جو میم آئی تھی وہ اس کا کمال دیکھ کے اس پر عاشق ہو گئی تھی" اللہ دیا کہنے لگا۔

"اور کیا — دن نے کتنا کہا کہ میرے ساتھ چلا چل۔ پر یہ بیٹھا یہی کہے گا کہ میں چلا جاؤں گا تو میرا علم کون اٹھا دے گا۔ میرے اماں باڑے کی بتی گل ہو جاوے گی" محمود بولا۔

"جو چلا جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے وہ تو ہزار روپیہ پیدا کرے تھی" ایک بڑے میاں بولے جو بستی میں اپنی کنجوسی کیلئے مشہور رہتے۔

"ابی ہاں! کاہے کو چلا جاتا دین کے ساتھ" اللہ دیئے نے چڑھ کے جواب دیا۔ "روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل ہووے ہے۔ ادھر آیا ادھر گیا۔ چار دن کی چاندنی"

"تو یہاں اس کے کون سے جورو بچے بیٹھے تھے، جیسے یہاں ویسے ہی اور جگہ" بڑے میاں نے اپنی بات صحیح ثابت کرنے کیلئے دلیل پیش کی۔

شاہراہ

"تو ہو رہے ہیں ۔۔۔ سب کچھ نہ ہو سکے ہے ! باپ گھر چھوڑ دیتا، باپ دادا کی زمین چھوڑ دیتا، آدمی وہ قسمت والا ہو جس مٹی سے پیدا ہوئے اسی میں پیوند ہو ۔۔۔ یہ
اللہ دیا جھگڑنے لگا۔

"تم بھی بڑے بیار ہیں ہر وقت روپے کی ہی سوچو ہو۔ کل کو تیں ہو جاؤ گے تو سب یہاں ہی دھرا رہ جائے گا ٹینٹ میں باندھ کے نہ لے جانے کے ہو
ساتھ۔ بڑے فخرے سو خیرے مرے اڑائیں گے۔"

اتنے میں ڈھول بجنے لگا، ڈر ڈگڑ ڈگڑا ڈگڑا ۔۔۔ "معجزہ پروردگار کا، شکر پالنہار کا ۔۔۔" مجو شاہ نے کھمبے پر چڑھنا شروع کیا۔ دھیرے دھیرے وہ کھمبے کے سرے سے ہوتے ہوئے رسی پر پہنچ گیا۔ رسی پر کھڑے ہو کر اس نے اپنے جسم کو ایک مرتبہ تولا اور پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ رسی ایک بار ہلی، اس کا جسم بھی لچک گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔ ڈھول زور زور سے بجنے لگا۔ مجو شاہ ذرا سا جھکا، ایک لمبے بانس پر ایک گھڑا اوندھا کر کے اونچا کیا گیا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا، یہاں تک کہ ساتواں گھڑا بھی بانس کے سرے سے مجو شاہ کے سر پر پہنچ گیا۔ ساتوں گھڑوں کو سر پر رکھے اس نے ایک قدم اٹھایا پھر دوسرا پھر تیسرا، بیچ کا شوق اور بڑھ گیا۔

"اللہ عمر بڑھاوے، پیسے وصول کر دیئے۔"

"اتا، اس کے جیسا کوئی ہے نہ پوری بستی میں۔"

"انداز رکھے ہے جب ہی تو گڑوں لباطم سے کے چلے ہے اس شان سے کہ دیکھو تو بس اتنے، جیسے کوئی چیتا جا رہا ہے۔"

"اور کمال ہے کہ ایک ہاتھ سے ماتم بھی کرتا جا رہے ہے۔"

"اجی ابھی کیا ہے، جب تلا کھاوے کانپ دیکھیو ۔۔۔ لگے ہے جیسے سارے بدن میں ہڈی ہی نہ ہے۔"

دھیرے دھیرے چلتا ہوا مجو شاہ اب دوسرے کھمبے تک پہنچ گیا تھا۔ یکایک وہ ایک دفعہ ذرا سا اچھلا اور چشم زدن میں مڑ گیا۔ مجمع نے سانس روک لی۔ پھر بانس پر گھڑے چڑھائے گئے ۔۔۔ ایک دو تین ۔۔۔ پورے چودہ ۔۔۔ اب اس کے سر پر اکیس گھڑے تھے۔ سب سے اوپر والا گھڑا چھوٹا سا گنگ تھا ۔۔۔ ڈھول زور زور سے بجنے لگا "معجزہ پروردگار کا ۔۔۔ شکر پالنہار کا ۔۔۔" مجو شاہ نے ایک قدم اٹھایا، رسی جھکی، دوسرا قدم اٹھایا، گھڑے ذرا ہلے، پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور تیسرا قدم اٹھایا۔ رسی پھر جھکی، پھر یکایک تھرتھرانے لگی۔ اس نے دوسرا پیر اٹھانے کی کوشش کی، رسی کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی تھرتھرانے لگے۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر سنبھلنا چاہا۔ گھڑے ڈگ ڈگ ڈگ کرنے لگے، اور پھر ایکدم سے ہوا میں اکیس گھڑے بکھرتے ہوئے اور دو پھیلے ہوئے ہاتھ کپکپاتے ہوئے دکھائی دیئے ۔۔۔ مجمع سے ایک چیخ نکلی "مر گیا!"

"پانی لاؤ ۔۔۔ پانی۔"

"چکر آ گیا۔"

"ایسا تو برسوں میں کبھی نہ ہوا ۔۔۔ گے آج ہوا کیا؟"

"اجی آدمی کا پیر ہی تو ہے ۔۔۔ نہ سنبھل سکا۔"

"گے نٹ بازی کمبخت ہی بری بلا ۔۔۔ بیڑا غرق ہو اس کا۔"

"جان جوکھم کا کام ہے جی۔"

"ارے تو ذرا ہوا تو کھلو ذرا ۔۔۔ اوپر چڑھے چلے آؤ ہو۔"

"ہو جی ہو ۔۔۔ یہاں کیا تھیٹر ہو رہا ہے ۔۔۔ اس کی جان جا رہی ہے، تم لوگ تماشہ بنا رہے ہو گے۔"

مجو شاہ کے ساتھیوں نے جلدی جلدی سب لوگوں کو ہٹایا، کوئی دوڑ کر ایک دری لے آیا جو وہیں بچے ہوئے گھڑوں کے پاس بچھا کر اس کو لٹا دیا گیا۔ پانی کے چھینٹے دیئے گئے، مجمع میں سے کسی نے اپنے کان میں سے عطر کا پھایا نکال کر سنگھانا شروع کیا، پنکھا جھلا جانے لگا، تھوڑی دیر میں ہوش آ گیا۔ ہوش آتے ہی اس نے اشارہ سے ایک گھڑا اپنے پاس کھسکوایا اور لیٹے لیٹے دھیرے دھیرے اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

شاہراہ

"کیسے ہو بادشاہ؟" اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"اچھا ہوں" اسنے دھیمے سے جواب دیا۔ "مرنے کا تو نہیں ہوں، پر ابھی پر اب نہ چڑھا جائے گا" اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کے پھر خاموشی سے گھڑے پر ہاتھ پھیرنے لگا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"اجی تم اپنا دل کاہے کو چھوٹا کرو ہو استاد۔ ابھی تو ہم لوگ ہیں گے" اس کے ایک شاگرد نے پاؤں سہلاتے ہوئے کہا۔ مجو شاہ نے ایک لحظہ کے لئے آنکھیں کھولیں، محبت سے اپنے شاگرد کو دیکھا۔ دونوں آنکھوں کے سرے سے ایک ایک قطرہ آنسو کا ڈھل پڑا، پھر آنکھیں بند ہو گئیں!

علاج معالجے سے اس کی جان تو بچ گئی۔ لیکن نہ جانے کیسی چوٹ آئی تھی کہ جس پل وہ گرا تھا اُدھر کا پاؤں بالکل بے کار ہو گیا تھا اور ہاتھ بھی زیادہ محنت کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ بستی میں بہت سے لوگوں نے اسے بیساکھی لگانے کی رائے دی۔ لیکن اس نے ایک طرف سے گھسٹتے ہوئے تقریباً رینگنے کی کیفیت کو ترجیح دی، اور بیساکھی لگانے سے انکار کر دیا۔ پھر بھی نٹ بازی کے ہر میدان میں وہ آتا ضرور تھا۔ گلے میں پھولوں کا ہار پہنے کھمبے کے پاس ایک چٹائی پر بیٹھا وہ گھڑوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتا رہتا۔ جو نٹ رسی پر چڑھنے جاتا وہ اس کے پیر ضرور چھوتا اور مجو شاہ کھمبے پر چڑھتے ہوئے نٹ کے پیروں کو غور سے دیکھتا رہتا۔ کبھی نظر پھسل کر پھر گھڑوں پر آ جاتی اور ٹھنڈی سانس کے ساتھ آہستہ سے منہ سے نکل جاتا: "معجزہ پروردگار کا ـــ شکر پالنہار کا ـــ"

علم اٹھانا البتہ اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ ایک ہاتھ تو اس کا مضبوط تھا، پھر وہ کیوں علم اٹھانا چھوڑتا؟ ہاں، اتنا ضرور کیا گیا تھا کہ بیچ میں ڈوری باندھ کر دو اور آدمی بھی علم کو سہارا دیئے رہتے تھے۔ نیچے مجو شاہ بغل میں علم دبائے اس کے ڈولتے بانس کو اپنی ٹھوڑی میں اڑلائے سینے سے بھینچے تعزیے کے آگے آگے رینگتا ہوا لکیر سی بناتا اور اوپر علم کا سبز پھریرہ دھیرے دھیرے لہراتا جاتا۔

محرم آتے ہی اس کے مفلوج جسم میں ایک نئی جان سی پڑ جایا کرتی تھی۔ گھسٹتا گھسٹتا وہ ہر اس جگہ جا پہنچتا جہاں محرم کی تیاریاں ہوتی رہتیں۔ اور اپنی خدمات اور رائیں پیش کرتا۔

"اجی فاخری بی بی تو ـــ کیا علم کے پنجے مانجھ رہی ہوگی۔ لاؤ میں مانجھ دوں!"

"ابے اللہ دیئے گے تلا پار گا کاغذ ـــ جیسے پوربیوں کا بھات۔ ارے مجھ سے کاہے کو نہیں کہا۔ اچھے سے اچھا منگوا دیتا۔"

"لا مجھے چھڑی دے شبراتی، دیکھ کیسی کھپچیاں نکالوں ہوں کہ طبیعت خوش ہو جاوے گی!"

"اس نوری سے پکواؤ گے بی بی تو بگڑ جاوے گی نہ تو کیا سدھرے گی؟ پھوہڑ جنم جنم کی ـــ لاؤ مجھے دو، میں ابھی فردٹ پکا کے لاؤں ہوں۔"

کام کرتے کرتے وہ باتیں بھی کرتا جاتا۔ "اجی کیا بات تھی بڑے میر صاحب کی ـــ اب ویسا مرثیہ کوئی نہ پڑھ سکتا۔ ان کی بات انکے ساتھ گئی! وہ کیا تھا محمود ـــ وہ . . . . . جا دیں ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو ـــ آوے ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو ـــ کیا پڑھیں تھے کہ کلیجہ پانی ہو جاوے تھا ـــ کیا کیا لوگ اٹھ گئے ـــ" پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس کھینچتا۔ آہستہ سے کہتا: "معجزہ پروردگار کا ـــ شکر پالنہار کا!"

اس سال محرم کی پہلی کو جب تمام تعزیئے بن گئے اور امام باڑہ رنگ برنگی روشنی، پھول اور خوشبو سے بس گیا تو مجو شاہ اپنے علم کے آگے ساتویں شمع روشن کر رہا تھا کہ اسے یکایک یہ احساس ہوا کہ لوگوں میں کچھ کھسر پھسر ہو رہی ہے۔

"ابے کیا ہے کیا ـــ کیا بات ہے؟" اس نے ہتیلی بجاتے ہوئے کہا۔

"اجی کچھ نہیں وہ تار کا قصہ ہے" اللہ دیئے نے جواب دیا۔

"تار؟ کیسا تار؟"

"اجی وہ تار ـــ وہ جو کھمبوں میں لگا رہے ہے نہ ـــ اجی وہ تار دینے کا تار ہو وے ہے نہ ـــ وس کے کھمبوں میں کان لگا کر سنو تو

شاہراہ

سن سن سنائی دیوے ہے ——

کھمبے اور، تار کا نام سنکر بھوسنا دیکایک رک گیا۔ ہاتھ کی جلتی ہوئی شمع سے گرم گرم آنسو اس کے ہاتھوں پر ٹپک رہے تھے، پر اسکی آنکھیں پیچھے دور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ کھمبے، ان کے بیچ میں تنی ہوئی ڈوری، اس پر چلتے ہوئے نپے تلے قدم جسم کو سنبھالتے ہوئے، ہوا میں پھیلے ہوئے ہاتھ، سر پر رکھے ہوئے اکیس گھڑے —— پھر اس کے کان میں اللہ دیئے کی آواز آئی: "تو گئے سمجھنے میں آیا ہے کہ نئے جنٹ صاحب تار نہ کٹنے دیویں گے۔"

وہ ایک دم چونک پڑا اور شمع کو اپنی جگہ جما کے، ہاتھ پر گرا ہوا موم چھڑاتے ہوئے بولا: "تو تار نہ کاٹا جاوے گا تو علم کیسے جاویگا؟"

"مجھے بھی تو بات ہے" نوسے نے کہا۔ "وہ کہیں ہیں علم کو جھکا کے لے جاؤ۔ ہر سال اتنا خرچ نہ برداشت کرنے کی، ہے گورنمنٹ۔"

"اچھا! تو گورنمنٹ مولا سے بھی بڑھ گئی؟"

"اجی پر وہ کہیں ہیں . . . ." شبراتی نے کچھ کہنا چاہا۔

"وہ بیوا، ہیں تو کیا اللہ رسول ہیں؟ ہر سال کاٹا جاوے ہے تار۔ کوئی نئی بات ہے؟ بہت کریں گے تار کی بنوائی کے دام دے دیویں گے علم کبھی نہ جھکنے کا ہے۔"

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سب چپ تھے۔

"تم لوگوں نے کیا تھا کہ ہر سال تار کاٹا جاوے ہے؟"

"ہم سے بات کہاں ہوئی۔ بات تو منجھلے میر صاحب سے ہوئی تھی۔"

"چلو میر صاحب کے ہاں" سب امام باڑے سے باہر نکلے۔ مجو شاہ نے امام باڑے کا دروازہ بھیڑا اور سب کے پیچھے ہو لیا۔ رستے سے اور لوگ بھی ساتھ ہوتے گئے۔

دھیرے دھیرے قافلہ منجھلے میر صاحب کی ڈیوڑھی پر پہنچ گیا۔ میر صاحب باہر تخت پر بیٹھے کچھ حساب کتاب کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو آتے دیکھ کر پہلے کچھ حیران ہوئے پھر شاید سمجھ گئے۔ آواز دی "ذرا ایک دری بچھوا دیجیو" دو تین منٹ کے بعد تراشن دری لئے اندر سے نکلی۔ اللہ دیئے نے اور لوگوں کے ساتھ مل کر دری بچھوائی۔ سب بیٹھ گئے۔ مجو شاہ دروازے کے پاس جوتیوں کے نزدیک زمین ہی پر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا۔ منجھلے میر صاحب نے اپنے کاغذ کیش بکس میں رکھے اور تالا بند کرتے ہوئے ان لوگوں کی طرف منہ کئے بغیر بولے۔

"کیا بات ہے۔ تم لوگوں کی مجلس کب ہو رہی ہے؟"

اللہ دیئے نے سب کی طرف دیکھا پھر ذرا ہمت کر کے جواب دیا: "مجلس تو وہی ہووے گی اپنے وقت پر۔" پھر ذرا رک کے بولا: "وہ علم کے واسطے جنٹ صاحب سے پھر بات چیت ہوئی تھی میر صاحب؟"

"اب اس میں بات چیت کیا ہووے گی۔" میر صاحب نے ذرا بے پروائی سے جواب دیا۔

"پھر بھی!" نورا بیچ میں بول پڑا: "اے کہ ذرا ہم لوگ بھی سنا چاہیں کہ وہ کیا کہیں ہیں؟"

"وہ تو میں اللہ دیئے کو بتا چکا ہوں۔ وہ اب کی تار نہ کاٹنے دیویں گے۔"

"آپ سے انوں نے خود کہا؟" فخرو نے پوچھا۔

"ہاں —— خود کہا کہ ہر سال گورنمنٹ اتنا خرچ برداشت کرنے کو تیار نہ ہے۔ یا تو علم چھوٹا بنایا جاوے یا جھکا کے لیجایا جاوے۔"

"پھر آپ نے بھی تو کچھ کیا ہوگا؟" محمود نے سوال کیا۔

میر صاحب چڑھ گئے: "اے انہوں نے کیا مجھ سے رائے پوچھی تھی جو میں کچھ کہتا یا خواہ مخواہ کو اپنی ٹانگ اڑانے لگتا۔ حاکم ٹھہرے۔ ان کا کام حکم دینا ہے کہ خدائی بھر سے پوچھتے پھرنا ہے؟"

شاہراہ

"پردن کو گے معلوم ہے اسے کہ تار ہر سال کٹا جا وے ہے؟" نورا پھر بولا۔

"ارے! تم لوگوں کی بھی کھوپڑی الٹی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ ہر سال کی طرح اب کے نہ ہونے کا ہے — تو ان کو اتنی سی بات نہ معلوم ہوگی؟"

"مگر میر صاحب! ایسا تو ہماری سات پشتوں میں کبھی نہ ہوا۔" اشرف بولا۔

"ابے تیری سات پشتیں ریل گاڑی میں نہ چڑھیں تو تو بھی مت چڑھیو! بس گاڑی پر ہی چلا کر — اُنہہ — کیا عقل ہے!"

"تو میر صاحب اگر خرچے کی ہی بات ہے تو ہم لوگ تار کٹنے کا خرچہ دیے تیار ہیں — آپ جنٹ صاحب سے کہہ دیویں — کیوں بے نورا چندہ کر لیویں گے؟"

"ضرور" نورا نے سینے پر ہاتھ مار کے جواب دیا" اسے کہ ضرور ہو جاوے گا جمعات بستی میں زیادہ تر کاموں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا فرض نورا ہی انجام دیا کرتا تھا۔

"بس ٹھیک ہے، آپ معلوم کر لیویں کتنا خرچ ہووے گا ہم پہلے سے پہلے اکٹھا کر لیویں گے۔" اشرف نے کہا۔

"میں کیوں معلوم کروں۔ تم لوگ اپنے آپ معلوم کرو۔ میں ان سب چکروں میں نہ پڑنے کا ہوں۔" میر صاحب نے کیش بکس دوسری طرف سرکاتے ہوئے جواب دیا۔

اس جواب پر سناٹا سا چھا گیا اور میر صاحب نے خود اس سناٹے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "کل رات سے گڑھیا کے پاس پولیس کا پہرہ لگ جاوے گا۔ میری صلاح مانو تو علم چھوٹا ہی بناؤ اس سال — چھٹی ہوئی — ناحق ناحق کو حاکموں سے ...."

مجمع میں کھسر پھسر شروع ہی ہوئی کہ جوتوں کے پاس بیٹھے ہوئے جوشاہ نے پہلو بدلا — ذرا سا مسکرایا، پھر ہونٹ سکیڑے، پھر میر صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا "میر صاحب" — ساری نگاہیں جوشاہ کی طرف اٹھ گئیں۔ میر صاحب تیوری پر بل ڈال کر اپنے کیش بکس کی طرف دیکھنے لگے۔ جوشاہ نے تھوک گھونٹا اور لبوں پر زبان پھیر کے بولا "میر صاحب! مولانے تو گے نہ سوچا تھا کہ یزید حاکم ہے" پھر وہ ایک دم سے اپنی جوتیاں پہننے لگا اور پہنتے پہنتے بولا "اوروں کی میں نہ کہہ سکتا لیکن جب تک میری جان میں جان ہے نہ تو علم ایک سوت چھوٹا بنے گا، نہ ایک سوت جھکے گا" سب چپ تھے ڈیوڑھی کے پردے کو ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی جیسے اندر سے کوئی یہ سب کارروائی سن رہا ہو اور پھر پردہ برابر ہو گیا یہ سب لوگ اٹھے، میر صاحب کو سلام کر کے چپ چاپ باہر نکل آئے اور خاموشی سے امام باڑے کی طرف چلنے لگے۔ جوشاہ نے اللہ دیئے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کان میں کہا۔

"کے میر صاحب کب گئے تھے جنٹ صاحب سے ملنے؟"

"گئے تھے" اللہ دیئے نے جواب دیا۔

"کس کام سے گئے تھے؟"

"مجھے تو خبر نہ ہے۔"

"تو پتہ لگا — پر دیکھ — ذرا ہشیار رہیو۔"

"تم خاطر رہو" اللہ دیا بھیڑ سے نکل کر دوسری طرف ہو لیا۔ بھیڑ امام باڑے کی طرف بڑھتی گئی۔

منجھلے میر صاحب ہاتھ دھو کے تخت پر کھانا کھانے بیٹھے ہی تھے کہ نیم تلے والی ماما کوٹھری سے نکل کر آئیں۔ میر صاحب نے انہیں سلام کیا انہوں نے دعا دی اور تخت کے ایک کونے میں بیٹھتی ہوئی بولیں۔

شاهراہ

"گے لوگ کاہے کو آئے تھے بھیئے؟"

میر صاحب کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ کسمسا کے بولے "اجی وہی علم کی بات تھی!"

ممانی خاموش رہیں — جیسے کہتی ہوں "ہاں تو پھر؟"

میر صاحب کو مجبوراً آگے کہنا پڑا "یہ لوگ تو عقل کے پیچھے ڈنڈا لے کے پھرتے ہیں ممانی! پوچھو کہاں حاکم ضلع اور کہاں تم دھنوں، جلاہوں، نتوں کی اوقات۔ گورنمنٹ کی حکومت ہے کوئی مذاق تو ہے نہ!"

ممانی خاموش رہیں۔

میر صاحب نے پہلو بدلا اور جال میں پھنسے ہوئے پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے بولے "میں ان سب چکروں میں نہ پڑتا خواہ مخواہ کو، اپنے آپ جا کے ان سے بات کیوں نہ کرتے۔"

ممانی خاموش رہیں!

میر صاحب رو ہانسے ہو کر بولے "آخر کہاں کی جہالت ہے کہ باپ دادا کے وقت سے جتنا علم نکلتا آیا ہے اتنا ہی بڑا نکلے گا چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔"

اتنے میں گھر کی اور بیویاں بھی اکٹھی ہو گئیں۔

"تو علم ہمیشہ سے اتنا بڑا نکلے ہے تو تار بھی تو ہمیشہ ہی کاٹا جاوے ہے کوئی نئی بات تو ہے نہ!" فاخری بوبو بولیں۔

"ان اللہ مارے انگریزوں کا بیڑا غرق ہو یہ کسی کا دین ایمان سلامت نہ چھوڑنے کے ہیں" مرشدہ آپا نے عاجز ہو کے کہا۔

"پولیس والوں کو کچھ دے دلا کر روکا نہ جا سکتا؟" زیب خالہ نے رائے دی۔

"اجی تم لوگوں کی بھی باتیں ہیں، جو باتیں سمجھو نہ ہو اس میں کاہے کو بولو ہو۔ پولیس کیا اپنی مرضی سے ہو ان گئی ہے؟" میر صاحب تیوری چڑھا کے بولے۔

"کیا پولیس لگ گئی ہے؟" ممانی نے پہلی بار آہستہ سے سوال کیا۔

"ابھی تو خفیہ لگی ہے، کل سے باقاعدہ لگ جاوے گی، سوئم تک پہرہ رہے گا!"

"کتنے سپاہی ہوں گے؟" میر صاحب کی بیوی نے گھبرا کے پوچھا۔

"اب ہوں گے جتنے ہوں گے۔ سو دو سو تو ہوویں ہی گے مجھے ٹھیک تو معلوم نہ ہے۔"

"ہے — ہے — اب دیکھو کیا تیرست اٹھے ہے!"

"ہاں ہاں بیوی قیامت تو اٹھے گی ہی!" شفو خالہ بولیں۔ شفو خالہ کسی بھی بحث میں ہر شخص کی بات پر ہاں کہتی تھیں۔

"اب مولا ہی کوئی معجزہ دکھاویں گے، لوگ تو ہرگز علم نہ جھکانے کے ہیں چاہے جان چلی جاوے۔"

"لو بیوی علم کیسے جھکے گا، کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے" عیدن نانی بولیں۔

"ہاں ہاں بیوی۔ علم بھلا کیسے جھکے گا!" شفو خالہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"پر یہ لوگ تو کہیں ہیں کہ خرچا جمع کر دیویں گے" ممانی آہستہ سے بولیں۔

"ہاں ہاں۔ گے تو سب ہی سے ٹھیک ہے!" شفو خالہ پھر بولیں۔

"اب عورتوں کو کیا سمجھایا جاوے، حاکموں کی بات تم لوگ کیا جانو" میر صاحب عاجز ہو کے چڑھ گئے۔

"ہاں ہاں بھیئے بھلا ہم لوگ کیا جان سکیں ہیں حاکموں کی بات!" شفو خالہ نے پھر کہا۔

"پر گے تو ہے بڑا اندھیر!" ممانی آہستہ سے کہتی ہوئی کوٹھری میں چلی گئیں۔ مجمع بکھر گیا اور جس وقت میر صاحب پان کھا کر باہر نکلنے لگے تو انہوں

نے ڈیوڑھی میں ایک ڈولی رکھی دیکھی۔ جس پر پردہ باندھا جا رہا تھا، وہ اُلٹے پاؤں اندر گئے "یہ کون جا رہا ہے اس وقت؟"

"میں جا رہی ہوں بیٹے" ممانی نے کوٹھری سے گٹھری سمیت نکلتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں؟ عشرہ بیان نہ کرنے کی ہو؟"

"نہیں بیٹے! میری مرغیوں کو وہاں کون دیکھے گا۔ میں آئی تھی جب ہی ایک اونگھ رہی تھی۔ دیکھو موقعہ ہوگا تو پھر آ جاؤں گی۔ بکری اللہ ماری الگ ——— جنے کسی نے بھوسہ پانی بھی دیا ہوگا کہ نہ ———"

میر صاحب نے ایک مرتبہ ان کو غور سے دیکھا اور باہر کھسک گئے۔

آٹھویں محرم کو بڑے امام باڑے کے صحن میں حاضری کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کھڑے تھے۔ کچھ کمر میں رومال باندھے ادھر ادھر حصے تقسیم کر رہے تھے اور شربت پلا رہے تھے۔ پیچھے صحن کے چاروں طرف کچھ حصہ کچا چھٹا ہوا تھا۔ اس میں کئی بڑے بڑے درخت تھے جن کی ڈالیوں میں گیس کی لالٹینیں لٹکی تھیں جو بار بار ہوا کے جھونکوں سے ڈولتی تھیں اور شکستہ دیواروں پر دوڑتے بھاگتے کام کرنے والوں کی پرچھائیوں کو اور ہلا ہلا دیتی تھیں۔ دالانوں میں پردوں کے پیچھے عورتیں جن میں سے کچھ بچوں کو سلا رہی تھیں۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں کچھ مرثیہ نوحوں کی بیاضیں الٹ پلٹ رہی تھیں۔ بچوں کا کوئی حساب نہ تھا۔ ہر طرف ہی دس پانچ اونگھتے، سوتے، لڑتے، بھاگتے، کھیلتے پھر رہے تھے اور بار بار حصہ بانٹنے والوں سے ٹکرا کر ڈانٹ کھاتے تھے۔

"اے لو وہ مرشدہ آپا کی لونڈیا شیرمالوں کی ٹوکری میں جا پڑی! دیکھو بھیئے کوئی ثابت بچی کہ سب توڑ دیں؟"

"اس شبراتی کے پوت منتے کر دیا ادھر کو مت آنا کیا بڑکا خون رکھا ہے کا ملتے ہی نہیں چڑھے چلے آویں ہیں شیطان کے سگے" پھر دو چار دھپ لگنے کی آوازیں آئیں۔ دالان کے اندر سے شہ ملتی ہے مار بھیئے ضرور مار، ٹانگ توڑ دے۔ میرا تو اپنے آپ ہی خون جلا ڈالا اس اللہ ماری اولاد نے"

اس تمام چہل پہل سے بالکل الگ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں جو امام باڑے کے اندرونی حصہ میں تھی اور اس وقت سامان نکل جانے کی وجہ سے آجکل خالی ہو گئی تھی، مجو شاہ ایک پٹائی بچھائے دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ تین چار ساتھی اس کے آس پاس تھے اور اشرف گھٹنے پر ایک تختی اور اس پر ایک کاغذ رکھے، ہاتھ میں ایک کلک کا قلم لئے بیٹھا تھا۔ شبراتی ہاتھ میں ایک دھواں دیتی لالٹین اونچی کئے تھا اور اس کی دھندلی روشنی میں مجو شاہ کا چہرہ اور بھی زرد لگ رہا تھا۔ کئی رات نیند نہ پڑنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی آگئی تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ کالی قمیص کے کھلے ہوئے گریبان سے اس کے گلے میں پڑی ہوئی کلاوہ کی ڈوری جھانکتی دکھائی دے رہی تھی جس کو وہ بار بار انگلیوں میں کھینچتا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ بند تھا۔

"ہاں تو کیا لکھا بھیئے" اس نے اشرف سے پوچھا۔

"پورا پڑھ دوں"

"ہاں پڑھ دے سب سن لیویں گے"

اشرف نے پڑھنا شروع کیا "بحضور فیض گنجور جناب جنٹ صاحب سلامت ——— اس سے قبل ہم آپ کی خدمت میں دو درخواستیں روانہ کر چکے ہیں۔ جیسا کہ حضور کو معلوم ہے علم کا معاملہ اب تک طے نہیں ہو چکا ہے۔ ہم لوگ علم کو جھکانے پر تیار نہیں ہیں۔ اس لئے برائے مہربانی حکم تار کاٹنے کا دیا جائے جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے جو کچھ خرچ تار کٹوائی اور لگوائی کا ہووے گا وہ ساکنان بستی کی طرف سے . . . . "

"گے کیا لکھا ہے؟ کون بستی؟" شبراتی نے لالٹین کے پیچھے سے پوچھا۔

"مطلب گے ہے کہ بستی کے رہنے والے" اشرف نے سمجھایا۔

"تو یوں کیوں نہ لکھا" محمد نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" جوشاہ بولا "درخواست میں ایسا ہی لکھا جاوے ہے ۔ ہاں تو پھر بھیجئے"

"ہاں۔ ہاں ۔ تو حاکمان بستی کی طرف سے دیا جاوے گا۔ عرض قبول ہو تحریری کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ اور تھوڑے لکھے کو بہت سمجھا جاوے"

"اور کچھ بھی لکھ دے بھیجئے کہ اس خط کو تار سمجھا جاوے" رحیمو بولا۔

"نہ ۔ نہ ۔ حاکموں کو کچھ سب نہ لکھا جاتا" اشرف نے جوشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں بس اتنا ٹھیک ہے" جوشاہ نے کہا۔

"مگر اس میں یہ تو لکھا ہی نہ گیا کہ ہم لوگ ظلم ہرگز نہ جھکانے کے ہیں" ٹیلے والے فقیرا چاچا نے اعتراض کیا۔

"لکھا ہے" جوشاہ زور سے بولا۔

"کہاں لکھا ہے میں نے تو نہ سنا"

"ہونہہ" شبراتی جل گیا اور آہستہ سے بولا "اب تم تو بہرے بھنڈ ہو اب تمہارے لئے کوئی کہاں تک گلا پھاڑے"

جوشاہ نے اس کا پہلو دبایا اور پیچ پیچ کر فقیرا چاچا کو یقین دلایا کہ بالکل لکھا گیا ہے۔ پھر چاروں طرف دیکھ کر بولا "لے بولو اب کون کون جاوے گا گھر درخواست لے کے۔ میں جاؤں گا ہی اور . . . . "

"اور ہم سب" سب نے ایک ساتھ کہا۔

شبراتی لالٹین رکھتے ہوئے بولا "اور لالہ جی بھی کہیں کہتے کہ چلیو تو مجھے اور شیودھر کو بھی لے لیجیو اور . . . . . . " اتنے میں دروازہ آہستہ سے کھلا اور اللہ دیا داخل ہوا اور دروازہ بند کرتے ہوئے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جوشاہ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

"جاویں گی" جوشاہ نے دھیمے سے پوچھا۔

"ہاں"

"تو پھر کب معلوم ہو جاوے گا"

"یا آج رات کو یا کل تڑکے"

"پرسوں تو عشرہ ہے" دو تین کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ مگر جوشاہ کو سر جھکائے خاموش دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ جوشاہ نے پھر سر اٹھایا اور اللہ دیئے سے مخاطب ہوا۔

"جنٹ صاحب آ گئے یا ابھی سواری ہی میں ہی ہیں"

"آ گئے ۔۔۔ تھوڑی دیر ہوئی"

"تو یہ درخواست ابھی جاوے" جوشاہ نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔ سب نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلادیا۔

"کیا درخواست لکھ گئی" اللہ دیئے نے پوچھا۔

"ہاں" جوشاہ نے کہا "تے اب تو کچھ کھا پی لے۔ شرفو اللہ دیئے کا حصہ لا . . . . . " پھر اس نے اپنے باہر نکلتے ہوئے ساتھیوں کو ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ لالٹین طاق میں سے اٹھائی اور کونے میں رکھی، دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری "معجزہ پروردگار کا ــــ

نویں کی صبح کوئی چار بجے ہوں گے۔ نانی مجلس سے لوٹ کر چولھا سلگائے پانی رکھ رہی تھیں کہ دروازے پر آہستہ سے دستک

شاہ پارہ

فنکاران پیکنگ پیپلز آرٹ تھیٹر

میاں بیوی

وقت :- موسم سرما کی ابتدا ۱۹۵۲ء کسی اتوار کی صبح

مقام :- چانگ، پیکنگ کے ایک مل مزدور کا گھر۔

کردار :- (۱) چانگ - مزدور عمر ۲۹ سال

(۲) بیوی :- چانگ کی بیوی عمر تقریباً ۲۶ سال

(۳) سن :- مل کی پیداواری کمیٹی کا ممبر عمر لگ بھگ ۲۵ سال

(۴) آرچن :- سن کی بہن، عمر لگ بھگ ۱۸ سال

منظر :- (ایک دو منزلہ مکان کے شمالی ونگ کا اندرونی حصہ جو ایک چوکور آنگن کے ارد گرد بنا ہوا ہے اور پیکنگ کے مکانوں کی خصوصیت لیے ہوئے ہے۔ اسٹیج کی پچھلی دیوار میں بائیں طرف ایک دروازہ ہے جو آنگن میں کھلتا ہے۔ پچھلی دیوار پر کاغذ کی بنی ہوئی ایک لمبی کھڑکی ہے جو ایک لکڑی کی فریم پر چسپاں کر دی گئی ہے اور جو دیوار کے عین مرکز میں ہے۔ کھڑکی کے نیچے پچھلی دیوار کے سہارے لکڑی کا ایک لمبا پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر چادر بچھی ہوئی ہے۔ داہنی جانب دیوار پر کچھ کنبہ والوں کی تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں اور چانگ کے اپنے کوٹ کو وقت سے پیشتر پورا کرنے پر ملا ہوا ایک جھنڈا لگا ہوا ہے۔ پلنگ کے نیچے داہنی طرف دیوار کے سہارے ایک بکس، سلائی دانی اور کچھ کپڑے سلتے رکھے ہیں۔ اسٹیج پر اور پیچھے داہنی دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا نعمت خانہ برتنوں کے لئے رکھا ہے۔ اس پر تیل، شراب وغیرہ کی بوتلیں اور کھانے پکانے کے دوسرے برتن رکھے ہیں۔ اس سے بھی آگے اسٹیج پر داہنی طرف نعمت خانہ سے آگے مٹی کی ایک بڑی سی ناند رکھی ہوئی ہے۔ دیوار پر چاپ سٹک کے لئے ایک ٹوکری رکھی ہے ناند کے علاوہ اسٹیج کی داہنی جانب پیچھے ایک دروازہ ہے جو باورچی خانہ میں کھلتا ہے۔ بائیں دیوار کے پاس ایک چھوٹی سی میز اور کرسیاں رکھی ہیں میز پر ریڈیو، گھڑی، تھرمس، بوتل اور کتابیں رکھی ہیں۔ اسٹیج کی پچھلی طرف اور مرکز میں ایک چوکور میز ہے جس کے آس پاس ایک کرسی اور دو اسٹول رکھے ہیں۔

جب پردہ اٹھتا ہے، چانگ میز پر اکیلا بیٹھا ہوا کسی تقریر کا خاکہ تیار کرنے میں مشغول دکھائی دیتا ہے۔ بچہ پلنگ پر گہری نیند سو رہا ہے۔ باہر گلی میں سے سی سیم کیک اور کرولز رو غیرہ اور ایک تیل بیچنے والے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جو ایک لکڑی کے گھنٹے پر لاٹھی سے چوٹ کرکے اپنی آمد کا اعلان کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اور بھی ایسے ہی پھیری والوں کی آوازیں آتی ہیں۔)

چانگ :- (مطمئن ہوتے ہوئے آپ سے) اس سے تو ملک کے دس کھرب یوان بچ جائیں گے۔

(چانگ لکھنا جاری رکھتا ہے۔ اس کی بیوی باورچی خانہ کے دروازہ سے داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک طشتری ہے جس پر گوشت کے بھنے ہوئے ڈمپلنگز رکھے ہوئے ہیں)

بیوی :- یہ لو رات یہ بچ گئے تھے میں نے انہیں تمہارے لئے گرم کر دیا ہے۔ آؤ کھا لو تھوڑے۔

چانگ :- (لکھنے میں منہمک۔ انجانے میں) اچھا۔

بیوی :- (چانگ کے لئے ایک پیالہ چائے تیار کرتی ہے اور اس کے سامنے میز پر رکھ دیتی ہے) کیا لکھ رہے ہو تم؟

چانگ :- (بے توجہی سے) خاکہ۔

بیوی :- (نہیں سمجھ پاتی) خاکہ؟

چانگ :- وہ جو میں نے نیا طریقہ کھوجا ہے نا۔ اس پر میں ایک رپورٹ پیش کرنے والا ہوں۔

(چانگ لکھنا جاری رکھتا ہے)

بیوی :- چلو اٹھو پہلے کھا لو۔ کھانا کھانے کے بعد نہیں لکھ سکتے ہو کیا؟

ما چینی کا کھانا

چانگ:- رکھ دو ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر میں کھاؤں گا۔

(بیوی اس کے کام میں حائل نہیں ہونا چاہتی۔ وہ پلنگ کے کونے تک جاتی ہے اور بچے کے ساتھ کو ناپتے ہوئے کپڑے اٹھا لیتی ہے۔ انہیں تسلے میں رکھ کر پچھلے دروازے سے صحن میں چلی جاتی ہے۔

آرچیڈ:- (باہر سے) ہا ہا کتنی اچھی گھروالی ہے! صبح ہی صبح کتنے جلدی کپڑے دھونے لگی!

بیوی:- (باہر سے) رات ہی تو آنا تھا، پھر انھوں نے سوچا رہی تھی وقت ملے تو دھو ڈالوں۔ آرچیڈ ذرا اسے چھوڑ وا دے تو۔ ادھر کو پکڑ لے۔ ہاں

آرچیڈ:- اچھا لاؤ۔

بیوی:- کہاں جا رہی ہو تم؟

آرچیڈ:- عورتوں کی گھریلو کام کی انجمن میں۔

بیوی:- کام تو کیا کیا وہاں سے؟ میرے لئے بھی لیتی آنا۔

آرچیڈ:- ارے ہاں آج تو اتوار ہے۔ تم تو چانگ بھائی کے پاس رہو گی نا؟

بیوی:- چپ، بدتمیز!

آرچیڈ:- (ہنستے ہوئے) لاؤ تمہیں ایک بالٹی ہی لادوں

بیوی:- نہیں لے آؤں گی میں خود۔

چانگ:- (چانگ لکھے جاتا ہے بچہ رونے لگتا ہے) بیو للل بیو لاں (کوئی جواب نہیں چانگ بچے کو اٹھا لیتا ہے۔ گنگناتا ہے) آہ بیو بچہ اٹھ بیٹھا۔ مت رو بیٹے نہ نہ روتے نہیں ماما تجھے پیٹے لگی آ ہا ہا چانگ میز پر بیٹھ جاتا ہے اور بچہ اس کی گود میں ہے۔ لکھنا چاہتا ہے پر بچہ گڑبڑ کر دیتا ہے۔

چانگ:- بیو لاں بیو لاں۔

بیوی:- (باہر سے) آ — ئی — ابھی — آئی

(بیوی داخل ہوتی ہے)

چانگ:- کہاں چلی گئی تھیں؟ تم سے ذرا سا بچہ بھی نہیں سنبھالا جاتا (بیوی بچے کو اٹھا لیتی ہے اور پچکارتی ہے۔ سبزی بیچنے والے کی آواز باہر کو سنائی پڑتی ہے)

بیوی:- ذرا باہر سے کچھ ترکاری تو خرید لو۔

چانگ:- دیکھتی نہیں ہو میں کام کر رہا ہوں۔

بیوی:- میں بھی تو بیکار نہیں بیٹھی۔

چانگ:- اب تو وہ رو بھی نہیں رہا۔ انہیں چھوڑ دو اسے پلنگ پر ٹھیک ہو جائے گا۔

بیوی:- (بچہ کو رکھتی ہے اور ٹوکری اٹھاتی ہے) اب ذرا دھیان رکھنا اس کا۔

بیوی چلی جاتی ہے کچھ دیر بعد سن داخل ہوتا ہے)

سن:- کہو بھائی کیا حال ہیں؟ تیار ہو میٹنگ کے لئے؟

چانگ:- ہلو سن ہاں۔ ہاں قریب قریب پوری کر لی ہے دیکھو ذرا یہ ساری تقریر لکھ لی ہے جب وہاں بولنے کھڑا ہوں گا تو کوئی بھی بات نہیں بھول سکتا۔ اور جب میں انہیں نئے ڈیزائن بتلا کر سمجھاؤں گا تو ان کی سمجھ میں اچھی طرح آ جائیگا۔

سن:- ٹھیک ہے آج کی میٹنگ بڑی اہم ہے۔ اگر تمہارا یہ طریقہ سب جگہ لاگو ہو گیا تو ہماری پیداوار پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا اور ہاں یہ کہنا کسی سے نہ بھولنا کہ تم نے یہ گتھیاں کیسے سلجھائیں۔

چانگ:- کیا وہ بھی لکھ لوں۔

سن:- ہاں ہاں بالکل کیا یاد نہیں ہے؟ تمہیں جب تم نے اسے شروع کیا تھا تو ایسے لوگ بھی تھے جو کہتے تھے ہماری مشینیں بہت پرانی ہیں وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہیں اور اب کام نہیں دیں گی لیکن تم نے اس کو غلط ثابت کر دکھایا تمہیں سات بار تجربے کئے اور آخر میں اس کو حاصل کیا اگر لوگ اسے سمجھ پائیں تو دیکھنا کس گرم جوشی سے وہ ان نئے طریقوں کو اپناتے ہیں۔

چانگ:- سبھی مزدور پیداوار کے لئے نئے نئے راستے نکالنا چاہتے ہیں۔

سن:- ہاں۔ ہاں ٹھیک ہی کہتے ہو۔

چانگ:- آج میٹنگ میں کون کون آ رہا ہے؟

سن:- فیکٹری کے ڈائریکٹر فیکٹری کی کمیونسٹ پارٹی کی شاخ کے جنرل سکریٹری ہماری ٹریڈ یونین کے اندر فیکٹری کے یوتھ لیگ کی شاخ کے جنرل سکریٹری غرض یہ کہ بہت سے لوگ آئیں گے۔

چانگ:- اوہو (استغفار مذاق سے) میں نے کبھی سٹیج پر کھڑے ہو کر تقریر نہیں کی۔ تم بھی پیداواری کمیٹی کے ممبر ہو اگر میں کہیں اٹک جاؤں تو تمہیں میری مدد کرنی پڑے گی۔

سن:- ایسا تو ہوگا ہی نہیں۔

چانگ:- آؤ بیٹھو لو سگرٹ پیو (سن میز پار کر کے دوسری طرف جاتا ہے اور (ڈمپلنگز) دیکھتا ہے۔

سن:- ہائے کل نوڈلز تھے اور آج گوشت (ڈمپلنگز) ہیں! ہا

چانگ:- بیٹھ جاؤ سن چکھو دو چار۔

سن:- (ایک کھاتے ہوئے) ہاں یہ تو بڑے مزے دار ہیں۔ واقعی بڑے خوش قسمت ہو بھائی تمہارا بہت ہی تو خیال رکھتی ہیں تمہیں دفتر کی کام نہیں

کرناٹین:- صبح صبح تمہیں ڈسپلنگز سے ناشتہ کرانی ہیں تم واقعی بڑے مزے میں ہو۔

چانگ:- اس میں کونسی خاص بات ہے جو دوسروں کی بیویاں کرتی ہیں وہی وہ بھی کرتی ہے۔

سن:- نہیں ایسا نہیں کہنا چاہئے میری بہن اس کی دن رات تعریف کرتی رہتی ہو اگر تمہاری بیوی گھر کا اتنا خیال نہ رکھتی تو تم اپنا سارا دماغ کام پر کیسے لگاتے۔

چانگ:- تم بھی کمال کرتے ہو اگر وہ ایسی نہ ہوتی تو میں تو کوئی کام بھی ہنیں کر پاتا تمہاری بہن آرچیڈ تو اس کی حمایت کرتی رہتی ہے وہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

سن:- تم نے پھر وہی شروع کر دیا۔ دیر ہو رہی ہے میں جاتا ہوں اور انتظام کرتا ہوں تم بھی ذرا جلدی آ جانا۔ ہم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شروع کر دیں گے اور پھر ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ہی ہمیں ختم بھی کر دینا ہے دس بجے چینی سودیٹ انجمن ہمارے لئے ایک فلم بھی دکھلانے والی ہے دیر نہ کرو۔

چانگ:- میں تو وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ بس اسے کھول لوں گا اور ختم کرتے ہی وہاں پہونچتا ہوں۔

سن:- تو پھر میں چلتا ہوں (بیوی ٹوکری لئے ہوئے جس میں گوشت اور ترکاریاں ہیں داخل ہوتی ہے اور پیچھے کے دروازے پر سن سے ملتی ہے)

بیوی:- کیوں سن ٹھہرو گے نہیں ذرا دیر؟

سن:- مجھے فیکٹری میں کام ہے (ٹوکری میں رکھی ہوئی چیزیں دیکھ کر) آج پھر گوشت آ گیا!

بیوی:- آج اتوار ہے نا؟ سوچا کچھ اچھی چیزیں بنا کر کھلاؤں انہیں (چانگ کی طرف اشارہ کرتی ہے) اچھا تو واپسی پر ہمارے ساتھ کھانا کھانا۔

سن:- بہت اچھا۔

(سن جاتا ہے)

بیوی:- (ٹوکری رکھ میز تک جاتی ہے) ذرا دیکھو تو! سارا پڈنگ ٹھنڈا ہو گیا کھاؤ گے بھی یا نہیں؟

(چانگ جواب نہیں دیتا)

بیوی:- پھر گرم کر دوں کیا اسے؟

چانگ:- مجھے ابھی نہیں چاہئے گرم کرو گرم اور کھا لینا تم خود ہی۔

بیوی:- میں تو پہلے ہی کھا چکی ہوں (وقفہ) ہم عورتیں آج ایک جلسہ کرنے والی ہیں جس میں صحت عامہ کے کام کے لئے ایک مثالی عورت چنی جائے گی۔

چانگ:- (قدرے پریشان) ہوں۔

بیوی:- ہمارے پاس امیدواروں کی فہرست بھی تیار ہے۔

چانگ:- تنگ نہ کرو مجھے۔ دیکھتی نہیں ہو میں کتنا مصروف ہوں۔

بیوی:- مصروف! مصروف! ناک میں دم ہے۔ مصروف تو تم ایسے ہو کہ میں سوال کروں تو ایک کا جواب بھی نہ دو۔

(میز سے طشتریاں اٹھا کر باورچی خانہ میں چلی جاتی ہے۔ چانگ لکھنا بند کرتا ہے جانے کو تیار ہے لیکن اسے اپنا نقشہ نہیں مل پاتا۔)

چانگ:- اف .... وہ نقشہ کہاں ہے؟

(چانگ نقشہ ڈھونڈھتا ہے۔ بیوی داخل ہوتی ہے)

بیوی:- کیا ڈھونڈ رہے ہو؟

(چانگ توجہ نہیں دیتا)

بیوی:- مجھے بتاؤ کیا ڈھونڈ رہے ہو؟

چانگ:- تم نہیں جانتیں۔ بتا دوں گا تو بھی نہیں سمجھ پاؤ گی تم۔

(ڈھونڈھنا جاری رکھتا ہے)

بیوی:- تم بھی عجیب آدمی ہو! آخر کیا تلاش کر رہے ہو؟

چانگ:- شاید فیکٹری میں بھول آیا ہوں گا۔ (جاکیٹ پہنتا ہے)

بیوی:- کہاں جا رہے ہو؟

چانگ:- فیکٹری میں۔

بیوی:- آج اتوار ہے۔ کیا کرو گے وہاں جا کر آج؟

چانگ:- مجھے کام ہے۔

(بیوی اسے روکنا چاہتی ہے لیکن وہ جا چکا ہے۔ چانگ نے جو کاغذ کے ٹکڑے میز پر چھوڑ دئے تھے بیوی انہیں جمع کرتی ہے اور انہیں اٹھا کر ڈیسک پر ریڈیو کے نیچے رکھ دیتی ہے)

آرچیڈ:- (اسٹیج کے باہر سے) دیدی، دیدی۔ (پچھلے دروازے سے داخل ہوتی ہے) دیدی! (بیوی اشارہ کرتی ہے "دھیرے! بچہ اٹھ بیٹھیگا") میں تمہارے لئے کام لائی ہوں۔ اور جو پہلے تم نے کڑھائی کی تھی اس کے پیسے بھی (بیوی کو نوٹ کا بنڈل دیتی ہے) دیدی اس بار تم ان کے اپنے لئے کچھ اچھے کپڑے ضرور بنانا۔ ہاں!

بیوی:- نہیں نہیں۔ ان کا تو پہلے سے ہی حساب لگا رکھی تھی۔ چانگ

کے لئے بیں ان کا ایک گلوبند خریدوں گی۔

آرچنا :- تم نے بھی حد کر دی ہے دیدی! جب دیکھو چانگ بھائی سوء جو تم ان روز کچھ سوتی کپڑا لائی تھیں اب کو جا کیٹ دی دیا ان کے لئے ہ تیا ہو تو مجھے دیدو میں سید دوں گی۔

بیوی :- نا - میں نے تو بہت دن ہوئے پورا بھی کر لیا۔

آرچنا :- ارے اتنے جلدی! تمہیں وقت کیسے مل گیا؟

بیوی :- آجکل چانگ فیکٹری میں بہت کام ہوتا ہے۔ گھر بھی دیر سے آتے ہیں میں ان کا رات کو دیر تک جب انتظار کرتی تھی تو اسی وقت تیار کیا۔ سردی بڑھ رہی ہے اور انہیں محنت بہت کرنا پڑتی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہیں سردی نہ لگ جائے۔

آرچنا :- دیکھو دیدی۔ میں نے تم سے پہلے کبھی نہیں بتایا پر اب بتاتی ہوں تم ہمیشہ انہیں کے بارے میں سوچتی رہتی ہو - (ریکایک یاد کرکے) اوہ!

(جیب میں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالتی ہے)

بیوی :- کیا ہے یہ؟

آرچنا :- عورتوں کے گھریلو کام کی انجمن کی صدر نے یہ تمہیں بھیجا ہے۔

بیوی :- کیا لکھا ہے انہوں نے؟

آرچنا :- اس میں لکھا تو ہوا ہے سب کچھ۔ دیکھو۔

بیوی :- سنا نا تو ذرا پڑھ کر۔

آرچنا :- یہ مجھے تو نہیں لکھا گیا ہے۔ میں کیوں پڑھوں اسے؟

بیوی :- ارے نالائق! کیا مجھ سے زبردستی پڑھوائے گی؟

آرچنا :- (کاغذ دیتے ہوئے) ہاں، یہی تو کر رہی ہوں میں! خود ہی پڑھو اسے

(بیوی غیر رضامندی سے کاغذ لیتی ہے، نظر ڈالتی ہے اور جیب میں رکھ لیتی ہے)

آرچنا :- (بیوی کا ہاتھ کھینچتے ہوئے) یہ کیا کر رہی ہو؟

بیوی :- بعد میں پڑھوں گی۔

آرچنا :- تو تمہاری پڑھائی لکھائی سیکھنے کا کیا فائدہ ہوا؟ میں تم سے ابھی پڑھوا کے چھوڑوں گی۔

بیوی :- (واقعی ابھی؟) میں نہیں پڑھ پاؤں گی۔

آرچنا :- تم سمجھتی ہو میں تمہارا مذاق اڑاؤں گی؟

بیوی :- اچھا لو میں کوشش کرتی ہوں۔ اور اگر میں نہ پڑھ پاتی تو تمہیں مدد کرنی پڑے گی۔

آرچنا :- ہاں ہاں ضرور مدد کروں گی۔

بیوی :- (پڑھتی ہے) کڑھے ہوئے دو جوڑے .... "جوڑے" یہ کونسا لفظ ہے؟

آرچنا :- "تکیوں کے"

بیوی :- تکیوں کے کڑھے ہوئے دو جوڑے۔ تکیوں کے ...... تکیوں کے ......" (کچھ قیاس لگاتی ہے پھر زور سے پڑھ کر ساتھ ہی آرچنا بھی اس کی مدد کرتی ہے) "غلاف ......"

آرچنا :- (خوش ہو کر) دیدی!

بیوی :- "قیمت - (دیکھا جاری رکھتے ہوئے) "آمدنی ... ۲۲ یوان" (وقفہ) "...... ٹھیک"

آرچنا :- واہ - مار دیا دیدی! پڑھ ڈالی نہ ساری چھٹی؟ یہ تو بالکل برا نہیں ہے۔ اسکول کے دن سے جا رہی ہو؟

بیوی :- برا نہیں ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟ اتنے مہینوں تک اسکول جانے کے بعد سیکھا ہی کیا ہے میں نے؟ یہی نہ کہ چار پانچ حرف جان گئی۔ دوسرے مجھ سے کہیں اچھے ہیں۔ مجھے تو اسکول میں بچے کو بھی ساتھ لیجانا پڑتا ہے — پہلے تو وہ رونے لگتا ہے اور پھر غل مچاتا ہے۔ مجھے تو ہمیشہ یہی ڈر رہتا ہے کہ وہ دوسروں کی پڑھائی میں خلل ڈال رہا ہے۔ بڑی مصیبت ہے۔ اور پھر میں بدھو بھی تو ہوں۔ مجھے یاد ہی نہیں ہوتا۔ ذرا دیر کتاب ہاتھ سے الگ کی اور کسی دوسرے کام میں لگی کہ سب پڑھا پڑھایا بھول گئی۔ آرچنا! وہ چاہتی ہیں کہ ہم اپنی رفتار تیز کر لیں اور ایک سال میں سو حرف سیکھ لیں۔ میں تو ڈرتی ہوں بابا مجھ سے تو ہوگا نہیں۔

آرچنا :- ہوگا کیوں نہیں؟ تم میں تو ایک ہی عیب ہے۔ ہمیشہ یہی سوچتی ہو کہ تمہیں کوئی کام ہی نہیں آتا۔ سچ پوچھو تو تم بدھو نہیں ہو اور تم محنت بھی بہت کرتی ہو جب تک تم اسے نہ چھوڑو گی تب تک اچھی رہو گی۔ آخر تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟ مانا کہ بچہ کچھ تکلیف دیتا ہے تو اس کا بھی انتظام ہو جائیگا۔ میں نے سنا ہے کہ عورتیں ایک امداد باہمی کی دن کی پرورش گاہ جلد ہی قائم کرنے والی ہیں تب تمہارے بچے کا مسئلہ بھی حل ہو جائیگا۔

بیوی :- مگر اسے تو ابھی بہت وقت لگیگا۔ ابھی کیا کروں میں؟

آرچنا :- ابھی یہاں چانگ بھائی جو ہیں۔ ہر وقت تو انہیں اتنا کام ہوتا نہیں ہے جب کبھی انہیں کام نہ ہو وہ بھی سنبھالیں بچے کو۔ اور اگر واقعی وہ بہت زیادہ مصروف ہیں تو ہماری اماں سنبھال لینگی اسے۔

(بیوی سانس لیتی ہے)

آرچنڈ:- کیا بات ہوئی دیدی؟

بیوی:- کچھ نہیں۔

آرچنڈ:- ہیں۔ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

بیوی:- ارے تم نہیں جانتیں۔ جب انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تب بھی وہ بچہ کو نہیں سنبھالتے۔ بچہ کو کھلانے کی تو بات چھوڑو۔ میں نے ابھی کچھ دن پہلے ان سے کہا کہ مجھے ایک نوٹ بک لا دینا۔ انہوں نے وہ بھی لا کر نہ دی۔ آخر کار مجھے خود ہی لانی پڑی۔ ہمیشہ وہ یہی کہتے ہیں کہ میں پڑھتی نہیں ہوں۔ اور جب میں اصل میں پڑھتی ہوں تو وہ مجھے رتی بھر بھی مدد نہیں دیتے۔ اگر تم اور اراس میری ہمیشہ مدد نہ کرتیں تو یہ جو دو چار حرف میں نے سیکھے ہیں وہ بھی نہ سیکھ پاتی۔ ان کو تو میری تکلیفوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں اور نہ ہی گھر کے کاموں سے انہیں کوئی سروکار ہے۔ اور جب میں ان سے فیکٹری کے بارے میں پوچھتی ہوں تو بس بڑبڑانے لگتے ہیں۔ تم کچھ نہیں جانتیں۔ مجھے ان جھگڑوں سے تنگ نہ کیا کرو۔ وہ سمجھتے ہیں میں ابھی بھی پچھڑی ہوئی ہوں۔ آرچنڈ سچ بتانا کیا میں واقعی پچھڑی ہوئی ہوں؟

آرچنڈ:- کیا حق ہے انہیں تمہیں پچھڑی کہنے کا؟ کیوں صحت عامہ کی خدمت کی ٹیم میں ہماری ٹیم بہترین تھی نا؟ ہماری ٹیم میں ہر ایک کوئی کہتا ہے کہ تم بہت بڑھیا لیڈر ہو۔ دوسری ٹیموں والے بھی تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ آج جب ہم ماڈل چنے گئے تو مجھے تو محسوس ہو رہا ہے کہ تم ہی چنی جاؤ گی۔ دیدی تم ان کی باتوں کا خیال نہ کیا کرو۔ اپنا کام اچھی طرح کئے جاؤ اور انہیں خود دیکھنے دو کیا ہوتا ہے۔

بیوی:- ہاں پہلے تو میں سارا دن گھر پر ہی رہتی تھی۔ پڑھتی بھی نہیں تھی۔ اس وقت تو دراصل مجھے آتا بھی کچھ نہیں تھا۔ اور اب تو میں ویسی جاہل نہیں ہوں۔ صحت عامہ کے کام کے بارے میں بھی مجھے علم ہے۔ پہلے تو کسی بھی جلسہ میں میں منہ کھولنے میں بھی گھبراتی تھی پر اب تو میں بحث بھی کر سکتی ہوں۔ جب کوئی رپورٹ سنتی ہوں تو وہ بھی میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ میں نے اب کافی سیکھ لیا ہے۔ گھر لوٹتے وقت میں ہمیشہ یہ سوچتی رہتی ہوں کہ ان سے یہ سب باتیں کروں گی۔ اور جب میں گھر پہنچتی ہوں تو ان سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتی۔ انہیں مجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔

آرچنڈ:- یہ چانگ بھائی کی زیادتی ہے۔ وہ اب بھی تمہارے ساتھ وہی پرانے ڈھنگ کا سلوک کرتے ہیں۔ لیکن آج عورتیں ایسی نہیں ہیں جیسی پہلے تھیں۔ وہ ٹرامیں چلاتی ہیں، ریلوے انجن چلاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کو بھی ڈرائیو عورتیں ہی کرتی ہیں۔ اب تو ہر طرح سے ہم عورتیں مردوں کے برابر ہیں۔ میرے خیال سے تو چانگ بھائی کو اپنے پرانے خیال کچھ بدلنا پڑیں گے۔ دیدی! تم آج ان سے ڈٹ کر باتیں کرو۔

بیوی:- ٹھیک ہے۔ اب اس طرح کام چلے گا بھی نہیں۔ مجھے ان سے باتیں کرنا ہی پڑیں گی۔ (گھڑی نو بجاتی ہے) اوہ وقت ہو گیا۔ مجھے تو صحت عامہ کا کام بھی جانچنا ہے میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آج تو صبح سے ہی میرا دماغ کچھ کام نہیں کر رہا ہے۔ (پلنگ کی طرف جا کر سوئے ہوئے بچہ کو دیکھتی ہے) دیکھو نا؟ آج اتوار ہے اور ان کا ابھی تک پتہ نہیں۔ ذرا اسے دیکھتی رہو گی؟

آرچنڈ:- ہاں ہاں کیوں نہیں! میں اسے گھر لیجاؤں گی۔ جاؤ جلدی کرو کہیں تمہیں میٹنگ میں دیر نہ ہو جائے۔

بیوی:- نہیں نہیں دیر نہیں ہو گی۔ تم ذرا بچہ کے لئے کچھ پلو لے لو۔ باورچی خانہ میں پڑے سوکھ رہے ہیں۔ (بیوی جاتی ہے۔ آرچنڈ پلو لانے کے لئے باورچی خانہ میں جاتی ہے۔ چانگ گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ ڈیسک کے دراز کھولتا ہے اور چیزوں کو ادھر ادھر بکھیر دیتا ہے۔)

آرچنڈ:- (باورچی خانہ سے واپس آتے ہوئے) او ہو تو آپ آ گئے۔ چانگ بھائی۔

چانگ:- مجھے ایک چیز تلاش کرنی ہے۔

آرچنڈ:- (مذاق) کیا دیدی؟

چانگ:- بکواس نہ کر۔ مجھے کام ہے۔

آرچنڈ:- (بچہ کو اٹھا کر) چانگ بھائی یہ بچہ لے جاؤں اپنے گھر؟

چانگ:- مجھے تنگ نہ کر۔ (کمرے میں ادھر ادھر تلاش کرتا ہے) چیزیں الٹتا ہے اور باورچی خانہ کی طرف جا کر چیختا ہے) سیولاں! سیولاں! اب یہ گئی کہاں ہے؟ (آرچنڈ باہر آنگن کی طرف چلی جاتی ہے) یہ عورت کبھی نہیں سدھرے گی۔ (صحن کے دروازے پر جا کر پکارتا ہے) سیولاں! سیولاں!

آرچنڈ:- (باہر صحن میں سے) دیدی اپنے صحت عامہ کے کام کے لئے گئی ہیں۔ کیا کام ہے آپ کو ان سے؟

چانگ:۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔

آرچیٹ:۔ (باہر سے) کاہے کے لئے؟

چانگ:۔ کچھ ضروری کام ہے۔ بلا دو نا اسے۔

آرچیٹ:۔ (باہر سے) اچھا۔ بلا کر آتی ہوں۔

چانگ:۔ (اپنے آپ سے) صحت عامہ کا کام! سارے گھر کا وہ حال کر رکھا ہے کہ کبھی کوئی چیز وقت پر نہیں ملتی۔ وہ کام کیا کیا سکتی ہے؟ ابھی تک نہیں لوٹی! (ادھر ادھر ٹہلتا ہے اور گھڑی کی طرف دیکھتا ہے) مجھے ویسے ہی دیر ہو رہی ہے۔

(بیوی داخل ہوتی ہے)

بیوی:۔ کونسی چیز ہے جسے تلاش کرنے کے لئے تم نے مجھے بلایا ہے؟ میں ابھی کام بیچ سے اٹھ کر آ رہی ہوں۔

چانگ:۔ میرا وہ نقشہ کہاں ہے؟

بیوی:۔ نقشہ؟

چانگ:۔ ہاں۔ کہاں رکھ دیا ہے وہ تم نے؟

بیوی:۔ کیا؟

چانگ:۔ نقشہ۔ نقشہ۔ نقشہ۔ اور کیا؟

بیوی:۔ کہاں رکھا تھا تم نے؟

چانگ:۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔

بیوی:۔ تو صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟

چانگ:۔ وہ سفید کاغذ کی شیٹ ہے۔ جی۔ میں بڑبڑاتا جاؤں گا اور تمہارے پلے خاک نہیں پڑے گا۔ ڈیزائن کا نقشہ جو ایک کاغذ پر بنا ہوا ہے۔ رپورٹ کے لئے مجھے اس کی ضرورت ہے۔

بیوی:۔ اچھا وہ! وہ تو میں نے یہاں رکھ دیا تھا۔

چانگ:۔ اچھا تو ذرا پھرتی کرو، مجھے ویسے ہی دیر ہو رہی ہے۔

(بیوی ریڈیو کے نیچے سے ایک کاغذ نکالتی ہے اور چانگ کو دیتی ہے)

چانگ:۔ وہ دیکھ لیا میں نے۔ وہ نہیں ہے۔

بیوی:۔ تو پھر کونسا ہے وہ؟ ذرا اطمینان سے سوچو تم نے کہاں رکھ دیا تھا۔

چانگ:۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں سے تو پوچھتا؟

بیوی:۔ (مایوس ہو کر) تو ڈھونڈ لو پھر تم خود! (دونوں سارے کمرے میں تلاش کرتے ہیں) کونسا ہے وہ نقشہ؟

آرچیٹ:۔ (باہر سے) ڈیڈی! ہم میٹنگ شروع کر رہے ہیں، لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔

بیوی:۔ ابھی آئی ایک منٹ میں۔

چانگ:۔ اس طرح یہ سب چھوڑ کر میٹنگ میں کیسے چلی جاؤ گی تم؟ میرا نقشہ تو ملا ہی نہیں ابھی؟

بیوی:۔ تو تم مجھے ٹھیک سے بتاؤ وہ ہے کیا۔ ورنہ میں ڈھونڈوں گی کیسے؟

چانگ:۔ ہائے ہائے۔ کیسی بدھو سے پالا پڑا ہے (چڑا چڑا سا محسوس کرتا ہے) وہ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے جس پر ایک فریم کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ دونوں طرف پٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ (ہاتھ سے اشارہ کر کے بتاتا ہے)

بیوی:۔ اوہو! وہ ہے نقشہ! (اپنی نوٹ بک میں سے ایک کاغذ نکال کر دیتی ہے) یہی ہے نا؟

چانگ:۔ یہ تم میرے کاغذوں کے ساتھ کیا مذاق کیا کرتی ہو؟

بیوی:۔ کون کر رہا ہے مذاق؟ یہ تو میں نے تمہارے میلے کپڑوں میں سے نکال کر رکھ لیا تھا جب انہیں دھونے جا رہی تھی۔

چانگ:۔ تو پھر اسے تم نے اس سٹریل جگہ پر کیوں رکھ دیا؟

بیوی:۔ سٹریل جگہ ہے یہ؟ یہ میری پڑھائی کی نوٹ بک ہے۔ اس لئے اس میں رکھ دیا تھا کہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ اور جب تم صاف صاف نہیں بتاؤ گے تو میں کیسے سمجھوں گی کہ تم کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ دیکھو کیا جھمیلا بنا رکھا ہے سارے گھر کا۔

سن:۔ (باہر سے) چانگ! چانگ! (صحن کے دروازے سے داخل ہوتا ہے) چانگ!

چانگ:۔ سن۔ مل گیا مجھے وہ۔ بہت دیر تو نہیں ہوئی مجھے! آؤ چلیں۔

سن:۔ میٹنگ ختم ہو گئی۔

چانگ:۔ ختم ہو گئی؟

سن:۔ جب تم اپنا وہ نقشہ لینے کے لئے آئے تو صنعتی وزارت نے فیکٹری کے ڈائریکٹر کو فون کیا اور انہیں کسی کانفرنس میں بلا لیا۔ ڈائریکٹر نے جانے سے پہلے کہا کہ ہماری میٹنگ بھی بہت اہم ہے اور اس میں بھی وہ خود شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ خیر وقت بہت کم تھا اس لئے ہم نے میٹنگ ملتوی کر دی۔ جب اگلی میٹنگ کی تاریخ طے کریں گے تو میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔

چانگ:۔ یہ سب اس گڑبڑ کی وجہ سے ہوا۔

سن:۔ تم پریشان کیوں ہو؟ زیادہ وقت ملا ہے تو تم اور اچھی تیاری کر لو۔

(چانگ جواب نہیں دیتا۔ پریشان معلوم ہوتا ہے)

سن:۔ کوئی بات نہیں چانگ بابا۔ وہ تو ایک ہی بات ہے۔ ہم آج مٹینگ کریں یا کسی اور دن۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور سچ پوچھو تو ہم نے اس میٹنگ کے لئے کافی وقت بھی نہیں لیا تھا۔ مجھے یونین کے دفتر میں جانا ہے وہاں ہم ایک فلم دکھلانے جا رہے ہیں۔ تم بھی آؤ ضرور دیکھو اس کو۔

چانگ:۔ نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔

سن:۔ اچھا تو پھر اس بات سے اتنا پریشان نہ ہو۔ پھر ملیں گے۔

(سن جاتا ہے)

چانگ:۔ (لفافہ کو پلنگ پر پھینک دیتا ہے اور بیوی کی طرف گھور کر) یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔

بیوی:۔ میری وجہ سے؟ اس میں میرا کیا قصور؟

چانگ:۔ تمہیں سوا ادھر کی چیزیں ادھر کرنے کے آتا ہی کیا ہے؟ آتی ضروری چیز اٹھا کر اس بکواس جگہ پر رکھ دی۔ اور پھر میں ڈھونڈھ لوں گا۔ یہ اندازہ تمہیں کیسے ہو گیا۔

بیوی:۔ میں تو تم سے پوچھے جا رہی تھی کہ تم کیا تلاش کر رہے ہو تم نے بتایا ہی نہیں! میں کیا کروں۔

چانگ:۔ اچھا تو دنیا بھر کی چیزیں تمہیں بتلاتا پھروں۔ ہیں۔ کیوں؟

بیوی:۔ ایک تو تم نے مجھے بتایا نہیں اور اوپر سے مجھے ہی قصور وار ٹھیرا رہے ہو۔ کیونکہ تمہیں وہ ملا نہیں۔ آخر تم چاہتے کیا ہو مجھ سے؟

چانگ:۔ عورتیں، ہنہ کیا کہیں ان کو۔ جن چیزوں کو تم لوگ جانتی نہیں ہو اس میں دخل کیوں دیتی ہو؟

بیوی:۔ پھر تم نے کہا جانتی نہیں ہوں۔ پھر مجھے ہی قصور وار ٹھیرا رہے ہو؟ میں کہتی ہوں تم نے بتایا ہی کب ہے کچھ؟ گھر آتے ہو تو کھلتے نہیں ہو تو کسی کام میں لگ جاتے ہو اور منھ بالکل بند کر لیتے ہو۔ کارخانہ میں کیا ہو رہا ہے۔ باہر دنیا کے کیا حال ہیں۔ تم مجھے کبھی کچھ بتاتے ہی نہیں۔ ہمیشہ اپنے کام سے تم مجھے بالکل الگ رکھتے ہو۔ کھانے پکانے، بچہ سنبھالنے اور پڑھنے کے بعد مجھے صحت عامہ کا بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی تو سارا دن کسی نہ کسی کام میں لگی ہی رہتی ہوں۔ اور جب تم منھ کھولتے ہو تو مجھے تمہارا غصہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

چانگ:۔ آخر تم عام عورتوں کے کام کے علاوہ اور کرتی ہی کیا ہو؟ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ پچ کیا ہے یا لوہے کاٹنے کی مشین کیسی ہوتی ہے تو تم کیا خاک سمجھو گی اسے؟ اپنے کام کے بارے میں تمہیں بتانا بیکار ہے اور رہا تمہارا وہ صحت عامہ کا کام۔ تو وہ تمہارے بغیر بھی چل سکتا ہے۔

بیوی:۔ میں تمہارے کسی کام کی نہیں ہوں یہی نا؟ تمہارا خیال ہے میں کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ نہ کچھ کر ہی سکتی ہوں۔ تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں بالکل ناکارہ ہوں۔ ہیں اب گھر کے باہر جا کر بھی کام کر سکتی ہوں۔ نئے خیالات اور نئی باتیں بھی میری سمجھ میں آتی ہیں۔ تو پھر جب کبھی میں گھر پر آتی ہوں یہ میرا خون خشک کیوں ہوتا ہے؟ یہاں آتے ہی میں کیسے بالکل ناکارہ بن جاتی ہوں؟

چانگ:۔ آخر تم ٹھیک سے کر ہی کیا سکتی ہو؟ کیا آٹا خریدنے جاتی ہو؟ کیا تمہیں مزدوری کرنا پڑتی ہے؟ تم کرتی کیا ہو؟

بیوی:۔ ٹھیک کہتے ہو۔ میں کسی کام کی بھی نہیں ہوں۔ بس تمہیں ہی سب کچھ آتا ہے! شاید تم ہی گھر سنبھالے ہوئے ہو۔ تم ہی تو بچے کی دیکھ بھال کرتے ہو؟ تم ہی کھانا پکاتے ہو اور تم ہی تو کپڑے دھوتے ہو؟

چانگ:۔ اسے کام کہا جاتا ہے؟ کوئی بھی کر سکتا ہے وہ!

بیوی:۔ بہت اچھے! تم سب کچھ کر سکتے ہو! لو تو میں سارا گھر تم ہی پر چھوڑ دیتی ہوں اور کہیں نوکری تلاش کرتی ہوں۔ دیکھنا میں کچھ کر پاتی ہوں یا نہیں۔ چیئرمین ماؤ نے تمہیں نجات دلائی تو مجھے بھی انہوں نے نجات دلائی ہے۔ اگر تم عوام کی خدمت کرتے ہو تو میں بھی کرتی ہوں۔ پھر تمہیں کیا حق ہے کہ تم اس طرح مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھو؟

چانگ:۔ تو تمہیں حق بجانب ہو ایں! مجھے تمہارے اس سیاسی سبق کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں؟

بیوی:۔ میں تو تمہیں کوئی سیاسی سبق نہیں دے رہی۔ تم ذرا اس پر غور کرو کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں یا غلط۔

چانگ:۔ کہہ چکیں؟

بیوی:۔ نہیں ابھی نہیں۔ کیا تم مجھے نہیں بولنے دوگے؟ آج تک کبھی مجھے گھر میں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ عوامی حکومت کی طرف سے ہم سب کو بولنے کا حق حاصل ہے۔ آج میں اپنی بات کہکر رہوں گی۔ دیکھوں کیسے روکتے ہو تم مجھے ....

(آرچڈ داخل ہوتی ہے)

آرچڈ:۔ دیدی۔ بچہ سو گیا۔ (بیوی بچہ کو لیکر پلنگ پر سلا دیتی ہے) چلو وقت ہو گیا۔

چانگ:۔ کہاں جا رہی ہو تم؟

آرچنڈ:۔ ہم ایک میٹنگ کر رہے ہیں۔ جہاں صحت عامہ کے لئے مثالی کارکنوں کو انتخاب کرنا ہے۔

چانگ:۔ (نفرت آمیز لہجہ میں) تم ایسے ہی جا رہی ہو! بچہ کو کون سنبھالے گا؟

بیوی:۔ تمہیں اب کیا کام ہے، انہیں سنبھالنا ہے۔

چانگ:۔ اچھا تو مجھ پر پھینکے جا رہی ہو۔ اور شاید کل کہنا کہ کھانا پکانا اور کپڑے دھونا بھی میں ہی کروں۔ میرے خیال سے عورتوں کی آزادی کا معاملہ بہت بڑھ گیا ہے۔ لیجاؤ بچہ کو اپنے ساتھ میٹنگ میں۔

بیوی:۔ وہ سو رہا ہے۔ باہر کیسے لیجاؤں گی اسے؟

چانگ:۔ اگر تم سے وہ نہیں سنبھلتا ہے تو اسے کسی اور کو کیوں نہیں دے دیتیں؟

بیوی:۔ ایسی بھی کیا نامعقولیت کی باتیں کر رہے ہو تم؟ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے میں نے ہر کام کیا ہے۔ جو کچھ بھی کیا سب تمہارے لئے۔ بھلا بتاؤ کبھی بھی میں نے تمہارے کسی کام کے لئے "نا" کہا ہے۔ اور تم؟ کبھی سوچا ہے تم نے میرے بارے میں؟ کبھی کیا ہے کچھ میرے لئے؟ میں کوئی کھیلنے کودنے تو نہیں جا رہی ہوں باہر۔ اور تمہیں اس وقت کوئی کام بھی نہیں ہے کیا ذرا دیر بچہ پر تم نظر بھی نہیں رکھ سکتے؟

(چانگ توجہ نہیں دیتا)

بیوی:۔ کچھ بھی ہو میں اسے میٹنگ میں نہیں لے جا رہی۔ چاہے اسے دیکھو یا نہ دیکھو۔ یہ تمہارا کام ہے۔

آرچنڈ:۔ دیدی! چلو چلیں۔

(بیوی جاتی ہے)

چانگ:۔ کہاں چلیں! یہاں آؤ۔

(چانگ اس کے پیچھے جاتا ہے۔ آرچنڈ اسے روکتی ہے)

آرچنڈ:۔ چانگ بھائی آپ واقعی زیادتی کر رہے ہیں۔ بچہ کوئی دیدی کا اکیلی کا نہیں ہے۔ آپ کو ابھی کچھ کام بھی نہیں ہے ذرا دیر کیوں نہیں سنبھال لیتے اسے؟

چانگ:۔ آرچنڈ! تم نہیں سمجھتی۔ تم ہمارے خاندان کو نہیں جانتیں۔ بیچ میں مت پڑو۔

آرچنڈ:۔ کون کہتا ہے میں نہیں جانتی! اور کیا چاہتے ہیں آپ دیدی سے؟ اتنی خوبصورتی سے بیچاری گھر چلاتی ہیں۔ کبھی آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیتیں۔ جب آپ کام سے لوٹتے ہیں تو گرم پانی۔ گرم کھانا۔ سب کچھ آپکے لئے تیار رہتا ہے۔ کھانے میں، کپڑے میں وہ سب جگہ آپ کو پہلے رکھتی ہیں۔ دن رات وہ کام میں لگی رہتی ہیں۔ یہ نکال وہ رکھ اور پھر پڑھائی اور عورتوں کے کام کی تو بات ہی جدا ہے۔ ہمیشہ یہی سوچتی ہیں کہ آپ کو کوئی کمی محسوس نہ ہو۔ اور آپ! آپ ان کا ذرا خیال نہیں رکھتے۔

چانگ:۔ تم تو بس یہی جانتی ہو آرچنڈ کہ اس میں اچھائیاں کون کون سی ہیں۔ میں کہتا ہوں میں نے اس سے کب برا سلوک کیا؟ میں نے تو ضرورت سے زیادہ اس کے لئے کیا۔ کیا میں نے اسے کبھی پیٹا؟ یا کوسا؟ ہر مہینے پوری کی تنخواہ اسے دے دیتا ہوں۔ کپڑے سے لے کر کھانا پینا سب اسے ملتا ہے اور آخر وہ کیا چاہتی ہے؟ اس پر بھی وہ مطمئن نہیں۔ وہ اس زندگی کو کیوں بھول جاتی ہے جو عورتیں پہلے زمانہ میں بسر کرتی تھیں؟

آرچنڈ:۔ اوہ! آپ سے بحث کرنا بیکار ہے۔ میں جاتی ہوں اپنی میٹنگ میں۔

(دروازے تک جاتی ہے، گھومتی ہے اور غصہ سے کہتی ہے) آپ! آپ عورتوں کو نیچی نظر سے دیکھتے ہیں! آپ جاگیردارانہ ذہنیت کے ہیں!

(آرچنڈ جاتی ہے)

(یہ الفاظ چانگ کو نشتر کی طرح چبھ جاتے ہیں۔ وہ خیال میں محو ہو جاتا ہے)

سن:۔ (باہر سے) چانگ! (کوئی جواب نہیں۔ سن داخل ہوتا ہے) ارے چانگ! میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔ یونین نے ۔ (چانگ کو مایوس اور پریشان دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے) کیا ہوا؟ (چانگ جواب نہیں دیتا) ہو کیا گیا ہے؟

چانگ:۔ کچھ نہیں۔

سن:۔ بتاؤ کیا ہوا؟ .... (وقفہ) ...... کیا میٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں افسوس ہو رہا ہے۔

چانگ:۔ نہیں وہ بات نہیں ہے۔

سن:۔ تو پھر کیا ہے؟ بتاؤ نا بولو۔ (چانگ کوئی جواب نہیں دیتا) ہاں تو لو سگریٹ پیو۔ (چانگ پھر بھی کوئی جواب نہیں دیتا) کیا؟ سلگاؤں بھی میں ہی؟

چانگ:۔ (اس مذاق پر ہنس پڑتا ہے) سن بیٹھ جاؤ۔ سن! میں سمجھ نہیں رہا ہوں کیا تم مجھے جاگیردارانہ ذہنیت کا آدمی سمجھتے ہو؟

سن:۔ کہنا کیا چاہتے ہو تم، صاف صاف کہو نا؟

چانگ:۔ سن! تم تو میرے گھر کو جانتے ہو۔ کہ وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے۔ اور میں اسے کس طرح رکھتا ہوں۔ آج صبح اچانک کہنے لگی تم مجھے کبھی کچھ بتاتے ہی نہیں۔ کبھی کچھ سوچتے ہی نہیں۔ تم کیا کہتے ہو؟ جو کچھ فیکٹری میں ہوتا ہے سب کچھ اسے آکر بتایا کروں ہمارے بتانا بیکار ہے۔ ابھی وہ ایک میٹنگ میں گئی ہے۔ یہ بچہ مجھ پر پھینک گئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ چاہے مجھے اچھا لگے یا برا مجھے اسے سنبھالنا پڑے گا۔ کیا عورتوں کو آزادی دینے

کا ہمارا مطلب یہی ہے؟ اگر یہی بات ہے تو پھر تم ایسا ہی کیوں نہ کرتا رہوں کہ وہ باہر جائے اور میں گھر بیٹھ کر بچہ کی دیکھ بھال کروں۔

مسن:- ہاں، ہاں کیوں نہیں کر سکتے؟ وہ تمہارے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتی ہیں لو تم پھر بھی شکایت ہی کرتے رہتے ہو۔ آخر تم کس قسم کی بیوی چاہتے ہو؟ بالکل بے زبان جو کسی بات کا جواب تک نہ دے۔ جو کبھی کسی بات پر سوچے تک نہیں؟

چانگ:- میں نے تو کبھی نہیں کہا مجھے ایسی بیوی چاہیئے۔ لیکن اب چونکہ عورتوں کو آزادی مل گئی ہے انہیں زیادتی بھی تو نہیں کرنا چاہیئے۔

مسن:- تمہارا کیا خیال ہے، کیسے کام کرنا چاہیئے انہیں؟

چانگ:- جیسا میں اسے سمجھتا ہوں، عورتوں کی آزادی کا مطلب ہے کہ ان پر ظلم نہیں ہونا چاہیئے اور میں اس پر کوئی ظلم نہیں ڈھاتا۔ میں اسے مارتا پیٹتا بھی نہیں۔ نہ ہی میں اسے کوستا ہوں۔ میں تو اس سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ وہ میرے کام میں روڑا نہ اٹکائے۔ جب وہ اپنے صفائی کے کام پر یا پڑھائی کے لئے جاتی ہے تب بھی میں اسے نہیں روکتا۔ اسے تو چاہیئے کہ ہمیشہ کی شکایتوں کے بجائے گھر کے کام کاج پر زیادہ دھیان دے۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ وہ باہر جا کر نوکری کرے اور میں گھر سنبھالوں کیا کر سکتی ہے وہ باہر کا کام؟

مسن:- تو کیا تم گھر کا کام کر سکتے ہو؟

چانگ:- (بڑبڑاتے ہوئے) ہاں۔ میں۔ . . . . . .

مسن:- رہنے بھی دو چانگ تم کیا کروگے؟ تم اپنے گھر کے لئے کرتے ہی کیا ہو؟ تم کہتے ہو وہ تم پر کچھ دھکیل گئی ہے ذرا بتاؤ تو میں بھی سنوں کیا بات ہے۔

چانگ:- بچہ مجھے دے گئی۔

مسن:- بچہ تمہیں دے گئی؟ ایں؟ اور خود کہاں چلی گئی؟

چانگ:- کسی میٹنگ میں۔

مسن:- تم اس وقت کیا کر رہے ہو؟

چانگ:- مجھے ہفتہ بھر کام ہوتا ہے۔ کیا اتوار کو بھی میں آرام نہ کروں؟

مسن:- یہ ہوئی نہ بات۔ تمہیں ابھی کوئی کام نہیں ہے۔ اتوار کو تمہیں چھٹی ہوتی ہے دیدی صبح سے شام تک کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ اور اتوار کو تم تو کوئی فلم بھی دیکھ سکتے ہو اور وہ؟ کیا وہ اتوار کو بھی ہمیشہ کی طرح کام نہیں کرتیں؟ آج تو خیر انہیں کسی میٹنگ میں جانا تھا۔ میں سمجھتا ہوں تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ تم بچہ کو سنبھالو۔

چانگ:- ہنگ ہوچھو تو سن بچہ کو سنبھالنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ڈر تو یہ ہے کہ اگر میاں نے اسے اس طرح چھوٹ دیدی تو وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور اگر پڑوسیوں کو پتہ چل گیا تو کہیں گے میں اپنی بیوی کی نازبرداری کرتا ہوں۔ کہیں گے میں بیوی کا بندہ بے دام ہوں اور میں کہیں منہ دکھانے کا نہ رہوں گا۔

مسن:- اوہ! بیوی کو تھوڑی مدد دیدی تو اس کے ناز نخرے اٹھالئے۔ اسکے غلام ہوگئے۔ جو بھی کوئی اس قسم کی باتیں کرتا ہے ضرور اس کے دماغ میں فتور ہے۔ جب بیوی اپنے شوہر کو مدد دیتی ہے تب کوئی کیوں نہیں ہنستا؟ کیا اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ بیوی تو غلام ہوتی ہی ہے۔ اور یہی جاگیردارانہ ذہنیت ہے۔ اگر کسی شوہر نے اپنی بیوی کی مدد کر بھی دی تو کیا ہوا؟ تم تو عوام کی خدمت کرنا جانتے ہو۔ فیکٹری کے سارے امیدوار کہتے ہیں تم بڑھیا استاد ہو۔ کہتے ہیں تم بڑے ماہر ہو۔ اور انہیں پڑھائی میں بھی مدد پہنچاتے ہو۔ ابھی انہیں فیکٹری میں گئے ہوئے سال بھر ہی ہوا ہے اور وہ مشین چلا لیتے ہیں اور پڑھ لکھ لیتے ہیں . . . .

چانگ:- وہ فیکٹری کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے ان کی مدد کرنا پڑتی ہے۔ لیکن وہ جو گھر میں یہ سب بکھیڑا لئے بیٹھی ہے . . . .

مسن:- وہ یہاں کیا کرتی ہے اس پر ناک کیوں سکوڑتے ہو؟ اگر وہ نہ ہوں تو تمہارے بیوی آ جائیں۔ اگر دیدی گھر کی دیکھ بھال اس طرح نہ کرتیں تو کیا تم اس بے فکری کے ساتھ کام کر سکتے؟ پیداواری مقابلہ کی مہم میں کیا یہ دیدی نہیں تھیں جو تمہارے لئے ہر وقت گرم چائے اور تلیے لاتی تھیں۔ جنہیں دیکھ کر ہر ایک کے منہ میں پانی آجاتا تھا؟ تم بھولتے ہو کہ تمہاری کامیابی میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو کام کرنے کا نیا طریقہ دریافت کیا ہے اس کا سہرا ان کے سر نہیں بندھتا؟ اس لئے تمہیں ان کی تھوڑی بہت مدد ضرور کرنی چاہیئے۔

چانگ:- تم یہی کہے جاتے ہو میں اسے مدد نہیں کرتا۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کتنی بدھو ہے۔ وہ بالکل کند ذہن ہے۔ دنیا کی کوئی چیز اس کے دماغ میں نہیں آتی۔ ذرا سی بات بتاؤ سوالوں کی جھڑی لگا دیتی ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر مغز پچی کروں۔

مسن:- تم پھر غلطی کر رہے ہو۔ جب تم نے پہلے پہل نوسکھوں کو سکھانا

شروع کیا تھا اس وقت اگر تم یہی کہتے کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے، بدھو ہیں۔ اور اگر تم جیسے ہی ان کے بہتے تو وہ پڑھنا لکھنا یا مشین چلانا کیسے سیکھ جاتے۔ کیا میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ صاف اور واضح نہیں ہے؟ اور یہی بات دیدی پر عائد ہوتی ہے۔

چانگ:۔ (لمحہ بھر سوچتا ہے) ٹھیک ہے۔ یہی مشکل ہے۔ میں ہی اس کی کافی رہنمائی نہیں کر رہا ہوں۔

سن:۔ یہ نہیں کہتا میں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے نہ کہ ایک دوسرے کی رہنمائی کرنی چاہیئے۔

(چانگ خاموش ہے)

سن:۔ کیا اب بھی نہیں سمجھے تم؟ آئے جانے بھیا تم تو بیکار اسے الجھاؤ ہو۔ میرا کہتے کہتے حلق سوکھ گیا اور تم .....

چانگ:۔ اچھا، بیٹھو جاؤ۔ میں تمہیں پانی لا دیتا ہوں۔

(چانگ ایک گلاس سن کے لئے اور دوسرا اپنے لئے بھرتا ہے)

سن:۔ ایک اور بات مجھے تم سے کہنی ہے۔

چانگ:۔ کہو وہ بھی کہہ ڈالو۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بس آج اتنا ہی رکھو۔

سن:۔ تم نے کیسے جان لیا میں تم سے کیا کہنے والا ہوں؟ میں خوشخبری لایا ہوں تمہارے لئے۔

چانگ:۔ اچھا، اچھا اب بتاؤ نہیں مجھے۔

سن:۔ کون بتا رہا ہے تمہیں؟ ارے اسے سن کر تم اچھل پڑو گے! فیکٹری نے تمہیں ٹیکنیکل ٹریننگ کلاس میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔

چانگ:۔ سچ؟

سن:۔ ہاں۔ ہاں بالکل سچ۔

چانگ:۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے مجھے یہ؟

سن:۔ منہ جو بنا رکھا تھا تم نے اس وقت! ایسے تو مریل لگ رہے تھے تم۔ تمہیں بتاتا کیا خاک؟ بڑی دیر کے بعد تو مجھے یاد آیا وہ۔

چانگ:۔ (ہنستا ہے) اب بتاؤ یہ ہوا کیسے؟ سارا قصہ سنانا۔

سن:۔ ہماری سموچی فیکٹری میں سے صرف دو آدمی جا رہے ہیں۔ اس طرح کا موقع آسانی سے کہیں مل جاتا۔

چانگ:۔ دوسرا کون ہے؟

سن:۔ فنیشڈ ڈپارٹمنٹ کا لی۔ چونکہ تم دونوں بڑے محنتی ہو اور تم نے نئے طریقے نکالے ہیں اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ تمہیں بھیجا جائے۔ لیکن تم کہیں اس موقع کو کھو مت بیٹھنا۔ وہاں سے کچھ نئی چیزیں سیکھ کر آنا۔

چانگ:۔ فکر نہ کرو۔ میں اس موقع کا پورا پورا فائدہ اٹھا لوں گا۔ لیکن ہماری ٹیم کا کیا ہوگا؟ اور وہ میٹنگ بھی تو ہے اس میں مجھے رپورٹ بھی پیش کرنا ہے وہ سب کیا ہوں گے؟

سن:۔ ٹیم کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ اپنی یونین کچھ نہ کچھ کرے گی۔ ٹیکنیکل بحث والی میٹنگ بھی کر لی جائیگی۔ کسی بھی اتوار کے دن جب ہمیں فرصت ہوگی کر لیں گے۔ فیکٹری کی بھی تم پرواہ نہ کرو جب تمہیں وقت ملے تو ذرا گھر کی فکر کرنا۔ کل تمہیں چلے جانا ہے۔

چانگ:۔ کل؟

سن:۔ ہاں کل۔ آج سہ پہر کو ذرا یونین کے دفتر میں چلے جانا۔ کل دس بجے تم رپورٹ بھی دیدینا۔

چانگ:۔ یہ تو بڑی زوردار بات ہے۔ (چانگ کو اپنی بیوی کا جھگڑا یاد آتا ہے) ہاں ہاں آج یہ ہنگامہ کیوں ہو پڑا؟

سن:۔ سب تمہاری وجہ سے ہی ہوا اور کیا؟

(آرچڈ اور بیوی داخل ہوتی ہیں)

آرچڈ:۔ آپ بھی یہیں ہیں بھیا؟

بیوی:۔ ہیلو سن!

سن:۔ کیسی میٹنگ تھی بھئی تمہاری آج؟

آرچڈ:۔ ہم آج ایک مثالی کارکن چن رہی تھیں۔

سن:۔ کیسا رہا چناؤ؟

آرچڈ:۔ بڑا اچھا رہا۔ لیکن دیدی نہیں چنی گئیں۔

سن:۔ کوئی بات نہیں۔ اگلی بار وہ زیادہ محنت کریں گی۔

چانگ:۔ (بڑبڑاتے ہوئے) مثالی کارکن یوں ہی نہیں بن جاتے۔

آرچڈ:۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ! یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اور پھر دیدی تو کچھ کبھی بھی نہیں ہیں۔ بدھو ہیں، جاہل ہیں۔ اور پچھڑی ہوئی ہیں۔ مثالی کیسے ہو سکتی تھیں وہ!

سن:۔ پھر وہی شروع کر دیا آرچڈ تو نے؟

آرچڈ:۔ جب آپ کا یہی خیال ہے تو دیدی کر بھی کیا سکتی ہیں؟

سن:۔ ایسی باتیں مت کرو تم۔ اگر وہ اگلی بار چنی گئیں تو کیا اچھا نہیں ہوگا؟

آرچیڈ:- چانگ بھائی میں آپ سے معلوم کر رہی ہوں۔ اگر دیدی اگلی مرتبہ جیت گئیں تو آپ کیا دیں گے؟

چانگ:- اگر واقعی وہ اگلی بار جیت گئی تو میں اسے مان جاؤں گا۔

آرچیڈ:- اگلی بار تک آپ کو انتظار بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ ابھی سے تعریف کیجئے ان کی۔

(آرچیڈ ایک لال جھنڈا نکالتی ہے جس پر لکھا ہے "صحت عامہ کے کام کی مثالی کارکن" اور چانگ اور سن کو دکھاتی ہے)

سن:- ہاں تو چانگ کیا کہتے ہو اب؟ (بیوی سے) مبارک ہو دیدی۔

چانگ:- (خوش ہو کر) میں تو کبھی یقین نہ کر پاتا۔

آرچیڈ:- آپ تو سیکڑوں چیزوں پر یقین نہ کرتے۔ دیدی اب وہ نہیں ہیں جو پہلے کبھی تھیں۔ آپ اب انکو سالوں اس طرح پرانے ڈھنگ سے نہ پیش آیا کریں۔ وہ تین سو سے چار سو تک حرف پڑھ سکتی ہیں اور اب وہ عورتوں کے گھریلو کام کی ٹیم میں بھی ہیں۔ اور بڑھیا کام کر رہی ہیں۔ اب آپ کو حق کیا ہے کہ آپ انہیں پچھڑی ہوئی کہیں؟

چانگ:- جانتی ہو تم اتنے حرف؟ یہ گھریلو کام کی ٹیم میں تم کب پہنچیں مجھے بتایا کیوں نہیں یہ سب؟

بیوی:- بتایا نہیں میں نے؟

چانگ:- نہیں تو میں نے تو کبھی سنا نہیں۔

آرچیڈ:- سنا نہیں۔ یہی تو دقت ہے آپ کے ساتھ۔ دیدی کیا کہتی ہیں۔ آپ سنتے ہی کہاں ہیں۔

چانگ:- اچھا بابا۔ میں ہی غلطی پر تھا۔ اب تو راضی؟

سن:- یہ ہوئی نہ بات ذرا! غلطی کرو تو اسے تسلیم بھی کر لو۔ مزدور طبقہ کے ممبر ہونے کے لئے یہی ایک طریقہ ہے۔

آرچیڈ:- دیدی آؤ کھڑی ہو جاؤ چانگ بھائی کے سامنے (چانگ کی طرف مڑ کر) چانگ بھائی معافی نہیں مانگیں گے آپ ان سے؟

بیوی:- آرچیڈ تم نے بھی حد کر دی ہے۔

سن:- میں تمہارے لئے ایک اور خوشخبری لایا ہوں۔

آرچیڈ:- وہ کیا؟

سن:- چانگ کو ٹیکنیکل ٹریننگ کلاس میں بھیجا جا رہا ہے۔

بیوی:- ہیں! یہ تو بڑی اچھی خبر ہے (چانگ سے) کب جا رہے ہو؟

چانگ:- کل۔

بیوی:- (سن سے) کل؟ کیا انہیں وہیں رہنا پڑے گا؟

سن:- انہیں سے پوچھو۔

چانگ:- ہاں وہیں رہنا پڑے گا۔ کل صبح دس بجے مجھے وہاں پہنچنا ہے اطلاع بھی دی ہے۔

بیوی:- اوہو کو اچھا ہوا میں نے وہ جاکیٹ تیار کر لیا تھا۔

آرچیڈ:- انہیں بھی تو بتاؤ دیدی۔ ذرا دیکھئے تو پہنکر

(بیوی جاکیٹ لا کر چانگ کو دیتی ہے)

بیوی:- پہنکر دیکھ لو۔ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔

آرچیڈ:- دیدی کا کام کبھی بگڑتی نہیں ہیں۔

سن:- واہ! یہ تو بڑا زوردار سلا ہے۔ بھئی۔ اس بار بھی دیدی کے کام کی کوئی شکایت کرنا ہے تمہیں؟

چانگ:- (جاکیٹ پہنتا ہے) یہ تو بالکل ہی ٹھیک بیٹھی۔ اتنے جلدی اسے کیسے تیار کر لیا؟

بیوی:- میں اپنا زیادہ تر کام تمہاری غیر موجودگی میں ہی کرتی ہوں۔ جاؤ ڈٹ کر پڑھائی کرو۔ تم بھی مثالی طالب علم بن جاؤ۔ گھر میں سنبھال لوں گی۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔

چانگ:- لیکن اتنا سارا کام ہے گھر کا تمہاری پڑھائی میں رکاوٹ نہیں ہوگی؟

بیوی:- نہیں کوئی بات نہیں۔ میں تھک جاؤں گی لیکن اس سے کیا۔ یہ تو اور بھی اونچی جماعت میں داخلہ لینے والی ہیں، وہاں تو بڑی پھرتی سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اب وہ بھی جلد شروع ہو جائے گی

آرچیڈ:- چانگ بھائی۔ آپ گھر کی طرف سے بے فکر رہیئے۔ ہم دیدی کی مدد کریں گے۔ بس آپ ان کو حقیر نہ سمجھیں باقی سب ٹھیک ہو جائیگا۔

چانگ:- ہاں میرے جانے کے بعد تم کبھی کبھی ان کے کام میں ہاتھ بٹا دیا کرنا۔

سن:- ضرور! ہم مدد کریں گے ان کی۔

چانگ:- اور واپس آنے کے بعد میں بھی ضرور..........

سن:- ان کی مدد کروں گا۔

(سب ہنس پڑتے ہیں)

چانگ:- (اچانک یاد کر کے) ہاں تم نے پچھلی مرتبہ مجھے ایک نوٹ بک لانے کیلئے کہا تھا نا میں ہمیشہ بھول جاتا تھا۔ (ایک نئی نوٹ بک جیب میں سے نکال کر) میں نے فیکٹری میں جو کو وقت سے پیشتر ہوا اکر لایا

تھا۔ اس کے صلہ میں مجھے یہ انعام ملا تھا۔ تم اسے استعمال کرو۔ مجھے امید ہے کہ تم جلد ہی ایک مثالی طالب بن جاؤگی۔

بیوی:- لیکن تم بھی تو بہت جارہے ہو۔ تمہیں ضرورت نہ ہوگی اسکی؟

چانگ:- نہیں تم لے لو۔

حسن: ہاں یہ تو وہ چیز ہے جسے ہم لیتے ہیں" دونوں طرفین بالکل یکساں" چانگ۔ لکھتے کم آپ کے حالات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کل تم ایک مثالی جوڑا بن جاؤگے۔ آؤ یہ خوشی کا دن منائیں۔ دیدی کو ہمیں ان کے ماڈل بچے بن جانے پر مبارکباد بھی تو دینی ہے۔ اور چانگ بابا کو دعوت بھی تو کرنی ہے۔ میں جاکر کچھ گوشت لاتا ہوں۔

بیوی:- جانے کی ضرورت نہیں ہے، میں خرید لائی ہوں۔

حسن:- تو پھر کچھ پینے پلانے کی چیز لانی پڑے گی۔ (الماری میں سے ایک خالی بوتل نکالتا ہے)

چانگ:- لاؤ میں لاتا ہوں۔

آرچڈ:- جانے دو انہیں ہی چانگ بھائی۔ (حسن جاتا ہے۔ آرچڈ اسے پکارتی ہے) ٹھہرو میں بھی آتی۔

بیوی:- آرچڈ، تم ذرا جلدی آنا۔

(آرچڈ جاتی ہے۔ چانگ اور بیوی کچھ دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں)

چانگ:- آؤ چلو پکانا شروع کریں۔

بیوی:- میں کروں گی تم آرام کرو۔

(چانگ اسے ترکاری تیار کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ وہ بھی کچھ کرنا چاہتا ہے۔ جھاڑو اٹھاتا ہے اور گھر صاف کرنے لگتا ہے۔

بیوی:- (میز صاف کرتے ہوئے۔ ڈزائن کا نقشہ اٹھاتی ہے) اس کا کیا کروگے؟

چانگ:- اسے دراز میں رکھ دو۔ ذرا اچھا بچہ رو پڑتا ہے۔ چانگ پلنگ کی طرف دوڑتا ہے) اچھا تو اٹھ بیٹھا! پاپا تمہیں لے لیں گے بنے! (بچہ کو گود میں اٹھا لیتا ہے)

بیوی:- (چانگ کے پاس جاتی ہے) لاؤ مجھے دیدو اسے۔

چانگ:- نہیں میرے پاس ابھی کچھ کام نہیں ہے۔ میں اسے رکھوں گا کچھ دیر (بچہ کو گنگنا کر سناتا ہے)

(پردہ)

(ترجمہ:- ذوقی عباسی)

بلونت گارگی

پاڑیا

لالو بھائی:- (ہنستے ہوئے) واہ لیلا جی! واہ! کبھی کبھی تو آپ کمال کی بات کرتی ہیں — ساری بات طے ہو چکنے پر بھی پوچھتی ہیں۔ کونسی بات!

لیلا:- کونسی بات؟

لالو بھائی:- اری — یہی آپ کے فلم میں پارٹ کرنے کی بات۔ اور کونسی بات۔ بھلا اب بات رہ ہی کونسی گئی ہے جس کا ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔ میں نے تو اسی روز فیصلہ کر دیا تھا جس روز میں نے تمہیں "بھاگتا بھوت" میں سائیڈ پارٹ کرتے دیکھا۔ میرے من نے کہا۔ "لالو بھائی! اس لڑکی کے ماتھے پر اسٹار چمک رہا ہے۔ یہ لڑکی اسٹار بن سکتی ہے۔ بیس سال سے انڈسٹری میں ہوں شکل دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ گو کاروبار کے لحاظ سے مجھے ایسی باتیں نہیں کہنا چاہئیں۔ لیکن اب آپ کے ساتھ کوئی کاروباری بات رہی بھی تو نہیں۔ آپ مجھے جان گئیں۔ میں آپ کو جان گیا لیلا جی! اس اسٹوڈیو کے باہر سینکڑوں لوگ چکر لگاتے ہیں لیکن میں کسی ایرے غیرے کو اندر گھسنے نہیں دیتا۔ اسٹوڈیو کو تو میں مندر سمان سمجھتا ہوں۔ دیکھ لیجئے سامنے بجرنگ بلی کی تصویر ہے۔ میں مہابیر کا پجاری ہوں — جوانی میں بہت کسرت کیا کرتا تھا۔ اکھاڑے میں سب کو پچھاڑتا تھا۔ سارا تکیہ میرے نام سے کانپتا تھا۔ ایک بار گاما کے بھتیجے امام بخش سے کشتی ہوئی۔ میں ان پنجابی پہلوانوں کی طاقت خوب سمجھتا ہوں۔ بھینسے کی طرح بس طاقت پر ہی اچھلتے کودتے ہیں۔ میں نے اپنے گورو سے پڑھا تھا اگر سور کا مقابلہ کرنا ہو تو جب وہ اندھا دھند حملہ کرے ایک طرف ہٹ جاؤ۔ اپنے بل پر خود ہی گر جائیگا۔ میں خم ٹھونک کر سامنے آیا۔ شوا جی کا دھیان کیا۔ بجرنگ بلی کو یاد کیا۔ ہنومان چالیسے کا پاٹھ کیا اور میدان میں اتر آیا۔ جب امام بخش مجھ پر جھپٹا تو میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ منہ کے بل جا گرا۔ میں نے دبوچ لیا۔ پھر اس نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے لیکن میں نے نہ چھوڑا۔ آدھ گھنٹہ تڑپتا رہا۔ ہانپ گیا۔ آخر جب چاروں شانے چت ہو گیا تب چھوڑا۔

ان دنوں مجھ میں بہت بل تھا۔ دو تین پہلوانوں یا موالیوں کو تو چٹکیوں میں اڑا تا تھا۔ اب تو وہ بات گئی ہے۔ پہلوان لوگ بھی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ اس پر بھی۔ بھلا کیا عمر ہوگی میری۔ ؟ اچھا جی! مان جاؤں۔ اگر آپ میری عمر بتا دیں۔ سوچئے اندازہ لگائیے۔ کیا عمر ہوگی میری — ؟

لیلا:- آپ کی عمر — یہی پچاس برس۔

لالو بھائی:- (ہنس کر) اس میں تیرہ اور جمع کر لیجئے۔ میری عمر پنڈت نہرو جتنی ہے — اب پنڈت جی کو بھلا کوئی بوڑھا کہہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں گھوڑے کی سواری کرتے ہیں۔ کرکٹ کے میچ کھیلتے ہیں۔ بھلا بوڑھے یہ کام کر سکتے ہیں —؟ لیلا جی۔ پچھم میں تو پچاس سال کا آدمی جوان گنا جاتا ہے۔ یہاں ہمارے دیس میں تیس سال کے بعد ہی لوگ [illegible] تکنے کی تیاری کرتے ہیں۔ پچھم میں پچاس سال کے بعد آدمی شادی کرتا ہے یہاں سنیاس دھار لیتا ہے۔ لیکن لیلا جی! پچھم میں اخلاق کی طرف کوئی دھیان نہیں۔ وہاں کی عورتیں شراب پیتی ہیں۔ ناچتی ہیں۔ آوارہ گھومتی ہیں۔ — اخلاق میں کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارا اخلاق ہی ہے جو ہم اب تک بچے ہوئے ہیں۔ نہیں تو اب تک کبھی کا مٹ گئے ہوتے۔ کریکٹر نے ہی ہندوستان کو بچا رکھا ہے — میرے اسٹوڈیو کا کریکٹر بہت اونچا ہے۔ یہاں سب لوگ فیملی سمان کام کرتے ہیں میں تو بس ان کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ دن ہو یا رات — کوئی ڈر نہیں۔ پھر بھی یہ بمبئی شہر ہے — غنڈوں اور موالیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس لئے اکیلے بالکل نہ آیئے۔ گیتا بالی اپنے ساتھ نوکر لاتی ہے — نروپا رائے خاوند — اور کلدیپ کور کتا — آپ بھی اپنے ساتھ ضرور کسی کو لائیے — چاہے خاوند کو چاہے کتے کو — آپ کے خاوند کیا کام کرتے ہیں۔ ؟ اگر ان کے پاس کوئی خاص کام نہیں تو انہیں بھی کہیں اسٹوڈیو میں ہی کام پر لگا دوں گا۔ بجائے ہر وقت آپ کے ساتھ دن رات شوٹنگ پر یہاں آئیں گے۔ مجھے تو آدمیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ انہیں بھی کہیں نہ کہیں اٹکا دوں گا — لیکن وعدہ نہیں کرتا۔ وعدہ صرف آپ کے ساتھ ہے۔ یہاں منہ کا سودا ہے۔ لیلا جی! جو زبان کا پکا نہیں اس کے لئے

پر بھی کوئی اعتبار نہیں۔ بمبئی میں لاکھوں کروڑوں کا ہیر پھیر زبانی ہوجاتا ہے۔ سٹہ مارکیٹ "ہاں" اور "نہ" پر چلتی ہے۔ "ہیرا خرید لیا" "دو نمبر" دن پر لاکھوں کروڑوں اِدھر سے اُدھر ہوجاتے ہیں۔۔۔ میں تو زبان کا قائل ہوں۔ اس لئے صاف بات پہلے ہی کہہ دوں۔۔۔ بیشک یہ صاف بات بہتوں کو اچھی نہیں لگتی۔ لیکن میرا یہی قاعدہ ہے۔ صاف بات۔ آپ کا کانٹریکٹ پکا۔ لیکن آپ کے مشورے کا کچھ دن ٹھہر کر۔۔۔ ویسے کام اُن کا بھی ہو جائیگا۔ بس اب میں آپ کو اور کہیں کام نہ کرنے دوں گا۔ ارے بیلا جی! اس اسٹوڈیو میں سے بیس اسٹار نکلے ہیں۔ سلوچنا۔ شوبھنا سمارتھ۔ گوپ اور دُرگا کھوٹے کا ٹیسٹ میک اپ یہیں ہوا تھا۔۔۔ آپ کی دعا سے میں نے ابتک پچیس فلمیں بنائی ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ روپے کا ہیر پھیر کیا ہے۔ اسٹوڈیو میں ایک دم آٹھ فلمیں چالو رہا کرتی تھیں۔ کادمبری اشوک۔ سکندر۔ اور آغا کا سیٹھا۔ سب تصویریں میں نے ہی بنائی ہیں۔ اس دھندے میں بیلا جی! ایک بات ضرور سیکھ لی۔ کہ اسٹار ایکٹرس سے ہماری نہیں بنھ سکتی۔ اسٹار کا دماغ ہوتا ہے آسمان پر۔ ابھی ان نئے نئے گھٹیا پروڈیوسروں نے ان ایکٹرسوں کا دماغ خراب کر دیا ہے ورنہ مجال تھی ان کی۔۔۔ انڈسٹری میں جس پر انگلی رکھ دوں۔ کبھی کسی نے چوں تک نہیں کی۔ ان پنجابی پروڈیوسروں کے آنے سے انڈسٹری میں گھپلا پڑ گیا ہے۔ اپن نے کبھی کسی ایکٹریس کا نخرہ نہیں سہا۔ اسٹوڈیو ہے کوئی چکلا نہیں ہے۔ یہاں روپیہ دیتے ہیں نخرے کے لئے نہیں۔ کام کے لئے۔ نخرے وخرے کے لئے اور بہت سی جگہیں ہیں۔ ایسی جگہ۔۔۔۔ اب آپ کو کیا بتاؤں۔ اپنے منہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اسی اصول پر کئی بار لاکھوں کی مار کھا چکا ہوں لیکن اصول اصول ہے۔ "راج ہنس" کی شوٹنگ چالو تھی۔ کانتا آپٹے سے دو سال کا کانٹریکٹ تھا۔ آدھی شوٹنگ ہو چکی تھی فلم پر ڈیڑھ لاکھ سے اوپر خرچ ہو چکا تھا کہ کانتا آپٹے نے آئیں بائیں کرنا شروع کی۔ میں نے کہا۔ "بائی۔ یہ نہیں چلیگا۔ نقصان اٹھا لیں گے۔ لیکن یہ دھندا نہیں کریں گے۔" لیکن اس کا دماغ تو آسمان پر تھا۔ بگڑ گئی۔ اور بگڑی بھی کس بات پر۔ آپ سنکر حیران ہوں گی۔۔۔ انڈسٹری میں اتنی عمر گزار دی بیلا جی! کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا۔ مجھے تنتنا پسند نہیں۔ میرا اسٹوڈیو اس بات کے لئے سارے ہندوستان میں مشہور ہے۔ میری ایک فلم کا اُدگھاٹن وجے لکشمی پنڈت نے کیا تھا۔ اور دوسری کا سروجنی نیڈو نے۔ کون لیڈر ہے جو یہاں نہیں آیا۔ لیکن ان فسادوں نے ہمارا لٹیا ڈبو دی۔ فسادوں کے دنوں اس فرش پر چھ فلمیں چالو تھیں۔ چھتیس لاکھ روپیہ پھنسا ہوا تھا۔ سب فلمیں نامکمل اور ہر فلم میں کہیں نہ کہیں مسلمان آرٹسٹ پھنسا ہوا تھا۔ بس اِدھر پاکستان بنا اُدھر سب مسلمان آرٹسٹ بھاگ گئے۔ میں نے انڈسٹری میں کبھی مذہب کو نہیں آنے دیا۔ لیکن زمانہ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ اب درگا مائی کی قسم کھاتی ہے۔ کہ کسی مسلمان آرٹسٹ کو پھٹکنے نہ دونگا۔ وہاں پٹھان ہے اُسے بھی بدل کر کسی سکھ کو رکھوں گا۔ یہ مسلمان وقت پڑنے پر ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ ہندو اس معاملے میں بہت نرم مزاج ہے۔ بس دیا دھرم سے دبے ہوئے ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ پاکستان بننے پر بھی مسلمان ہندوستان میں ڈٹ کر بیٹھے ہیں۔ اُدھر پاکستان میں ایک بھی ہندو نہیں۔ اور میں تو سنتا ہوں جو بچے کھچے مسلمان ہندوستان میں ہیں۔ ایک اور پاکستان بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ دیکھی ان کی جرأت۔ اِدھر کوئی ہندو پاکستان جا کر دکھائے۔ چٹیا کاٹ کر ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ نہ معلوم پنڈت نہرو کو مسلمانوں سے کیوں اس قدر عشق ہے۔ اجی ان لوگوں میں دم نہیں۔ میں تو بس سردار پٹیل کو مانتا تھا۔ شیر کا بچہ تھا ڈٹ جاتا تھا۔ لیکن ہمارے آجکل کے لیڈروں میں بوتا نہیں۔ اپن نے تو نیشنلزم دیکھ لیا۔ کانگریس کو چندہ دیکر دیکھ لیا سب نپاڑئے ہیں۔ بس یا تو ہندو راج میں سکھ ہوگا۔ یا پھر انہیں کمیونزم لے گا۔ کمیونزم سے یہ لوگ کیسے بچتے ہیں۔ ان سب لوگوں کا جواب تو بس کمیونزم ہے۔ واہ واہ! مارکس نے کیا فارمولا نکالا۔ سب کو روٹی دو۔ سب کو کپڑا دو۔ سب لوگ اُس کے پیچھے ہو لئے۔ کیا اچھا فارمولا ہے۔ درگا مائی کی قسم! اگر مارکس فلم پروڈیوسر ہوتا۔ تو وہ ہٹ "نہیں بناتا کہ شانتا رام اور محبوب کی فلمیں ڈبے میں دھری رہ جاتیں۔ کیا دماغ تھا اُس آدمی کا! اپن تو اُس کو مانتے ہیں۔ میں کمیونزم کا زبردست حامی ہوں۔ اپنے اسٹوڈیو میں بھی ایک قسم کا سوشلزم ہے سب کام کرنے والے برابر۔۔۔ مجھے یہاں کوئی روپیہ اکٹھا نہیں کرنا۔ تجوریاں نہیں سمیٹنا۔ روز کا دھندہ چلتا جائے۔ بس یہی کافی ہے۔۔۔ "دو غنڈے" فلم کا نام تو سنا ہوگا۔ آپنے اس میں چارلی ہیرو کا پارٹ کر رہا تھا۔۔۔ لیکن فلم آدھی مشکل سے ختم ہوئی ہوگی کہ فساد پھوٹ پڑے اور چارلی بھاگ کر کراچی جا چھپا۔ میں نے دوبارہ کراچی آدمی بھیجا سپیشل ہوائی جہاز کا انتظام کیا۔ چارلی کو دس ہزار روپیہ روز دینے کا وعدہ کیا لیکن وہ غنڈہ نہ مانا۔ بہت دلچسپ فلم ہے بیلا جی! کہانی میں نے خود ہی لکھی تھی۔ غنڈوں کا خوب پول کھولا ہے۔ بھلا مجھ سے کون غنڈہ چھپا ہوا ہے بمبئی کا کون موالی ہے جو مجھے نہیں جانتا۔ کون سکھ ڈرائیور ہے۔ کون سودخور پٹھان ہے جو میرا واقف نہیں۔ نارس روڈ اور بھنڈی بازار کے چھرے باز سب مجھے دادا کہتے ہیں۔ میں نے چارلی کو بہتیرا کہلوایا کہ کسی سالے کی مجال نہیں جو تیری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ بس دس روز کیلئے فلم ختم کرنے کے لئے ہو جا۔ لیکن وہ بدمعاش نہ آیا۔ اب میں کیا کروں گا۔ جانتی ہو کیا کروں گا؟ تم سوچتی ہوگی کہ فلم ضائع ہو جائیگی۔ لیکن گجراتی کبھی کوئی چیز ضائع نہیں کرتا۔ یہی ایک سبق ہمارے باپ نے

ابھی پڑھایا ہے۔ میں فلم میں چارلی کو ماردوں گا اور فلم کو مکمل کروں گا۔ فسادوں میں میں نے کسی کو نہیں مارا لیکن اب چارلی کو ضرور ماروں گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہاں تو میں کانتا آپٹے کی بات کر رہا تھا۔ سنئے۔ بڑی مزیدار بات ہے کتنی معمولی سی بات پر وہ بگڑ گئیں۔ اب جانئے یہاں قاعدہ ہے کہ جب گاڑی اسٹوڈیو سے باہر جاتی ہے تو پھاٹک پر دربان ہر گاڑی کو چیک کرتا ہے۔ شانتا آپٹے کی گاڑی کو بھی دربان نے روک لیا۔ بس اسی بات پر بگڑ گئیں کہنے لگی "آپ مجھے کیا چور ڈاکو سمجھتے ہیں۔؟ سیٹھ صاحب۔ آپ میرے لئے علیحدہ دروازہ بنوایئے۔ میں اس پھاٹک سے نہیں آؤں گی" میں نے کہا۔ ہائی یہاں کوئی چور نہیں۔ کوئی ڈاکو نہیں۔ اگر میں آپ کے لئے اصول توڑ دوں تو باقی لوگ کیا کہیں گے۔ کیا وہ ڈاکو ہیں۔؟ اصول چور ڈاکوؤں کے لئے نہیں بلکہ شریفوں کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن لیلا جی! وہ تو اپنی بات پر اڑ گئی۔ وہ بھی سمجھتی تھی فلم پہ دو لاکھ خرچ آچکا ہے۔ ہم اُسے کیسے ناراض کریں گے۔ ادبچہ اداکاروں میں بس یہی ایک عیب ہے فلم شروع ہو جانے پر وہ پروڈیوسر کی جان اپنی مٹھی میں سمجھتے ہیں۔ ہم نے کہا "بابا! کھیلا کاہے کو مارتا ہے۔ یہ لو۔ اپنا اگلا پچھلا حساب اور چھٹی کرو۔ وہ منہ دیکھتی رہ گئی۔ پھر اُسنے لاکھ منتیں کیں۔ لیکن میں نہ مانا۔ اس کے بعد جس لڑکی کو میں نے وہ رول دیا وہ بالکل نئی تھی۔ بس آپ کی طرح۔ اب وہ اسٹار ہے۔ ساٹھ ہزار کا کانٹریکٹ کرتی ہے۔ میں جس آرٹسٹ سے کام کرتا ہوں اسے اپنا سمجھ کر۔ جتنی مجھ سے نبھا ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں میری باتوں کا بُرا تو نہیں مان رہیں؟ میں تو آپ کو یہ صلاح اسی لئے دے رہا ہوں کہ اب ہم میں اب کوئی مت بھید نہیں۔ آپ ہمیں چھوڑ دیں تو چھوڑ دیں لیکن ہم آپ کو نہیں چھوڑیں گے۔ اور دیکھئے لیلا جی! اس انڈسٹری میں آپکو بہت سے لوگ ملیں گے جو آپ کو طرح طرح کے سبز باغ دکھائیں گے۔ بھولی چڑیا سمجھ کر پھانسنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کسی کی باتوں میں نہ آئیگا۔ ایشور نے آپ کو روپ دیا ہے۔ اور آپ کہتی ہیں کہ اس سے پہلے آپ سٹیج اور ریڈیو میں بھی پارٹ کرتی رہی ہیں۔ شبدا چارن میں نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہ سب باتیں ٹھیک ہونے پر آپ کی ترقی میں کوئی شخص بادھا نہیں ڈال سکتا۔ لیکن یہ سب اسی صورت میں ہوگا جب آپ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھیں۔ انڈسٹری غنڈوں اور لپاڑیوں سے بھری پڑی ہے۔ آپ کسی کے کہنے پر نہ جایئے۔ ہر ایک کو چور اچکا سمجھئے بس میری صلاح پر عمل کیجئے۔ اجی لیلا جی! پچھلے سال ہی کی بات ہے۔ اسی طرح آپ جیسی ایک سیدھی سادی لڑکی انڈسٹری میں آئی۔ پہلا میک اپ میں نے کیا۔ دو فلموں میں ہی چمک نکلی۔ بس پھر کیا تھا۔ بیسوں پروڈیوسر اس کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ میں نے اسے بہتیرا کہا۔ کہ اب جم کر ایک جگہ کام کرو۔ ایک اڈا بناؤ۔ لیکن اس کے سر پر تو شہرت کا بھوت سوار تھا۔ ایک مسلمان ایکٹر کے پھندے میں آگئی۔ بس لے اڑا۔ پھر اُسے اسی مسلمان ایکٹر سے شادی کرنا پڑی۔ ستیا ناس ہو گیا۔ اب سمجھو اس ایکٹر کی داشتہ ہے۔ میں نے اُسے سٹوڈیو کے اندر پاؤں رکھنے سے منع کر رکھا ہے۔ یہاں لکشمی کی آرتی اتاری جاتی ہے۔ ایسا دیا دھن! انہیں ہونے دوں گا۔ تم بھی ایک گرہ باندھ لو۔ جب تک شار نہیں بن جاتیں کسی دوسرے پروڈیوسر سے بات نہ کرو۔ جب اسٹوڈیو آؤ تو ٹھیک طرح سے چست کپڑے پہنکر آؤ۔ ورنہ لوگوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ تم کیا ہو۔؟ اب تم اپنی طرف دیکھو۔ دیکھو ذرا — اگر کسی ڈریس میکر کو کنسلٹ کیا ہوتا تو آپ یہ چولی کبھی نہ پہنتیں جواب پہنکر آئی ہیں۔ ارے! لڑکیوں کو اتنی تو سمجھ چاہیئے۔ پنجابی چھوکریاں تو چولی پہننے میں بہت ہوشیار ہیں۔ تم ...... تم نہ معلوم کیسی پنجابی لڑکی ہو۔ اگر تم اس چولی کی بجائے میڈن فارم پہنکر آتیں تو تمہاری شکل وصورت میں کتنا فرق ہوتا — ان چیزوں کی طرف دھیان دینا ہی پڑتا ہے۔ سودا بیچنے والے دوکاندار کو چلانا ہی پڑتا ہے۔ ہر پھیری والے کو اپنے مال کی ڈھنڈوری پیٹنا پڑتی ہے۔ یہ فلم مارکیٹ ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنے گن گاتا ہے۔ پبلسٹی کرتا ہے۔ سطرح کے اسٹنٹ رچتا ہے تب کہیں جاکر کوئی نوٹس لیتا ہے۔ تمہارے جسم کو تمہارے ہاتھوں باہوں۔ اور انگلیوں کو چیخ چیخ کر پکارنا پڑتا ہے نہیں تو اس اندھیر نگری میں کون کسی کی سنتا ہے — ؟

لیلا (عاجز آکر) تو پھر کب آؤں؟

لالو بھائی:- خوب۔ خوب۔ یہ بھی آپنے خوب کہی۔ اجی۔ یہ آپ کا گھر ہے جب مرضی چاہے۔ آیئے۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے ٹیلی فون کر دیجئے۔ بعض وقت میں یہاں نہیں ہوتا۔ آپ نوکٹ میں لکھ لے کہ آئیگی کہاں دادر کہاں اندھیری — دس میل کا چکر پڑ جائیگا۔ میرا ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیجئے۔ ۱۶ اور ۲۰ لم۔ ۱۶ اندھیری کا نمبر ہے۔ اس میں لم، لم اور جمع کر لیجئے۔

لیلا۔ لیکن میرا کانٹریکٹ کیا ہوا؟ آپنے کہا تھا سنیچر وار کو کانٹریکٹ ہوگا۔ دو سنیچر گزر چکے۔ میں تین بار آچکی ہوں —

لالو بھائی:- یہ پھر آپ کانٹریکٹ کی بات کیلئے بیٹھیں۔ کیا آپ کو زبان پر اعتبار نہیں۔

لیلا:- اعتبار تو ہے لیکن پھر بھی پتہ لگنا چاہیئے کہ کانٹریکٹ کب ہوگا۔

لالو بھائی:- ہوا ہوا بہت تو ہو کہ کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ روپے

لے جائیے کتنے چاہئیں — ؟ — ارے منیم جی! ہاں یاد آیا۔
منیم جی تو "بے سہارا" کا سیٹ لگوانے گئے ہوئے ہیں۔

لیلا:- نہیں مجھے روپے نہیں چاہئیں۔ آپ صرف کانٹریکٹ کی تاریخ بتا دیں۔

لالو بھائی:- (ہنس کر) بہت بھولی ہو۔ میں تو بھلا تمہیں جانتا ہوں۔ مجھے
ایسی باتیں کرنے میں کوئی ہرج نہیں ....

.... لیکن کسی دوسرے پروڈیوسر سے ایسی باتیں نہ کرنا۔
کانٹریکٹ کے لئے کبھی اتنی بے چینی ظاہر نہ کرنا۔ یہاں کے پروڈیوسر ایک ہی گھاگ
ہیں۔ جھٹ تاڑ جاتے ہیں کہ لڑکی کو کانٹریکٹ کی ضرورت ہے۔ جہاں پروڈیوسر
کے کان میں یہ بھنک پڑی کہ لڑکی ضرورت مند ہے اسی وقت اس کے دام ایک
چوتھائی رہ جاتے ہیں۔ مارکیٹ میں بیچنے والے کو کبھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہئے۔
کہ اسے اپنی چیز کے دام کھرے کرنے کی فکر ہے۔ ہر بڑا اسٹاکسٹ یا تھوک بیوپاری
کاروبار کی یہ گھنڈی جانتا ہے۔ اب میں تمہیں کہاں کہاں سمجھاتا پھروں۔ تم تو بالکل
اناڑی ہو۔ ہمیشہ یہ ظاہر کرو کہ تمہیں کانٹریکٹ کی بالکل پرواہ نہیں۔ پھر دیکھو میں
کانٹریکٹ تمہارے آگے پیچھے گھومیں گے۔ میں یہ بات ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں
— جب میں نے "جنگل کی پری" بنائی۔ چار لاکھ لاگت آئی۔ کل روپیہ خرچ
ہو گیا۔ ان دنوں کا چار لاکھ روپیہ آجکل کے پچیس لاکھ کے برابر ہے۔ مجھے
فلم بیچنے کی سخت ضرورت تھی۔ بینک میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ لیکن میں کسی ڈسٹری
بیوٹر کے سامنے گڑگڑایا نہیں۔ کسی کو اپنی پوزیشن کا پتہ ہی نہ چلنے دیا۔ سب پر
یہی ظاہر کیا کہ مجھے روپیہ کی کیا کمی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فلم دگنی داموں بکی۔ اس
ایک فلم میں جانتی ہو مجھے کتنا فائدہ ہوا۔؟ تین لاکھ — اگر تم کانٹریکٹ کیلئے
بہت بے چین ہو تو — اگلے اتوار میں مہورت نکلواؤں گا۔ کانٹریکٹ فلم کے پہلے
سین کے بعد آپ سے ہو گا۔ لیکن پہلے فلم کا نام طے ہو گا۔ فلم کا نام ڈنکا سوچا ہے۔
پچھلے دنوں میں نے ایک اسٹوری لکھنے والے سے ڈنکا پر کہانی لکھنے کے لئے کہا۔
کیا نام ہے۔ ڈنکا۔ یعنی ڈنکا پٹ جائیگا۔ دھوم مچ جائیگی۔ خوب چلیگا ڈنکا۔
جانتی ہو اس لکھنے والے نے کیا جواب دیا۔؟ کہنے لگا "سیٹھ صاحب "ڈنکا"
نہیں لکھ سکتا۔ اگر حکم دیں تو ڈنکی لکھ دوں۔" آہہ — ڈنکی۔ یعنی گدھا!
وہ مجھے گدھا سمجھتا تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا — ہاں پہلے فلم کے
نام کا مہورت ہو گا۔ اس کے بعد آپ کے نام کا — نام بہت کچھ منحصر ہے۔ فلم اسٹار
کا کوئی نام بھی ہوتا ہے۔ کوئی نہیں۔ ریس کے گھوڑے کی طرح — میں
نے دو سال ریس کے گھوڑے بھی دوڑائے ہیں — بیس ہزار میں جہانگیر خریدا۔
دلی اور میرٹھ کی ریسوں میں اول رہا تھا۔ تیز بھاگنے والا۔ سوار کو فوراً لے

اڑے۔ لیکن لیلا جی! بمبئی میں جہانگیر نام نہیں چلا۔ میں نے لاکھ جتن کئے
ہر بار اس گھوڑے میں کوئی نہ کوئی خرابی ہو جاتی۔ ایک ریس بھی نہ جیت پایا۔
آخر مہورت نکلوایا۔ نام نکلا سرپٹ — میں نے سرپٹ نام رکھ کر دوڑایا پھر
کیا تھا۔ ایک ہی سیزن میں دس ریس جیتا۔ دھوم مچ گئی۔ آخر میں نے اسے
پچاس ہزار میں فروخت کر دیا۔ گھوڑے کو اسی وقت بیچ دینا چاہئے جب وہ
عین عروج پر ہو۔ فلم اسٹار اور ریس کے گھوڑے میں بہت زیادہ فرق نہیں دونوں
کی عمر چار پانچ سال ہوتی ہے۔ ریس کے گھوڑے کی کامیابی جوکی کے ہاتھ میں ہے
اور اسٹار کی کامیابی ڈائریکٹر کے ہاتھ دونوں کی قسمت بھی نام پر منحصر ہے —
فلم کا مہورت نکلنے پر آپ کے نام کا مہورت نکلواؤں گا۔ آپ کا نام
لیلا نہیں چلیگا۔ لیلا ڈیسائی۔ لیلا چٹنس پہلے سے موجود ہیں۔ نام بھی کوئی
نیا تلاش کرنا پڑے گا — اس کے بعد جس روز چاہو۔ آ جاؤ۔ اور آ کر کانٹریکٹ
کر جاؤ۔ لیکن .... ہی۔ ہی۔ ہی! تمہیں کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ ارے
شرماتی کیوں ہو۔؟ کہ دو نا کچھ روپے چاہئیں۔ ہاں بولو۔ کتنے چاہئیں۔ بولو گی
— یہ لو — سو روپیہ لے جاؤ۔ بھگوان کی قسم مجھے تمہاری یہ سادگی بہت
پسند ہے۔ میں ان پروڈیوسروں میں سے نہیں ہوں جو تمہاری مجبوری
سے فائدہ اٹھائیں گے۔ مجھے تو محض باتیں کرنے کا شوق۔ میرے من میں
کوئی پاپ نہیں۔ من کا صاف ہوں۔ جہانگیر کا پجاری ہوں۔ سنگوٹ کا پکا ہوں
لیکن مجھے اچھی کلا اور سندر دستو بھلی لگتی ہے۔ اس لئے — ارے تم تو جا
رہی ہو۔ اچھا یہ لو۔ سو روپیہ! پکڑو بھی — لو — اور اگر زیادہ ضرورت ہو تو
— (اس کا ہاتھ تھام کر) جہانگیر کی قسم! تمہیں اسٹار بنا کر نکالے گا میرا چمتکار۔ لالو
بھائی کا وار کبھی خالی نہیں جاتا۔ ارے لیلا جی — (اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر)
میں نے ایسا مکھڑا "آج تک نہیں دیکھا۔

(یکدم لیلا اپنا ہاتھ چھڑاتی ہے) نوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سیٹھ
کے منہ پر دے مارتی ہے چلی جاتی ہے۔
لالو بھائی دیکھتا رہ جاتا ہے۔

گونڈہ

۱۱ دسمبر ۵۳ء

مخلصی و محبی واثق صاحب! سلام و اشتیاق۔ مجھے یقین ہے کہ میرے احباب مجھ پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ آپ کو بھی اپنا جوان العمر اور عزیز دوست سمجھتا ہوں۔

اس وقت فرصت بہت کم ہے۔ مختصراً صرف چند جملے حاضر کرتا ہوں۔ گونڈہ پہنچتے ہی سخت علیل ہو گیا۔ وزن صرف ایک سو پونڈ رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ چار پھوڑے۔ اٹھنے بیٹھنے تک سے بڑی حد تک معذور۔ ان حالات میں دل و دماغ یکسر غیر حاضر، فکر پریشاں اور کچھ بھی آپ کے لئے سب سے پہلے اپنے افکار پیش کرتا۔ اس زمانے میں غالباً ادھر سے کچھ نہیں کہا۔ صرف زمانۂ حج کے موقع پر چند خاص حالات سے متاثر ہو کر غیر متوقع طور پر دو شعر ہو گئے۔ محض اس خیال سے کہ خالی ہاتھ آپ کی جانب کیا بڑھیں۔ وہ دونوں شعر حاضر ہیں۔

ایک مطلع ایک شعر۔ دونوں اشعار تلمیح رکھتے ہیں۔

واعظ نہ کہیں ہو طاق حساب و کتاب میں — گذری ہے ساری عمر عذاب و ثواب میں

زن زر زمیں کے ہو رحمن کی مار — تو ڑا کے دلوں کو جھلک نور رب میں

میں ۱۳ کو دہلی پہنچ رہا ہوں۔ تب آپ سے ملاقاتیں رہیں گی۔

جگر

فراقؔ گورکھپوری

○

پیاس ایسوں کی کس طرح کم ہو　　جن کو آبِ حیات بھی سم ہو!

حسنِ نظارہ سوز دیکھ سکوں!　　روشنیٔ جمال مدھم ہو!

جیسے فرطِ نشاط میں آنسو　　شوقِ پنہاں میں یوں ترا غم ہو

دلِ شاعر میں یوں ہی تیرا خیال　　ایک آہو جو مائلِ رم ہو!!

کوئی تجھ سا نہیں دو عالم میں　　اک ذرا اور غیریت کم ہو

بزم میں رہے وہ عالمِ حسن!　　ہوش کم کم ہو نشہ کم کم ہو!

آؤ کچھ دیر آج اداس رہیں　　آج کچھ دیر دل کا ماتم ہو!

اس سے ہم دوستی بڑھاتے ہیں　　جس سے امیدِ دوستی کم ہو

سوچتا ہوں ترے علاوہ بھی　　کوئی مونس ہو کوئی ہمدم ہو

اس میں ہے کائنات کو خطرہ　　پرتوِ حسن اک ذرا کم ہو

سوچتا ہوں کہ اس ستمگر سے　　دوستی ختم ہو کہ کچھ کم ہو

کاش اے غم کچھ اور دل کی زمین!　　اور بنیادِ عشق محکم ہو!!!

معجزہ ہے کہ نازِ جاناں نہ!　　ہو زیادہ یہ جس قدر کم ہو

ٹوٹنے کا نہ خوف ہو جس کے　　کوئی ایسا بھی عہد باہم ہو

پھر سے ترتیب دیں زمانے کو　　اے غمِ زندگی منظم ہو

مسکراہٹ تو ہے وہی جس میں　　سوزِ شعلہ ہو سازِ شبنم ہو!

اس سے کیفیتِ حیات کہیں　　اس نگہ سا جو کوئی محرم ہو

کیا ہو اس بیکراں شبستاں میں　　داستانِ گناہِ آدم ہو!

اٹھ گیا آج عشق دنیا سے　　پرچمِ حسن اک ذرا خم ہو

عشق میں اس طرح بھی ہوتا ہے　　شبِ فرقت ہو درد بھی کم ہو

دل جو مارا گیا فراقؔ تو کیا
زندگی بھر اسی کا ماتم ہو!!

قتیل شفائی

○

چمن کا رنگ، صبا کا سرور بیچ دیا
کسی نے موسمِ گل کا غرور بیچ دیا

سکوتِ شب میں ستارے تو جھلملاتے تھے
سحر نے آ کے چراغوں کا نور بیچ دیا

ہمارے پاس ہیں راہیں عروجِ آدم کی
بس ایک فاصلہ ہم نے ضرور بیچ دیا

غمِ وفا سے کچھ آنسو خریدنے تھے ہمیں
تمہارے ہاتھ دلِ ناصبور بیچ دیا

پڑی ہیں پاؤں میں کچھ بے صدا سی زنجیریں
جب اہلِ شوق نے اپنا شعور بیچ دیا

ہمیں بھی یوسفِ دوراں کہے گی اب دنیا
ہمیں بھی آپ نے کنعاں سے دور بیچ دیا

سلام مچھلی شہری

○

پو پھوٹ چکی ہے، مہرِ درخشاں کی دیر ہے
تکمیلِ داستاں میں اب عنواں کی دیر ہے

ہاں سج چکی ہے یوں تو عروسِ حیاتِ نو
ماتھے پہ جگمگاتی سی افشاں کی دیر ہے

ہم تو سجا چکے ہیں گلستانِ آرزو!
اب آمدِ نسیمِ بہاراں کی دیر ہے

تکمیل پا چکے ہیں ترانے بہار کے
بس صرف یادِ خونِ شہیداں کی دیر ہے

جلدی میں ہم سمجھ نہ سکے جن کو ہم سفر
ان کی دعائے رُوحِ گل افشاں کی دیر ہے

یک قول و یک زباں ہے ہمارا یہ کارواں
خود رہبروں کے ایک سے پیماں کی دیر ہے

آگے بڑھو کہ سرحدِ منزل پہ اے سلام
شعلہ بہ شکر ایک غزل خواں کی دیر ہے

عبدالمجید سالک

○

خروشِ بزمِ شرابِ مغانہ یاد کرو
کرشمہ ہائے نگارِ شبانہ یاد کرو
کسی کے ولولۂ عاشقی کا چھیڑو ذکر
کسی کا طنطنۂ دلبرانہ یاد کرو
رقیب کی نگہِ مجسس نظر سے پوشیدہ
وہ یار کی نگہ مجرمانہ یاد کرو
وہ جس پہ جھک گئی ہر سرفراز کی گردن
وہ پیرِ میکدہ کا آستانہ یاد کرو
حکایتِ غمِ دوراں سے گر ملے فرصت
تو یادِ یار کا رنگیں فسانہ یاد کرو
خزاں کا دور ہے اب اے مہاجرینِ بہار
ہجومِ لالہ و گل کا زمانہ یاد کرو
قفس میں کلفتِ دوری کا ہے علاج یہی
کہ قصۂ چمن و آشیانہ یاد کرو
مغنیو! وہ سرودِ سخن کے خواہاں ہیں
کوئی مری غزلِ عاشقانہ یاد کرو
بجا کہ سالک خود دار ملتجی نہ ہوا
کبھی تو تم بھی اسے مخلصانہ یاد کرو

وامق جونپوری

○

اپنی ویرانی کا شکوہ نہ کریں میخانے
کہ بدلنے کو ہیں اب زندگی کے پیمانے
قید تو دونوں ہوئے فرق مگر اتنا ہے
صحنِ زنداں انھیں اور ہم کو ملے ویرانے
چند روز اور سلاسل کی یہ جھنکار سہی
چپ سے کچھ آج نظر آرہے ہیں دیوانے
جبر پرویز سے رکتا نہیں کارِ مزدور
سر کو فانوس سے ٹکرا رہے ہیں پروانے
لئے پھرتا ہو جو امیدوں کی میّت وہ جلوس
چلتی پھرتی ہوئی لاشوں کو بھلا کیا جانے

فارغ بخاری

○

ہزار بادِ مخالف کا دور چلتا ہے
مرا چراغ سرِ رہگذار جلتا ہے

طلوع ہوتی ہے واں سے مرے خلوص کی صبح
تری ہوس کا جہاں ماہتاب ڈھلتا ہے

وہ ڈوب جاتا ہے جا کر سکوتِ ساحل میں
کوئی سفینہ جو طوفاں سے بچ نکلتا ہے

اب اس مقام پہ ہم کو جنون نے لا ڈالا
جہاں حوادثِ دوراں کا دل دہلتا ہے

تمام عمر وہ فارغ بھٹک نہیں سکتا
جو دو قدم بھی مرے ہمرکاب چلتا ہے

رضا ہمدانی

○

اب جلوۂ عام بھی نہیں ہے
حسنِ لبِ بام بھی نہیں ہے

دورِ مئے و جام کا تو کیا ذکر
ذکرِ مئے و جام بھی نہیں ہے

قحطِ غمِ عشق توبہ توبہ
لب پر ترا نام بھی نہیں ہے

کیوں دیدِ جمال پر ہے قدغن
یہ مئے تو حرام بھی نہیں ہے

کس آس پہ زندگی گزاریں
اڑتا سا پیام بھی نہیں ہے

پھر بھی ہے حیات کتنی دلکش
گو اس کو دوام بھی نہیں ہے

اختر انصاری اکبرآبادی

○

نظامِ غم بدلنا چاہتا ہے
لہو دل کا ابلنا چاہتا ہے
سنبھلنا، ٹھوکریں کھانے سے پہلے
زمانہ چال چلنا چاہتا ہے
ذرا ہٹنا ادھر سے موجِ ساحل
سفینہ رُخ بدلنا چاہتا ہے
خیالِ دوریٔ منزل سے بچ کر
مسافر پھر سنبھلنا چاہتا ہے
سہارا دو کہ دیوانہ تمہارا
زمانے کو بدلنا چاہتا ہے
فریبِ ہوش ہے اختر بہاراں
جنوں کانٹوں پہ چلنا چاہتا ہے

منیب الرحمٰن

○

اپنے ویران نشیمن کو ذرا یاد کرو !
کیا گوارا ہے تمہیں خدمتِ صیّاد کرو
تابکے شکوۂ بے مہریٔ اربابِ قضا !
دہنِ تشنۂ شمشیر سے فریاد کرو
چمنِ سوختہ ساماں سے کہو قصۂ گل
اے اسیرانِ قفس، عہدِ وفا یاد کرو
لو گدائے درِ میخانہ سے تعلیمِ جنوں،
عشق میں پیرویٔ مسلکِ فرہاد کرو۔
وطنِ خانماں برباد کی تصویر ہے دل
آؤ، اس اجڑی ہوئی بستی کو آباد کرو
جب عنایاتِ مسلسل سے میں اکتا جاؤں
بہرِ تجدیدِ محبت ستم ایجاد کرو
پردہ در پردہ حجابوں میں رہیں گے کب تک
توڑ دو قیدِ کہن، نغموں کو آزاد کرو

سلیمان اریب

○

جب تلک دار و رسن سے نہ شناسائی ہو
کوئی اس قامت و گیسو کا نہ سودائی ہو
ایک نو خیز خلش ایک نو آغاز طلب
جانے کس کوچہ و بازار میں رسوائی ہو
سوئے محفل کوئی آتا ہو تمنا بن کر
جو نہ ہو اہلِ نظر وہ نہ تماشائی ہو
مسکراتے ہوئے آنسو بھی نکل آتے ہیں
دیکھ اے ضبط کہیں آنکھ نہ بھر آئی ہو
آج وہ ہند کا شہری نہیں کہلا سکتا
جس نے اک بار نہ زنداں کی ہوا کھائی ہو

○

دزدیدہ اک نگاہ کی خواہش ضرور ہو
کم کم سہی نگاہ کی خواہش ضرور ہو
تیری خوشی سے بجھ نہ سکی اس کا غم نہ کر
غم سے ترے پناہ کی خواہش ضرور ہو
انجامِ رسم و راہ اگرچہ ہو سامنے
پھر تجھ سے رسم و راہ کی خواہش ضرور ہو
پیہم نوازشیں بھی محبت نہیں مگر!
الطافِ گاہ گاہ کی خواہش ضرور ہو
اب دیکھئے ہم اس کو بھلا سہہ سکیں گے بھی
اک دردِ بے پناہ کی خواہش ضرور ہو
پہلے زمیں کے حسن سے جی چھک تو لے اریب
پھر دیدۂ مہر و ماہ کی خواہش ضرور ہو!

سردار الہام

○

حیات کی منزلیں ہیں روشن، چراغ راہوں میں جل رہے ہیں
بہ فیضِ ذوقِ یقیں سدا ہم، رہینِ سعی و عمل رہے ہیں
اٹھو اسیرانِ زر پرستی، مٹا کے آئینِ کیف و مستی
بدل رہا ہے نظامِ ہستی، ہزار طوفاں مچل رہے ہیں
بڑھے اجالے، مٹے اندھیرے، کھلے ہیں پھر امن کے پھریرے
خوشا اے گیتی کہ دور افتادگانِ منزل سنبھل رہے ہیں
نظر نظر طور جگمگائے، قدم قدم منزلیں تھیں لیکن
بہ عزمِ تکمیل ہم ازل سے رہِ تمنا پہ چل رہے ہیں
سلگ رہے ہیں دلِ شکستہ میں بیتی یادوں کے چند شعلے
ہیں خود فریبی کے سو بہانے، جو آرزو بن کے پل رہے ہیں
رکے جو منزل سمجھ کے اے دل، تو کھا گئے پھر فریبِ منزل
فسانۂ غم وہی ہے لیکن، ہنوز عنواں بدل رہے ہیں
حیات کی تلخیاں گھٹا دیں، عمل کو رنگینیاں عطا کیں
انہی دنوں کی لطافتوں نے جو زیست کا ماحصل رہے ہیں

محشر بدایونی

غم کے بندھن کم تو نہیں ہیں
سب غم تیرے غم تو نہیں ہیں
کون ہے اس محفل کی رونق
ہم کیا جانیں ہم تو نہیں ہیں
سب سے کیوں امیدِ کرم ہو
درد کے سب محرم تو نہیں ہیں
آگ نہ کیوں بھڑکائیں آنسو
شعلے ہیں شبنم تو نہیں ہیں
میں بھی پریشاں دل بھی پریشاں
وہ گیسو یہ ہم تو نہیں ہیں
دیکھا اے ضبطِ غمِ ہجراں
وہ آنکھیں پُر نم تو نہیں ہیں
تیرے غمِ جانکاہ میں خوش ہوں
دنیا بھر کے غم تو نہیں ہیں
یہ رنگین شفق یہ بہاریں
خونِ دلِ آدم تو نہیں ہیں

احتشام آذری

قریب ہے کہ محبت وہ دن بھی لے آئے
فضا کے دوش پہ آنچل خوشی کا لہرائے
نئے خیال کے انساں کا عزم دیکھ ندیم!
قریب ہے کہ زمیں آسماں پہ چھا جائے
سمٹ سمٹ گئی یوں سلطنت اندھیروں کی
چراغ فکر جلا، راستے نکھر آئے
جہاں سے ہو کے عروسِ حیات گذرے گی
کھڑا ہوں میں اسی رستے پہ پھول بکھرائے
میں دیکھتا ہوں نئی زندگی کی دوشیزہ
اس انتظار میں ہے کب سہاگ رات آئے
شرارتاً بھی کسی نے جوان کا نام لیا
تو روکنے پہ بھی آنسو مرے نکل آئے
رہِ طلب میں کسی کا کوئی رقیب نہیں
یہ بات کون ترے عاشقوں کو سمجھائے

متین سروش

○

لذتِ ہستی حرام دیکھئے کب تک رہے
دورِ جفا شادکام دیکھئے کب تک رہے

غارتِ تہذیب سے بزمِ جہاں خوں چکاں
غارتِ تہذیبِ عام دیکھئے کب تک رہے

نوعِ بشر دادخواں دل کی جراحت کی ہے
خون سے لبریز جام دیکھئے کب تک رہے

سر سے کفن باندھ کر ظلم کے مارے اٹھے
دار و رسن کا نظام دیکھئے کب تک رہے

اہلِ جنوں سر بکف جانبِ منزل رواں
ذوقِ سفر تشنہ کام دیکھئے کب تک رہے

زورِ خودی کی خبر، عام اسیروں میں ہے
سطوتِ شاہی کا دام دیکھئے کب تک رہے

عظمتِ مشرق کے گیت، صبح کے ہونٹوں پہ ہیں
ظلمتِ مغرب کی شام دیکھئے کب تک رہے

شعلہ فشاں ہو گئے بربط و چنگ و رباب
نغمۂ جاں ناتمام دیکھئے کب تک رہے

اک نئے سورج کی ضو، رات کے باطن میں ہے
جلوۂ ماہِ تمام دیکھئے کب تک رہے

فاصلۂ چند گام منزلِ مقصد سے ہے
فاصلۂ چند گام دیکھئے کب تک رہے

بادِ بہاری کی دھوم دشت و بیاباں میں ہے
فصلِ خزاں کا خرام دیکھئے کب تک رہے

نورِ یقیں ہے سروش زندگی کا راہبر
گمرہی کا انتظام دیکھئے کب تک رہے

شاہدہ

زہرا نگاہ

○

میکدہ آتش بجام دیکھئے کب تک رہے
مجھ پر تقاضا حرام دیکھئے کب تک ہے

تیرا ستم ہم پہ عام دیکھئے کب تک رہے
گردش دوراں پہ نام دیکھئے کب تک ہے

اہل خرد سست پا اہل جنوں تیز گام
شوق کا یہ انتظام دیکھئے کب تک ہے

چھا گئیں تاریکیاں کھو گیا حسن نظر
وعدۂ دیدار عام دیکھئے کب تک ہے

آ گئی منزل قریب رک گئے اہل نظر
ذوق طلب تشنہ کام دیکھئے کب تک ہے

صبح کے سورج کی ضو دیکھئے کب تک نہ آئے
دہر پہ یہ رنگ شام دیکھئے کب تک ہے

○

یہ کیا ستم ہے کوئی رنگ و بو نہ پہچانے
بہار میں بھی رہے بند تیرے مے خانے

فنا کے زمزمے رنج و محن کے افسانے
یہی ملے ہیں نئی زندگی کے نذرانے

جو سن سکو تو یہ سب داستاں تمہاری ہے
ہزار بار جتایا مگر نہیں مانے

خزاں کا ذکر ہی کیا چھوڑیے اسے ساقی
بہار میں بھی ترستے ہیں تیرے دیوانے

جو کر گئے ہیں جدا ایک ایک سے ہم کو !
دیار غرب سے آئے تھے چند بیگانے

یہ کیا ستم ہے کہ پیر مغاں وہی ہے ابھی
نئی ہے بزم نئی مے نئے ہیں میخانے

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

جمیل ملک

○

شب کی پر ہول ظلمتوں سے نہ ڈر
آنے والی سحر پہ ایک نظر

جتنی نزدیک آ رہی ہے سحر
شب کے سینے میں پڑ رہے ہیں بھنور

دے رہے ہیں پیامِ عیدِ طرب
مہر بر لب نہیں یہ شام و سحر

انتہا خوب ہو تو بات بھی ہے
کٹ تو جاتا ہے زندگی کا سفر

بے رخی ہم وفا شعاروں سے
نگہِ زیست کچھ خیال تو کر

ماورا تجسم کی بات رہنے دو !
حسنِ انساں ہے اپنے پیشِ نظر

ہم پہ اٹھتی ہیں انگلیاں کتنی !
لب پہ آتی ہے کوئی بات اگر

تشنگی دل کی بجھ نہ جائے کہیں
اے نگارِ چمن کچھ اور سنور !

عظمتِ گل تو غیر فانی ہے
پیکرِ گل ہے بے ثبات اگر

جب تک آنکھوں میں نور باقی ہے
گل نہ ہوں گے جمیل شمس و قمر

جگن ناتھ آزاد

○

شوقِ دار و رسن کی بات نہ پوچھ
اب مرے دل کے واردات نہ پوچھ

بن چکی ہے حیات خود مقصد
اب مرا مقصدِ حیات نہ پوچھ

برق و صیاد کا یہ موسم ہے
موسمِ گل کے حادثات نہ پوچھ

غمِ دوراں میں جو اسیر ہوئے
کب ملے گی انھیں نجات نہ پوچھ

ذات کو میں صفات کہتا ہوں
مجھ سے فرقِ صفات و ذات نہ پوچھ

میری منزل ہے جادۂ منزل
میری منزل مری حیات نہ پوچھ

کتنی شمعیں جلیں گی اس کے لئے
ختم کب ہوگی غم کی رات نہ پوچھ

اس پہ بے التفاتیاں قرباں!
دوست کا رنگِ التفات نہ پوچھ

ذکرِ عصرِ جدید سن مجھ سے
مجھ سے عہدِ کہن کی بات نہ پوچھ

جو وطن میں بھی بے وطن ہی رہا
اس غریب الوطن کی بات نہ پوچھ

میرے اشعار ہی کو دیکھ آزاد
مجھ سے شرحِ غمِ حیات نہ پوچھ

کنول پرشاد کنول

○

منظرِ مِن بجلی نفس میں طوفاں یہ حال کیسا ہے بندگی کا
بڑھے جو یہ روگ اور کچھ تو خدا ہی حافظ ہے خواجگی کا

ستم سہے ہیں ہزار لیکن یہ انتہا ہے ستم نہ پوچھو
کہ ذکر کرنا بھی جرم ہے اب چمن میں پھولوں کی دوستی کا

گلے لگایا تھا گل سمجھ کر تو خار کی طرح چھید ڈالا
کچل دیا دل ہی بن کے دلبر عجب ہے یہ ڈھنگ دلبری کا

ہے آج یہ مفلسی کا عالم کہ آنکھ میں اشک تک نہیں ہے
نہ پوچھ یہ راز کج کلاہی بھرم نہ کھل جائے زندگی کا

یہ کیسا جشنِ چراغ ساقی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھی نہ سوجھے
نظر کا میری قصور ہے یا بدل گیا رنگ روشنی کا

منظر سلیم

○

دماغ و دل کی یہ تلخی یہ تشنگی کب تک
بسر کریں گے ہم اس طرح زندگی کب تک

جلا جلا کے ہر اک آرزو کے خوں سے چراغ
کریں گے غم کدۂ دل میں روشنی کب تک

کچل کے سینۂ بے تاب کی امنگوں کو
نبھائے جائیں گے ہم رسم عاشقی کب تک

بکیں گے کب تک اسی طرح ماہ و سال اپنے
ملے گی فرصتِ تخلیقِ شاعری کب تک

ہے کتنی دور ابھی قافلے سے منزل شوق
پھریں گے دشت و بیاباں میں ہم ابھی کب تک

ہوائیں دیتی ہیں پیغام جن بہاروں کا
نثار ان پہ دل و جاں وہ آئیں گی کب تک

اٹھائیں گے ہم ابھی اور کتنے غم منظر
نصیب ہوگی مسرت کی زندگی کب تک

ابو محمد سحر

○

حاصلِ ہستی ان کا سات
آج کا دن اور آج کی رات
دل کے کھیل انوکھے تھے
جیتے ہیں ہم کھا کر مات
جینا ہو یا مرنا ہو — !!
تجھ بن ایک ادھوری بات
عرضِ تمنا سہل نہیں
کھلتے کھلتے کھلے گی بات
غم میں تجھے بھی بھول گئے
گذرے یوں بھی کچھ لمحات
سب سے اعلیٰ سب سے افضل
عشق کا مسلک عشق کی ذات
جہد و عمل کی بات ہے اب
صاف کھلی ہے راہِ نجات
جینا تنہائی کا نام !
دکھ نے دیا تو پھر بھی سات
میری غزل کا رنگ سحر
خونِ جگر کی ہے سوغات

پیکر ابوالکاظم

○

ترا وعدہ کیا یہی تھا کہ جو آج ہے قرینہ
کوئی تشنگی سے بےجاں کسی ہاتھ میں ہو مینا
ابھی ہونٹ ہل رہے ہیں ابھی نبضیں چل رہی ہیں
ابھی کیسے میں یہ کہہ دوں مجھے آ گیا ہے جینا
ہو وہ اشکِ غم یا صہبا کہ ہو زہر ہی کا پیالہ
مرا دل یہ کہہ رہا ہے مجھے کچھ یہاں ہے جینا
جو صدف میں ہو وہ گوہر جو مژہ پہ ہو وہ آنسو
جو مشقتوں میں ٹپکے اسے کہتے ہیں پسینہ
یہ عجیب ناخدا ہے جو مجھی سے پوچھتا ہے
کہ یہ مد و جزر کیسا کہاں آ گیا سفینہ
یہ جنوں نہیں ہے پیکر جو ہے تار تار دامن
اسے اور کیا میسر جسے چاکِ گل ہو سینا

محمد علی تاج

○

خطِ حیات سے ہٹ کر ہر ایک نقش گری
نہیں وہ نقش گری ماسوائے دردسری

تمہاری بزم سے باہر بھی ایک دنیا ہے
مرے حضور بڑا جرم ہے یہ بے خبری

میں اپنے غم کا مداوا تو خود ہی کر لوں گا
مبارک آپ کو اپنا غرورِ چارہ گری

ہم آج مشعلِ خورشید لیکے نکلے ہیں:
ہمیں قبول نہیں جگنوؤں کی راہبری

کیف بھوپالی

○

باش اے ساقی کہ تیری انجمن خطرے میں ہے
ساز سے شعلہ اٹھا، سازِ کہن خطرے میں ہے

کل تلک منصور تھا، دار و رسن کے سامنے
جس جگہ ہم ہیں وہاں دار و رسن خطرے میں ہے

کارواں بڑھنے لگا، دیر و حرم کو چھوڑ کر
شیخ ماتم کر رہا ہے، برہمن خطرے میں ہے

حمید الماس

○

غنچوں کے دریدہ سینوں سے تنظیم گلستاں کرتا ہوں
صیاد سے پھر یہ کہہ دے کوئی بلبل کو غزل خواں کرتا ہوں

میں عشق ہوں میرا سوز نیا میں عشق ہوں میرا ساز نیا
طوفان کو ساحل کرتا ہوں، ساحل کو طوفاں کرتا ہوں

تو ساز اٹھا میں جام بھروں اور حسن سے کہہ دے رقص کرے
اس شام خزاں کو اے ساقی میں صبح بہاراں کرتا ہوں

اس عشق پہ بجلی ٹوٹ پڑے یہ عشق بھی کتنا ظالم ہے!
میں خود بھی پریشاں رہتا ہوں تم کو بھی پریشاں کرتا ہوں

بلبل سے کہو مایوس نہ ہو پھولوں سے کہو آہیں نہ بھریں
میں اپنے لہو سے بھی اکثر تزئینِ گلستاں کرتا ہوں

جب رات کی ظلمت ہنستی ہے جب دن کا اجالا سوتا ہے
اس وقت کسی کے عارض پر میں زلف پریشاں کرتا ہوں

الماس کوئی کہہ دے جا کر اس رشکِ گلستاں سے اتنا
آ دیکھ جدائی میں تیری اشکوں سے چراغاں کرتا ہوں

زاہد رضوی

○

رات یوں دل کی ویرانیوں کے قریں تیری یادوں نے جشنِ بہاراں کئے
مقبرے کی منڈیروں پہ جیسے کوئی تیرگی میں جلاتا رہا ہو دیے

بھینی بھینی ہوا بھیگی بھیگی فضا، نقرئی بادلوں کے سفینے لئے
خامشی سے مری جانے کیا کہہ گئی رات بھر ساغرِ ناب چھلکا گئے

گرمیٔ بزمِ حسنِ جواں رہ گئی، عظمتِ سادگیٔ بتاں رہ گئی
بات جانے پہنچی کہاں سے کہاں تم نے اچھا کیا میرے لب سی دیے

ان دنوں میری دنیا میں کوئی نہیں ایک پل کے لئے راحتیں بخش دے
بارہا ساقیا، انجمن میں تری بن کے جھوما کیا دیر تک بے پیے

دل گیا جذبۂ عاشقی بھی گیا، خواہشِ لذتِ ننگِ در بھی گئی
دورِ حاضر نے وہ غم دیا ہے مجھے جس نے الفت کے سارے نشاں دھو دیے

یہ الم یہ ستم راستے پرخطر، راہرو تیرا ثابت رہے ہر قدم!
وقت کی باگ ہاتھوں میں ان کے رہی تیز دھاروں کی آغوش میں جو جیے

ظ انصاری

نیا سال نئے سوال

پچھلے کئی سال اُردو ادب میں اُکتا دینے والی یکسانیت کے گذرے ہیں ۔ اور وہ بات جو ۱۹۴۸ء کے بعد سے خاص طور پر محسوس کی جا رہی تھی، اندر ہی اندر پک رہی تھی پھوٹ کر سامنے بھی آئی ہے اور ہر طرف سے صدا بلند ہوئی ہے کہ اُردو ادب میں جمود ہے، بحران ہے، شخصیت پرستی ہے اور بلند بانگ نعروں کے باوجود ایک اداسی کی سی فضا پائی جاتی ہے ۔

ان باتوں میں کتنی سچائی ہے اس پر میں بعد میں گفتگو کروں گا لیکن ہر طرف جو یہ بحث چھڑی تو اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ باشعور لوگوں میں ایک اُمنگ پیدا ہوئی کہ جمود، بحران، اور شخصیت پرستی جس شکل میں اور جس قدر بھی ہو اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے ۔ ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی چھٹی سالانہ کانفرنس اسی "کچھ نہ کچھ کرنے" کی خواہش کا نتیجہ تھی اور اس کے بعد جگہ جگہ چھوٹے پیمانے پر جلسوں اور بحثوں نے بھی اس کانفرنس کے مقصد میں ہاتھ بٹایا ہے ۔

۱۹۵۳ء ادبی فضا میں کام کرنے والوں کو چوکنا کر کے اور انھیں تنظیم کی ضرورت جتا کر گیا ہے ۔ پاکستان میں یہ صورت ہندوستان سے کچھ پہلے پیش آئی اور یہ بات قابل غور ہے کہ پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں نے جن لائنوں پر اپنا اعلان نامہ تیار کیا تھا لفظوں کے ذرا سے فرق کے ساتھ ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے بھی ویسا ہی اعلان نامہ طے کیا ۔ اور مقصد و خیال کی یہ وحدت ہی تنظیم کی ضرورت ہے بلکہ نئے سرے سے زیادہ وسیع پیمانے پر تنظیم کی ضرورت میں دونوں کو ہم آہنگ کرتی ہے ۔

ادیبوں کی تنظیم

کیوں ضرورت سمجھی گئی کہ ادیبوں کو پھر سے منظم کیا جائے ؟ زیادہ سے زیادہ ادیبوں کو ترقی پسند صفوں میں لایا جائے اور ترقی پسند صفوں میں سمجھا جائے ۔ اپنی صفوں میں لانا اور اپنی صفوں میں سمجھنا دو مختلف تصورات ہیں لیکن دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے جسے نظر میں رکھنا چاہیئے ۔

جرمنی کو جب نازی سانچوں میں ڈھالنے کی مہم تیز ہوئی (۱۹۳۲ء کے بعد) اس وقت گوئبلز نے کہا تھا "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے" گوئبلز نے یہ کہہ کر اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھانا نہیں چاہا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ایک ادیب اور ذی علم لوگ جمہوریت پسند رجحان رکھتے ہیں ان میں سے توڑ توڑ کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جبر کے ذریعے، تحریص کے ذریعے، ترغیب کے ذریعے، بہکانے کے ذریعے اپنی صفوں میں لایا جائے اور جو لوگ اس کے باوجود خود کو نازی شمار کرنے سے انکار کر دیں انھیں دشمن کہہ کر الگ کر دیا جائے ۔

یہ نازی فکر کی نظام بندی (Regimentation) پر مبنی ہے ۔ ترقی پسند فکر و تصور کا انداز اس کے بالکل برعکس ہے ۔ یہاں کی صف بندی قطعی دوسرے مقصد سے ہوتی ہے اور دوسرے طریقے سے ہوتی ہے ۔ یہاں کا نعرہ یہ ہے کہ "جو ہمارے دشمن نہیں ہیں وہ ہمارے ساتھ ہیں"

اس کے معنی ہیں کہ جو لوگ عوام کی برتری، ان کے جمہوری حقوق اور ان کی آزادی کے کٹر اور سمجھ بوجھے دشمن نہیں ہیں ہم انھیں اپنی ہی

صفوں میں سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ خود کو ہماری صفوں میں لاتے ہوں یا نہ لاتے ہوں۔ ایسے بھی بہت لوگ ہوں گے جن کے دل میں انسانی دردمندی لہریں لیتی رہتی ہیں، جو عوامی نقطۂ نظر سے سوچتے اور لکھتے ہیں لیکن جن کی فکر یا تو ادھ کچری ہے یا ماضی کے الجھاووں سے پورے طور پر آزاد نہیں ہے یا آزاد بھی ہے تو کوئی ذاتی اور غیر ذاتی سبب ہے جس کی بنا پر وہ کھلے عام اپنے آپ کو ترقی پسند صفوں میں کھڑا کرنا پسند نہیں کرتے۔

سوال یہ تھا کہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہمارا عمل کیا ہو! بحثیں ہوئیں تو پتا چلا کہ (۱) کچھ لوگ ادیبوں کی تنظیم کے بارے میں اس طرح سوچ رہے تھے جیسے طبقاتی اور پیشہ ورانہ تنظیموں کے متعلق سوچا جاتا ہے۔ ادیبوں کی تنظیم ٹریڈ یونین کی تنظیم سے مختلف ہوتی ہے اور دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا فولادی مشینوں کے کارخانے اور انسانی دماغ کے کارخانے میں ہوتا ہے۔

(۲) پھر کچھ لوگ طبقاتی پارٹی کی تنظیم کا ایک جزو ادیبوں کی تنظیم کو بھی سمجھتے تھے۔ وہ ترقی پسندی کا نظریہ اور انقلابی جوش و خروش رکھنے کے باوجود اس طرح کی لام بندی کے رجحان کا شکار ہو گئے جو دوستوں کی صفوں میں دشمن تلاش کرنے اور انہیں الگ کرنے پر ساری قوت لگا دیتے ہیں۔ اس رجحان کا نتیجہ جو ترقی پسند صفوں کو بھگتنا پڑا وہ اس کے ثمر سے زیادہ مہنگا رہا۔ جن کو ہم نے اپنا نہیں سمجھا ان کو تو اپنے ساتھ نہ لا سکے اور جن کو ہم نے تبدیل کر کے اپنے ساتھ لانا چاہا تھا وہ اور دور چلے گئے۔ نتیجہ یہ کہ ہم روز بروز ایک تنگ سے تنگ دائرے میں سمٹتے چلے گئے۔

جس طرح اپنی غلطیوں سے کبھی کوئی اچھا سبق بھی ملتا ہے۔ اس غلط رجحان سے ترقی پسند صفوں کو بھی ایک ثمرہ ملا۔ یہ تھا تنگ دائرے کے اندر باہمی قربت، زیادہ شدت اور زیادہ بے باکی و جاں بازی۔ انکار نہ کرنا چاہیے کہ اسی غلط رجحان کے شکار لوگوں میں ایسے ادیب بھی شامل تھے جن کے ادب میں دشمنوں پر حملے کی دھار تیز ہوئی۔ اور جنھوں نے کڑی آزمائشیں جھیل کر خود کو کندن کر لیا۔

اُردو ادب کی تاریخ میں ایسا دور کبھی نہیں آیا جب نظم، غزل، افسانہ، ناول، رپورتاژ اور دوسرا اصناف میں کھل کر اپنے دل کی بات کہی گئی ہو۔ اور جب "جذبۂ بے اختیار" اس بے باکی سے کام آیا ہو۔

(۳) ادیبوں کی تنظیم کے معاملہ میں تیسرا نقطۂ نظر ان لوگوں کا تھا جو اپنی حد سے بہت آگے بڑھ کے وار کرنے والوں سے اکتائے ہوئے اور تنگ سے تنگ دائرے کے نقصانات سے سہمے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ کوئی ضرورت صف بندی کی نہیں ہے ادیب چاہے وہ کسی خیال کا ہو، اگر ادیب ہے تو وہ ہمارا ساتھی ہے اور اس پر کوئی لیبل لگائے بغیر بھی ہم اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ ہم اپنے لیبل ہی اتار دیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اپنے لیبل اُتار کر ہمارے لئے یہ آسانی ہو جائے گی کہ چاہے ہم ان کی صف میں شامل ہو جائیں، چاہے ہماری صف میں آجائیں جب "امتیازِ من و تو" ہی اٹھ گیا تو دونوں صورتوں میں بات ایک ہی رہے گی۔

تیسرے نقطۂ نظر سے ادب ایک نظریاتی پیداوار ہے اور زندگی سے اس کا تعلق سپر اسٹرکچر (Super Structure) ہوتا ہے اس لئے بنیادی طور پر صحیح فکر ہونے کے باوجود یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اس میں غلط اور صحیح کا امتزاج ہو جائے۔ اس میں دودھ اور پانی کی ملاوٹ خود کو دودھ کہہ کر پیش کرے تیسرے نقطۂ نظر کے نیک نیت لوگ اس خطرے کو کم کر کے دیکھتے تھے (اور آج بھی دیکھتے ہیں) جو بیمار اور صحت مند، سیدھے اور ٹیڑھے، ناقص اور بے عیب رجحانات کے گڈمڈ ہو جانے کی صورت میں پیش آتا ہے۔ ابھی تو ہماری ذہنی اور ادبی کاوشوں کو اس منزل پر بھی پہونچنا نصیب نہیں ہوا جہاں ہم صحیح اور غلط رجحان کا الگ الگ فرق کر سکیں۔ ابھی تک ہمارے اچھے ادیبوں کے ادب میں بھی کچھ نہ کچھ اور کچھ گرد و پیش کے اثر سے ایسے تاگے نکل آتے ہیں جن کا دوسرا سرا مخالف نظریوں سے جا ملتا ہے۔

(۴) ادیبوں کی تنظیم کا سوال ان لوگوں کی رائے کے مطابق طے ہوا جو کہتے تھے کہ تنظیم زیادہ سے زیادہ وسیع اور گہری ہونی چاہیے۔ وسیع کا مفہوم یہ کہ اس میں وہ تمام لوگ شامل سمجھے جائیں جو الگ الگ زاویے رکھنے کے باوجود عوام اور جمہوریت کے دشمن

نہیں ہیں۔ اگر تنظیم کے قوانین نرم ہوں اور عمل کا طریقہ دیرپا اثر اور دور رس ہو۔

ایک اعلان نامے کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں نے اپنے دروازے ایسے تمام لوگوں کے لئے کھول دیئے اور اپنی ساخت کو بدلنے کی پالیسی بھی اختیار کر لی۔ جس کی بدولت نئی وسعتوں کا امکان پیدا ہو گیا۔

عملی راستے

۱۹۵۳ء کے خاتمے کے ساتھ جہاں ادیبوں کی صفوں کا انتشار کم ہوا ہے اور تنظیم و عمل کے نئے امکانات کھلے ہیں وہاں زیادہ گمبھیر ذمہ داریاں بھی ان کے کاندھوں پر آ پڑی ہیں۔ اور نئے سوال منہ کھولے کھڑے ہیں۔

سب سے پہلے قول و عمل کی مطابقت ہے۔ ہم نے جس پالیسی کا اعلان کیا ہے اس پر عمل کرنے اور عملی طور پر اس سے آگے بڑھانے کیلئے ہم نے اب تک کیا کیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ہم نے رُخ تو سیدھا کیا لیکن ابھی چلنا شروع نہیں کیا ہے۔

ادیبوں کے موجودہ حالات میں نام بندی سے اتنا خطرہ نہیں رہا جتنا اس بات سے کہ کہیں وہ جامہ بھی قبول نہ کر لیں ——— "جس کا نہیں اُلٹا سیدھا" اب ہمارے ادیبوں کے سامنے یہ سوال نہیں کہ وہ "ادب برائے زندگی" کی سچائی ثابت کرتے پھریں۔ یہ بات اب دشمنوں پر بھی ثابت ہو گئی ہے۔ اور عوام کا ہر ایک جلسہ، ہر ایک مجمع ادب برائے زندگی کی سچائی کی ایک کھلی دستاویز بن چکا ہے۔ لیکن ایک تو ہمیں اپنے ادب سے اُن بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی رہنمائی کرنی ہے جو آگے بڑھنے کا راستہ نہیں پاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ماضی کے ادب سے ان ادیبوں کو اور اس ادب کو جھاڑ پونچھ کر سامنے لانا اور چمکانا ہے جو موجودہ نظام تعلیم اور عام معاشی خستہ حالی کی وجہ سے بے التفات پڑا ہوا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ غیر ملکی ادب کے جو شہ پارے ہماری دیسی زبانوں کو زندگی کی بہترین تمنائیں اور آسائشیں دے سکتے ہیں ان کی طرف سے غفلت اور بے خبری دور کرنی ہے۔ چوتھے اپنے ادب میں بھی پھیلاؤ کے ساتھ گہرائی پیدا کرنی ہے۔ موضوع بالکل ذاتی اور داخلی ہو، قومی ہو یا بین الاقوامی، اب محض تعارف کا محتاج نہیں رہا تحقیق، چھان بین، اور گہرائی کے ساتھ تاثیر چاہتا ہے۔ ادب میں نعرہ بھی ایسی بری چیز نہیں ہے لیکن وہ ہر موضوع کا بالکل ابتدائی مرحلہ ہے۔ اب ہمیں اس مرحلے سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ پانچویں بات جو ہماری نئی پالیسی، نئے پروگرام اور نئی تنظیم سے عملی ثبوت مانگتی ہے، یہ ہے کہ جہاں ہم اپنی کاوشوں پر سختی سے تنقید کریں، اس کا جائزہ لیں اور ملے بار بار چھانیں، وہیں اس ادب کو بھی اپنائیں جو سو فیصدی ہمارے کام کا نہیں ہے۔ بلکہ جس میں ہمارے کام کے تھوڑے بہت عناصر پائے جاتے ہیں۔ لینن نے ایک بار روس کے اشتراکی ادیبوں کو جو نصیحت "کیا کرنا چاہیئے" کے مضامین میں کی تھی وہ آج بھی ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

اُس نے کہا تھا کہ ہمیں عوام و خواص کو سیاسی شعور دینے اور بیدار کرنے کیلئے صرف ایسے ہی ادب سے کام نہیں لینا جو سراسر انقلابی ہو، جو انقلاب اور مادیت کے سائنٹفک تصور کے ماتحت لکھا گیا ہو بلکہ ہمیں پچھلی صدیوں کے اس ادب کو بھی استعمال کرنا چاہیئے جس میں اگرچہ انقلاب اور مادیت اور طبقاتی زندگی کا مکمل نظریہ تو نہیں ہے مگر وہ سماج کے کسی نہ کسی حصے کے احتجاج کو اور کسی نہ کسی ظلم یا نادانی اور وہم پرستی کے خلاف آواز کو بلند کرتا ہے۔ ہمیں فرانس کے لامذہبوں کی تحریروں کو ان کے ناول اور افسانے کو بھی عام بیداری کی تحریک میں استعمال کرنا چاہیئے۔ اور پچھلے ادب کے ملبے سے ان تحریروں کو بھی نکال کر اپنا ایک ہتھیار فی الحال بنا لینا چاہیئے جو آگے کی لڑائی میں کام آنے والا نہیں ہے۔

لینن کے ان الفاظ میں جو ہدایت پوشیدہ ہے وہ ہمارے ادیبوں کی نئی پالیسی اور نئے طریق کار میں مناسب مقام رکھتی ہے اور اس کی تعمیل بھی ہونی چاہیئے اس طرح کہ جہاں ہم اپنی تحریروں کو ترقی پسند نظریئے کی کسوٹی پر بار بار سختی سے کس کر دیکھیں وہاں ہم

شاھراہ

اس ادب کو بھی نظر انداز نہ کریں جو ہمارے سماج کے کسی نا کسی حصے کا احتجاج اور کسی نہ کسی قبیل کی وہم پرستی کے خلاف صدا بلند ہوتی ہے ابھی لوہا گرم ہے۔ اسی وقت ضرب پڑنی چاہیئے۔

ادب میں جمود

عام احساس پایا جاتا ہے کہ اُردو ادب مقدار کے اعتبار سے تو نہیں لیکن اپنی سطح اور معیار، اپنے تنوع اور گہرائی کے لحاظ سے جمود کے عالم میں ہے۔ کچھ ایسے پُرجوش لوگ بھی ضرور ہوں گے جو اپنی ہماہمی کی وجہ سے یا "بدنامی" کے ڈر سے یہ بات نہ مانیں اور بار بار اسی ایک پا بولے کو دہرائے جائیں کہ ادب تو زندگی کا ترجمان ہے۔ چونکہ زندگی مسلسل حرکت وارتقا سے عبارت ہے اس لئے ادب میں بھی حرکت وارتقا کا عمل ضرور پایا جاتا ہے۔ مگر یہ زندگی اور ادب کے گہرے تعلق کا ایک پھیکا اور میکانکی تصور ہے۔

میں اس موقعہ پر ہاں اور نہیں کی بحث کو نظر انداز کر کے ان لوگوں سے اتفاق کرتا ہوں جو ادب میں جمود، افراتفری اور بے تہہ پن کی شکایت کرتے ہیں بلکہ میں تو کہوں گا کہ عام افسردگی، بے زاری، بے دلی اور بیزاری "منہ سنہ" کا جنس بھی طاری ہے۔ لیکن ایسا ہے کیوں؟ اگر اس پر اتفاق ہو جائے کہ ادب میں یہ موجودہ صورت حال فلاں فلاں اسباب سے پیدا ہوئی ہے تو اس کی چارہ سازی بھی ممکن ہے۔

کچھ لوگ جو لاکھ جتن کرنے پر بھی اپنی شخصیت ادب میں نہ منوا سکے اس کا جواب ایک جملہ میں دے دیتے ہیں کہ "ادب میں شخصیت پرستی اور گٹ بندی ہے اس لئے ادب پروان نہیں چڑھ رہا ہے"

اس میں شک نہیں کہ شخصیت پرستی جہاں بھی پھیل جائے وہاں ارتقار کا امکان دھندلا جاتا ہے۔ اُردو ادب میں پچھلے چند برسوں میں چند شخصیتیں ایسی ضرور ابھری ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو بہت جلد تسلیم کرالیا اور نئی نسل ان سے متاثر ہونے لگی۔ لیکن یہ انوکھی بات یا تجربہ نہیں ہے۔

یہ ایک تجرباتی اور ہنگامی دور میں اور ہر زبان میں ایسا ہوتا ہے مگر اس کی بدولت کئی شخصیتیں ابھرتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ اگر چار نامور اور مقبول ادیب لکھنا کم کر دیں یا لکھیں تو بہت مگر سوچنا اور ہضم کرنا یا نیا مصالحہ پیش کرنا کم کر دیں تو بس ادب میں جمود طاری ہو جائے۔ ایسا نہیں ہے۔

مثال کے طور پر کرشن چندر سے کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ وہ اتنا بہت سا لکھنے لگے ہیں کہ اُس میں ادب اور افسانہ کا ذخیرہ اتنا ہی کم ہونے لگا ہے یا بیدی سے شکایت کی جاتی ہے کہ آپ اتنا کم لکھتے ہیں کہ آپ کا عدم وجود برابر ہو گیا ہے۔ اسی طرح شعرا کا معاملہ ہے۔ اگر یہ واقعہ بھی مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ ادب کے جمود کی صورت میں کیوں نکلے گا۔ دوسرے لوگ زیادہ لکھنے لگیں یا زرا اچھا لکھنے لگیں تو کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی سے شکایت کرنے کا موقعہ ہی نہیں آنے گا اور ادب ان کے مقام سے آگے بڑھ جائے گا۔ آخر وہ جو ترقی پسندوں کی اس سے پہلی نسل گذری ہے اس کا حشر بھی تو یہی ہوا۔ کسی نے دس برس پہلے شکایت کی کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، احمد علی، نیاز فتحپوری، اور قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، حیات اللہ انصاری جدید اُردو ادب کی ایک ادبی شخصیت کے مالک بن گئے تھے۔ چونکہ انھوں نے لکھنا کم کر دیا، یا وہ چونکہ ایک مقام پر پہونچ کر تھم گئے اس لئے اُردو ادب میں وہ شخصیت پرستی کے اثر سے جمود آ گیا۔

حقیقت بالکل برعکس ہے۔ چند اچھے، مقبول اور نمونے کے ادیبوں کی شخصیت سے نہ تو کسی ادب میں جمود آتا ہے، نہ ان کی شخصیت راہ روک کر کھڑی ہوتی ہے۔ بلکہ ادب میں جن خارجی اور داخلی اسباب سے جمود پیدا ہوتا ہے وہی اسباب خود

چھوٹے بڑے، نامور اور بے نام ادیبوں کو بھی رہا کرتے ہیں۔ اور بڑی بڑی شخصیتوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیتے ہیں۔ یعنی "شخصیت پرستی" جس شکل میں بھی ہو، ہو، یا نہ ہو، لیکن وہ جمود کا سبب نہیں ہے وہ بھی ایک نتیجہ اور ایک مظہر ہے اس عام اور گہرے جمود اور بے تہہ پن[2] کا اس لئے جمود، افراتفری، بے تہہ پن[1] اور بے زاری کے اسباب محض الزامی اور فرضی "شخصیت پرستی" سے باہر ڈھونڈنے پڑیں گے۔

خارجی اور داخلی اسباب

زندگی میں بحران یا جمود ہو (اگرچہ یہ دونوں حالتیں اکثر ایک دوسری سے بالکل مختلف ہوتی ہیں) تو لازمی نہیں ہے کہ ادب میں بھی اس کا اثر ویسے ہی پڑے۔ ۱۸۴۵ء میں "جرمنی کی حالت" پر ایک مضمون لکھتے ہوئے اینگلس نے جرمنی کے ایک ایسے ہی دور کی حالت بیان کی ہے جس سے ہم اُردو والوں کو آجکل سابقہ ہے۔

"پچھلی صدی کے آخری زمانے میں جرمنی کی حالت بڑی تباہ تھی۔ ہر طرف گمبھیر زوال اور انحطاط کا انبار لگا ہوا تھا کوئی آدمی اپنے آپ کو راحت میں محسوس نہیں کرتا تھا۔ تجارت، لین دین، بیوپار، صنعت و حرفت اور ملک زراعتی نظام بالکل بیٹھا ہوا چکا تھا۔ کسانوں پر، تجارت پیشہ لوگوں پر، دستکاروں اور کاریگروں پر اس مندی یا کساد بازاری اور خون چوسنے والی سرکار کی دُہری مصیبت طاری تھی۔ بڑے شرفاء اور جاگیردار بھی محسوس کر رہے تھے کہ غریب کسانوں کی لوٹ اور رعایا کی اس قدر جیب کاٹنے پر بھی ان کا پورا نہیں پڑتا۔ ملک میں ہر جانب بے چینی اور اضطراب کی فضا تھی۔ نہ تعلیم عام تھی، نہ لوگوں کے دماغوں تک رسائی کے ذریعے تھے، نہ تحریر و تقریر کی آزادی تھی، نہ پبلک اسپرٹ تھی، نہ دوسرے ملکوں سے تجارت کا پھیلاؤ تھا۔ ہر طرف خود غرضی، بد اخلاقی اور کمینہ پن کا دَور دَورہ تھا۔ اور گھٹیا درجہ کی دوکان داری سب پر مسلط تھی ......"

لیکن اس گمبھیر بے دلی کے عالم میں اگر کہیں امید کی کرن چمک رہی تھی تو قوم کے ادب میں۔

"لیکن جرمنی کا یہی زمانہ جو سیاسی اور سماجی لحاظ سے اس درجہ شرمناک تھا۔ ادبی لحاظ سے بہت زبردست دور گزرا ہے۔ ۱۸۵۰ء کے نزدیک ہی جرمنی کے تمام زبردست وجود پیدا ہوئے۔ گوئٹے اور شیلر جیسے شاعر، کانٹ اور فشٹے جیسے فلسفی ابھرے۔ اور بیس برس بھی نہ ہوئے تھے کہ جرمنی کا آخری زبردست مابعد الطبیعاتی (Metaphysician) ہیگل پیدا ہوا۔ اس قسم کے جتنے اہم کارنامے تھے ان سب کا رُخ جرمنی کی اس زمانے کی حالت کے خلاف بغاوت، نفرت اور غصے کا تھا ...."

اس اقتباس میں اگرچہ آگے چلکر بتایا گیا ہے کہ جرمنی کے یہ بہترین دل و دماغ بعد میں کس طرح مایوسی کا شکار ہو گئے اور اپنے ملک کا کوئی مستقبل نظر نہ آنے کی وجہ سے ان کے دماغوں پر کیا بے زاری کا دَورہ پڑا، لیکن یہاں اس کے دُہرانے کی ضرورت صرف یہ جتلانے کیلئے پیش آئی کہ زندگی میں مایوس کن اور دردناک حالات نظر آتے ہیں تو ادب اور فلسفے میں اس کا نتیجہ مخالف سمت میں بھی نکلتا ہے۔ خود ہمارے یہاں میرؔ و غالبؔ کا دور اور ان کی شاعری اس کا ایک کھُلا ثبوت ہے۔

زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ "ادب میں جمود" کا احساس ہمیں اس وقت ہو رہا ہے جب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک عظیم مستقبل اور دلوں میں اس کا اٹل یقین موجود ہے۔ ہمارے ارد گرد قومیں اپنا مستقبل تعمیر کر رہی ہیں اور اپنے ساتھ ہی دبے کچلے مظلوم عوام اور کمزور قوموں کا، نئی انسانیت کا مستقبل بالکل نئے تازہ بہ تازہ سانچوں میں ڈھل رہا ہے۔ خوابوں اور تمناؤں کی دنیا تعمیر ہو رہی ہے۔ جب ہم "دو اور دو چار" کی شکل میں دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں طاقتوں کا توازن بدل چکا ہے۔ اور جس طاقت کے پلڑے میں ہمارا وزن ہے وہ طاقت نئی انسانیت کی تعمیر میں روز بہ روز فیصلہ کن حیثیت حاصل کرتی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں اُردو کا جمود اور دردناک ہے اور اپنے اسباب کا گہرا کھوج

---

[1] Superficiality

[2] میں نے جان بوجھ کر کلبیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی ظ ا

جاہتا ہے۔
(۱) باہر کی زندگی میں اس کا سبب اور سب سے اہم سبب مجھے "معاشی بحران" نظر آتا ہے۔ جس نے زندہ رہنے کی کش مکش کو اتنا سخت کر دیا
ہے کہ ایک طرف تو ادب پیدا کرنے والوں کا زیادہ وقت غیر ادبی سرگرمیوں میں نکل جاتا ہے اور دوسری طرف ادب چاہنے اور مانگنے والوں کی زیادہ
توجہ اور زیادہ پیسہ غیر ادبی چیزوں کی خرید میں صرف ہونے لگا ہے "معاشی بحران" یوں بھی ادب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب ادب اور فنون لطیف
بازار کی جنس بن جاتے ہیں اور ادیب کی گذر بسر بازار کی حرکت پر اس کے سکڑنے، سمٹنے اور پھیلنے پر منحصر ہو جاتا ہے تو عام گاہکوں کی قوت خرید ادب
کو ہر چہار جانب سے متاثر کرتی ہے۔ جب ادیب کل تک زندگی کے موڑ پر اور "بالکنی" جیسے طویل افسانے لکھتے تھے اب "ایک دو تین"
جیسی تیسرے درجے کی فلمی کہانیاں لکھنے پر مجبور رہتے ہیں۔ ایک دیوالیہ دوکانداری پر رونے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں۔
پھر ہمارے ملک کا سماجی ڈھانچہ جیسا ہے، ظاہر ہے کہ ایک تو تعلیم کم پھر اس کم تعلیم کے عناصر ترکیبی ایسے کہ زیادہ تر کلرک اور اپنے ادب سے
بے بہرہ لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اردو ادب کو جو علاقے حاصل ہیں وہ زیادہ تر زراعی علاقے یا نیم صنعتی خطے ہیں جن میں نیا شعور، نئی تعلیم
نئی تہذیب کا اثر اتنا گہرا نہیں جتنا صنعتی علاقوں میں ہوتا ہے۔ ان میں ٹریڈ یونین تحریک اور کسان سبھا یا دوسری طبقاتی تنظیمیں بھی ہمہ گیر نہیں ہیں۔
جدید ادب کا مارکٹ ان میں پہلے ہی سے برائے نام تھا۔
۴۲، ۱۹۴۳ء کے بعد سے دنیا کی معاشی زندگی میں جو برائے نام بحالی آئی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جنگی سرگرمیوں اور تیاریوں
کی وجہ سے جو شہروں میں تیزی کے ساتھ درمیانی اور مزدور طبقے کی آبادی بڑھی تھی، اس نے ادب کے بازار کو پھیلایا تھا۔ اخبارات کی اشاعت اور
کتابوں کی طباعت اس زمانے میں تیزی سے پھیلی۔ اور ادب کے لئے وہ حالات پیدا ہوئے کہ وہ رجواڑوں اور سرپرستوں سے آزاد ہو کر صرف
"کھلے بازار" کے سہارے جی سکے۔ یہ کھلا بازار زیادہ تر معمولی پڑھے لکھے متوسط طبقے کے نوجوانوں اور شہر کے کاروباری لوگوں کی بدولت پیدا
ہوا تھا۔ جنگ کے بعد کے معاشی بحران نے معمولی پڑھے لکھے نوجوانوں سے یا تو روزگار چھین لیا یا ایک ایک پر کئی کئی بے روزگاروں کا بوجھ
ڈال کر ان کی قوت خرید گرا دی۔ اور ان کے روپے کی marginal utility بہت بڑھا دی۔ شہر کے کاروباری لوگ ہاتھ پر
ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور عام بے دلی کا شکار ہیں۔ جن طبقوں کی بدولت اردو ادب کا بازار پھیلا اور بڑھا تھا۔ جن کی بدولت اردو ادب کا
چرچا اس کی قدر دانی اور اسکی اشاعت وسیع ہوئی تھی۔ وہ طبقے "معاشی بحران" کا بری طرح نشانہ بنے ہیں۔ ادب ان میں سے بہتوں
کی "ضرورت زندگی" نہیں تھا۔ آسائشی یا تفریحی اسباب میں شامل تھا۔ چنانچہ اس کی طرف سے بے پروائی بھی اتنی آسان اور یقینی تھی۔
اردو ادب کی کھپت، اس کی مانگ، اس کی قدر دانی اور اس کا چرچا کم ہو جانے سے پورا ماحول اس طرح متاثر ہوا ہے کہ پرانے لکھنے والوں میں
حوصلہ اور نئے لکھنے والوں میں ہمت افزائی کی کمی ہو گئی ہے۔ ہمارا شہری متوسط طبقہ اور نیم تعلیم یافتہ کاروباری لوگ معاشی بحران
کے حملے سے ذہنی طور پر اس درجہ اداس اور سہمے کہ "نزلہ بر عضو ضعیف" کی طرح وہ سستے، گھٹیا، اور مجرمانہ ادب کے (اگر اسے ادب فرض
کر لیا جائے تو) شکار ہوتے رہے ہیں۔
امریکہ کی دہشت انگیزی سے بھری ہوئی فلموں اور ناولوں کی تقلید میں دھڑا دھڑ "اغوائی اور غوغائی" ادب چھاپا جا رہا ہے اور
کھپ رہا ہے۔ اور انگریزی کے بعد ہماری زبان میں سب سے زیادہ سمائی ہو رہی ہے۔
یہ کسی کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے کہ جہاں ہم اپنے ادب کی کساد بازاری کا شکوہ کر رہے ہیں وہاں قتل و غارت گری کے ہولناک افسانوں
کا غوغائی ادب اور فحش جنسیات کا اغوائی ادب اپنا بازار بڑھا رہا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ اشاعت گھروں کی توجہ ادھر ہوتی جا رہی ہے۔
میر و غالب کی دونوں کو بحران اور طوائف الملوکی کا سامنا تھا اور وہ اپنے تخیل کی دنیا میں اس سے جہاد کرتے رہے تھے۔ انھیں

۱؎ یہ لفظ میں نے Economics کی معاشیات سے لیا ہے جو مارکسی پولٹیکل اکانومی سے مختلف ہے اسکے بجائے اردو اصطلاح "افادہ مختتم" ہو جو اسی طرح ترجمہ کا محتاج ہو گا۔

آج کے جیسے جمود کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

ممکن ہے کچھ لوگوں کو ناگوار گزرے لیکن ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صدی میں اردو ادب کا زیادہ اشاعتی میلان اور خطابی رجحان شہر کے متوسط طبقے کی جانب رہا ہے۔ اور اس طبقاتی رشتے کی بدولت آج اردو ادب کو ہی سب سے زیادہ جمود، بے دلی اور باسی پن کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔

یہ بالکل وہی مظاہر ہیں جو شہری متوسط طبقے میں عام طور سے پائے جاتے ہیں۔

"معاشی بحران" کے اس خارجی اور اہم سبب کے علاوہ ایک داخلی پہلو بھی اس کا ضرور ہے۔ اور وہ ہے اردو کے زیادہ تر ادیبوں اور خاص طور سے نمایاں کا شہری درمیانی طبقے سے آنا اور اس کے انداز فکر و اظہار سے وابستہ ہونا اور وابستہ رہنا۔

درمیانی طبقے کے گھرانوں میں پیدا ہونا تو خیر اردو ادیب کی سماجی مجبوری ہے جس پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا۔ لیکن اسی طبقے کے انداز فکر و اظہار کو اپنائے رکھنا اور آج تک اسی پر زور دیتے رہنا البتہ ایک ایسی روایتی خامی ہے جس کا بھگتان ہمیں آج بھی بھگتنا پڑ رہا ہے اور ابھی پڑے گا۔

"انداز فکر و اظہار" کے لفظ پر حیران یا ہمیں ہونا چاہیے۔ درمیانی طبقہ بنیادی طور پر اپنی فکر میں حکمراں اور سرمایہ دار طبقے کی لپیٹ میں رہتا ہے اور جب تک محنت کشوں کی انقلابی قوت اپنے فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچ جاتی اس وقت تک درمیانی طبقہ متذبذب رہتا ہے۔ آج محنت کشوں کو منظم انقلابی قوت تیاریوں کے درمیانی مرحلے میں ہے۔ درمیانی طبقے کے جن لوگوں نے اپنی فکر کا رشتہ بورژوازی فکر سے توڑ لیا ہے وہ بجا طور پر سماج میں ادب، تہذیب، تعلیم اور پرچار کے علمبرداروں میں ہیں لیکن ان کا خطاب اور طرز خطاب دونوں ایسے ہیں کہ وہ درمیانی طبقے کی فہم سے اور شہر کے تربیت یافتہ مزدور طبقے کی سماعت سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

اردو ادب خانقاہوں، درباروں اور درباروں سے آگے بڑھا تھا تو اس میں ایک امنگ تھی۔ اسے شہروں کے بازار، محلے اور گلیاں مل گئی تھیں پھیلنے کے لیے۔ چنانچہ کل جمود کے وہ آثار نہیں تھے۔ اب یہ آثار ہیں گویا کہ اردو ادب پر پچھلی وسعتیں تنگ ہو رہی ہیں اور اسے "انداز فکر و اظہار" کو نئی قوتیں اور نئی وسعتیں دینے والے نئے بازار نہیں مل رہے ہیں جب تک معاشی بحران کی اس شدت میں نئے بازار نہیں ملیں گے اردو ادب کا یہ جمود اور یہ بے تہہ پن اور باسی پن کم نہ ہوگا۔

ادب خارجی حالات کو براہ راست تو نہیں بدلتا لیکن ان کے بدلنے یا متاثر کرنے میں بالواسطہ ضرور مدد کرتا ہے۔

جہاں اردو ادب ہر دور میں اپنے زمانے کی ترقی پسند قوتوں کی ترجمانی کرنے میں آگے آگے رہا ہے۔ وہاں آج بھی اس نظام کے خلاف جو معاشی بحران لاتے رہنے کا ذمہ دار ہے، اردو ادب کی بغاوت خود اس جمود اور افسردگی کی چارہ سازی ہے۔ مگر اس خارجی زور آزمائی کے علاوہ داخلی پہلو سے بھی اس جمود کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب جبکہ نظریاتی گہرا چھٹتا جا رہا ہے نئے سال کا سب سے اہم سوال اردو ادب کے سامنے یہی ہے۔

(۲) دوسرا عذاب جو اردو ادب پر پچھلے چھ سال میں نازل ہوا تقسیم ہند کے دور رس اثرات ہیں۔ لوگ جب جمود اور افسردگی کا ذکر کرتے ہیں تو اس بنیادی حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ پاکستان کے ادیب اور پبلشر پر جب اس کی چوٹ پڑتی ہے تو وہ دل میں یہ سوچ کر تسکین پا لیتے ہیں کہ اردو دراصل میں ہندوستانی علاقہ کی زبان ہے اور آج بھی پاکستان سے زیادہ وہیں پاکستان کے اردو ادب کی کھپت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ہندوستان کے ادیب یا پبلشر کو اردو ادب کی کائنات میں جمود کا شکوہ ہوتا ہے تو وہ خود کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتے ہیں کہ ہندوستان میں تو اردو کو بے وطن کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے لیکن پاکستان میں جو اردو کو تحفظ ملا ہے اس کی بدولت وہاں سے اردو ادب کے بڑھنے پنپنے کے کافی امکانات ہیں۔ ہو رہے ہوں گے کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔

لیکن سوچنے کا یہ طریقہ بھی اوندھا ہے

اردو کی جڑ بنیاد والی زمین آج بھی وہی ہے جو چھ برس پہلے تھی، جہاں کی بولی اور جہاں کی ادبی زبان ایک دستکر کے ساتھ مکمل

ہوتی ہیں۔ پاکستان میں اُردو ادب تو ہے، اُردو بولی نہیں ہے۔ پاکستان میں اردو کی حیثیت علمی اور ادبی زبان کی ہے جو پڑھے لکھے متوسط طبقہ اور بہت کم تعداد پناہ گزین طبقے تک محدود ہے۔ اردو وہاں چاہے جتنی پھیل جائے، مقامی بولیوں مثلاً پنجابی، پشتو، بنگالی بلوچستانی، سندھی، وغیرہ کی جگہ نہ لے سکے گی۔ یعنی وہ ادیبانہ پر تیرتی رہے گی۔ وہاں اسے جو تحفظات، یا جو ہمت افزائی کے سامان حاصل ہیں ان سے ٹکنکل ترقی ضرور ہوگی اور ہو رہی ہے۔ لیکن ادب کی وسعت اور اس کی گہرائی کا تقاضا پورا نہ ہوگا۔ کسی زبان کے ادب میں جوش، خروش، تنوع، گہرائی، تازگی اور ارتقار کے لئے سب سے پہلے ضرورت جو ہے کہ اپنی سرزمین کے عوام سے اس کا براہ راست رشتہ ہو اور ادبی زبان اور بولی کی زبان ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوں، یہ صورت کم از کم دس پندرہ برس تو پاکستان میں پیدا ہونے والی نہیں ہے۔ اور اس طرح بنیادی کڑی غائب ہونا بھی اُردو ادب کو اندر سے متاثر کر رہا ہے۔

ہندوستان میں اُردو کی زمین تو ہے۔ بنیادی کڑی موجود ہے لیکن دوسری ضروریات نہیں ہیں۔ سرکاری طور پر اس کے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک ہو رہا ہے۔ اور سرمایہ داری اقتدار غیر سرکاری طور پر بھی اردو کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ نئی نسل جو ابھر رہی ہے جو کالجوں یا اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہے وہ ابھی ادب سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ یعنی بولی موجود ہے مگر ادبی پھیلاؤ کے امکانات کم ہوتے جا رہے ہیں۔ عام طور پر یہ احساس کہ یہاں اُردو کی ناقدری ہے۔ اُردو ادب کی ناقدری کی عملی شکل میں سامنے آ رہا ہے۔ اور ادبی وغیر ادبی لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹا رہا ہے۔

تقسیم ہند نے اُردو ادب کے لئے صرف اسی قدر غیر فطری فضا نہیں پیدا کی کہ غیر فطری تبادلۂ آبادی نے بھی نقصان پہونچایا ہے۔ جس سے برسوں کے جمے ہوئے ادارے اور حلقے تتر بتر ہو گئے ہیں۔ جس طرح صنعتی پیداوار کے لئے صنعتی مرکزیت کی اہمیت ہے۔ اسی طرح ادبی تحریک اور جوش و خروش اور اس کی تازگی کے لئے ادبی حلقوں کا اور ادبی کاروبار کا جماؤ بہت ضروری ہوتا ہے جو ۱۹۳۶ء سے خاص طور پر شروع ہوا تھا اور ۱۰ برس بعد اچانک بکھر گیا۔

کچھ تو اُردو ادب کے پرانے مرکز تھے مثلاً دہلی، لکھنؤ، رام پور، حیدرآباد، لاہور، پٹنہ، اور کچھ جدید صنعتی تہذیب نے بنائے تھے مثلاً کلکتہ اور بمبئی۔ ان شہروں میں ادب اپنے اِرد گرد ادبی حلقوں کا اور ادبی اداروں اور اکھاڑوں کا جماؤ تھا۔ جس شہر میں ایسے حلقوں کی اور اداروں کی جتنی اکثریت تھی اتنی ہی اس میں مرکزیت پیدا ہو گئی تھی۔ ہر نیا افسانہ، اچھا افسانہ، اچھا ناول، اچھی تنقید، اچھا شعر سامنے آتے ہی مرکز نظر بن جاتا اور اس کا چرچا ہوتا تھا۔ ادب لطیف، ساقی، نیا ادب، ہمایوں، ادبی دنیا، نگار، اُردو، عالمگیر، معارف، نیرنگ خیال، ندیم چند گنے چنے مگر مرکزی پرچے تھے۔ کہ ان میں چند بار شائع ہو کر اور ان کی نظریں چڑھ کر ادیب پورے ادبی حلقے سے روشناس ہو جاتا تھا۔ تقسیم ہند سے اب وہ مرکزیت ٹوٹ گئی ہے اور نئی مرکزیت نے اس کی جگہ ابھی نہیں لی ہے۔

جہاں فن ہے وہاں اسے اظہار کی تمنا ہے۔ اور جہاں ادب ہے وہاں ادب شناسوں کی تلاش ہے۔ اظہار کی یہ خواہش اور داد لینے کی یہ تمنا جس قدر سیراب ہوتی جاتی ہے ادیب کا حوصلہ اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔ مگر جب مرکزیت ٹوٹنے سے یہ نظام درہم برہم ہوتا ہے تو ادب کی تازگی اور اس کے حرکت و ارتقار میں بھی فرق پڑتا ہے۔

شاہراہ، ادب لطیف، تہذیب، نقوش، سویرا اور اردو ادب مقبول ہونے کے باوجود ابھی تک وہ مرکزیت پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

ثبوت کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۳۵ء اور ۴۵ء کے درمیانی دس برسوں میں جو ادیب ابھرے تھے اور جس تیزی سے ابھرے تھے، وہ اس آٹھ برس کے عرصہ میں اپنی جگہ سے بہت کم آگے بڑھ سکے ہیں۔ اور پانچ سات نام بھی ان ادیبوں کے نہیں لئے جا سکتے جو ادھر تقسیم ہند کے زمانے سے اُردو ادب میں ابھرے ہوں۔

ادب شناسوں کی توجہ اور ادبی حلقوں میں گونج ادیب کی وہ غذا ہے جو روٹی کے بعد اسے چاہئے۔ یہ غذا اب پہلے کی طرح

نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے بھی ادیبوں کی نئی نسل تیزی سے نہیں ابھر رہی ہے۔ اور اُردو ادب کا تنوع، تازگی اور گہرائی ایک جگہ پہنچ کر رُکی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

مدتی بحران نے جہاں اُردو کے مسلّم ادیبوں کو خاص طور سے ترقی پسند ادب کے بعض اہم لوگوں کو بمبئی کی منڈی میں جمع کیا، وہاں تقسیم ہند اور دوسرے سیاسی اسباب نے یہاں کی ادبی مرکزیت کو کمزور کر دیا جس طرح طبقاتی نظامِ زندگی اپنے اندرونی تضادوں کا شکار ہوتی ہے تو سنکٹ میں پھنس جاتی ہے۔ اسی طرح اردو ادب کو اِن تضادوں کا شکار ہونا پڑا ہے۔ اور وہ تھکا تھکا سا ہے۔

اُردو ادب کیلئے نئے سال کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک طرف تو تقسیم ہند کے ان خارجی عناصر کا اثر کم کیا جائے۔ اس خلیج کو کم کیا جائے جو بورژوا سیاست نے دونوں ملکوں کے ہم زبان اور ہم ادب عوام کے درمیان پیدا کر دی ہے۔ دوسری طرف ادبی مرکزیت کو بحال کرنے کی تدبیریں کی جائیں۔ الگ الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بنانے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ تعداد میں کم مگر ستے، اچھے جاندار اور کثیر الاشاعت رسالے شائع ہوں جو ایک دوسرے سے رقابت کے بجائے ایک دوسرے کی مدد کریں۔ بلکہ نقل وحمل کی دشواریوں کا توڑ کرنے اور مرکزیت پیدا کرنیکے لئے اور بہتر ہوگا کہ ایک ہی رسالہ بہ یک وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں مقامات سے شائع ہو۔ اور ایک ہی مصالحہ اس میں شائع ہو۔

ہندوستان اور پاکستان کے چند اشاعتی ادارے آپس میں معاملہ کر لیں۔ اُس لعنت کو روکیں جو دونوں جگہ پھیل رہی ہے کہ کھلے عام مصنف کو حقِ اشاعت دیئے بغیر اِدھر کی کتاب اُدھر اور اُدھر کی کتاب اِدھر فرضی ناموں سے چھپ رہی ہے۔ اور سب بے بسی سے دیکھ رہے ہیں پبلشر بازار کے سکڑ جانے سے اتنے سہمے ہوئے ہیں کہ نئے مصنفوں اور نئی کاوشوں کیلئے تو چھاپتے نہیں یا چھاپتے ہیں تو پھیلا نہیں پاتے۔ اور نامور یا مقبول مصنفوں کو تھم تھم کر چھاپتے ہیں تو سرحد پار آگے آدھے قدر دانوں کو نہیں بیچ پاتے کیونکہ وہاں وہی کتاب کسی فرضی پبلشر کی طرف سے چھپ جاتی ہے۔ منٹو، کرشن چندر، عصمت، شفیق الرحمٰن ـــــ اور حد یہ کہ غالبؔ و اقبالؔ کو اس لعنت میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ ادیب اور پبلشر کا یوں سہم جانا اور تقسیم ہند کے ان دور رس اثرات کا مقابلہ نہ کرنا بھی اُردو ادب کی حرکت و رفتار میں حائل ہو رہا ہے۔ جب کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین اور خواجہ احمد عباس کے سودے بن بیچے پڑے ہوں اس وقت نئی نسل کا ابھرنا اور جدید سے جدید تر ادب کی تحریک ہونا تو دور کی بات ہے پرانی نسل کے مسلّم ادیب کا صرف ادب پر آنکھیں ٹِکانا مشکل ہوتا ہے

اگر ایک ہی نام اور ایک ہی ادارے کے یا متحدہ اور مشترکہ ادارے کے دو دو رسالے یا کتاب گھر الگ الگ دونوں ملکوں میں قانونی رکاوٹوں سے بجلگہ جاری نہ ہو سکیں تو کم از کم یہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ سرحد کے اس پار اور اُس پار کے دو دو رسالے یا ادارے آپس میں معاہدہ کر لیں کہ وہ ایک ساتھ ایک دوسرے کا میٹریل چن کر چھاپیں گے۔ مثلاً ادبِ لطیف اور شاہراہ یا نگار اور افکار یا سویرا اور نقوش اس طرح کے معاہدے کر سکتے ہیں۔

اس قسم کے معاہدوں سے جہاں اُردو ادب کا پھیلاؤ بڑھے گا، مرکزیت قائم ہونے میں مدد ملے گی، وہاں اشاعتی سنکٹ کا بوجھ بھی کچھ نہ کچھ کم ہوگا۔ اور پبلشر زیادہ اطمینان اور یقین کے ساتھ نئے ادیبوں کو اور نئے ادب کو سامنے آنے کا موقع دے سکیں گے۔ اور تازگی اور تنوع کی ایک مادّی صورت نکلے گی۔

(۳) ابھی اس کا پورا اندازہ نہیں لیکن آگے چلکر سب کو محسوس ہوگا کہ اردو ادب کے جمود کو قیلے بنے جا رہے ہیں اس کے اثرات کیا کیا ہونے والے ہیں۔

اُردو ادب کے جمود کو اگر آئندہ توڑنا ہے تو نہ صرف یہ کہ ایسے ادارے اور رسالے قائم کرنے ہوں گے جن کے سامنے مصنوعی سرحد کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ بلکہ زبان وبیان کے معاملہ میں بھی چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

ابھی سے ایسے آثار ہیں کہ ہندوستان میں سنسکرت خیز ہندی اور پاکستان میں مصری عربی اور ایرانی فارسی کے الفاظ اصطلاحات اُردو میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ اگر چند سال یہ صورت جاری رہی یا زور پکڑ گئی تو ایک اُردو ہندوستانی اُردو ہوگی، دوسری اردو پاکستانی اردو ہوگی۔ اور دونوں میں بہت بڑا فرق نہیں ہوگا جو امریکہ اور انگلینڈ کی انگریزی میں یا عراقی اور مصری عربی میں پایا جاتا ہے بلکہ وہ فرق پیدا ہو جائے گا جو اُردو ادب میں تقسیم ہند کا عمل پورا کردے گا جس سے کسی بھی معاملے میں اردو ادب کو فائدہ نہیں ہوگا۔

پہلوانِ سخن ناسخ اور انکے لکھنؤ اسکول نے جو "تطہیر" اُردو کی شروع کی تھی اور جس کا خمیازہ ہمارے ادب کو یوں بھگتنا پڑا کہ وہ دیہات کی آبادی اور قصبات کے عام آدمی کی بولی سے دور ہوتا چلا گیا۔ اب بھی اس سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ اور اگر ہم جمود کے داخلی اور خارجی اسباب و امکان کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیں تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اُردو ادب کو سادگی کی طرف لانے اور قائم رکھنے کے لئے عام بولیوں کے الفاظ کو تو ضرور جگہ دیں مگر اُن کے دو قبیلے نہ بنائیں تاکہ ہندوستان کا اُردو ادب ہندوستان میں اور پاکستان کا اردو ادب پاکستان میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے۔ جب تک یہ حالات برقرار ہیں جمود کو توڑنے میں یہ کوشش بھی ہمارے کام کو آسان کرے گی۔ اور مرکزی اداروں اور مرکزی رسالوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کے ساتھ ہمیں اس پر بھی دھیان دینا ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان کا اچھا ادب ہر ایک رسالے میں برابر شائع ہو۔ اور نئے ادیبوں کو دونوں جگہ کے ادب دوستوں کے درمیان روشناس ہونیکا پورا موقع ملے۔

معاشی بحران اور تقسیم ہند کے دوررس اثرات نے دوسری ملکی زبانوں کے ادب کو بھی نقصان پہونچایا ہے۔ لیکن اُردو ادب کو سب سے بڑھ کر اس کا نشانہ بننا پڑا ہے مثلاً ہندی ادب کو آج اس درجہ گمبھیر جمود کا سامنا نہیں ہے اور نہ اس کے سامنے یہ تمام مشکلات حائل ہیں۔

ہم ایک حد تک ان اسباب کا مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن یہ ایک کٹھن کام ہے اور برسوں کا کام ہے جسے چھوٹے چھوٹے مفاد کو قربان کرکے ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔

(۴) چوتھا قابل ذکر سبب جو اُردو ادب کی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہے ہیئت اور موضوع کے مسئلہ کا پوری طرح صاف نہ ہونا ہے۔

ابھی جدید اُردو ادب ابتدائی تجربوں کے مرحلے میں تھا، ابھی ہمارا فنکار اور ہمارے اچھے اہل قلم اپنے اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا میں بھی پوری طرح توازن پیدا نہ کر پائے تھے، ابھی کونپل پھوٹ رہی تھی اور تناور درخت نہ بن پائی تھی کہ اس پر سیاسی موسم کی ناسازگاری ٹوٹ پڑی۔

جب کسی زبان کے ادب میں نئے موضوع داخل ہوتے ہیں تو ان کے لئے نئی ہیئتیں اور نئے معانی کے لئے نئی صورتیں بنتے بنتے اور پرانی صورتوں اور ہیئتوں کے نئے سانچوں میں ڈھلتے ڈھلتے کافی وقت لگتا ہے۔ کسی ایک اصطلاح یا ایک ترکیب کے مقبول ہونے اور پھیلنے میں ایک زمانہ لگ جاتا ہے۔ ایک تشبیہ یا استعارے کا روایت بن جانا اور کسی ادب میں کھپ جانا قرنوں میں ہی ممکن ہے۔ پھر ایک فارم اور اسٹائل کا۔ اس فارم یا اسٹائل کے مختلف پہلوؤں اور مختلف رنگوں اور مختلف درجوں کا ادب میں کھپنا تو نہ صرف یہ کہ ایک طویل زمانے کا تقاضہ کرتا ہے بلکہ لمبی مشقت ریاضت اور تجربہ در تجربہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق

نئے ادب میں چمک دمک اور کشش تو ضرور تھی لیکن اتنی توانائی نہ آئی تھی۔ ابھی اس پودے نے اتنی گہری جڑیں نہ پکڑی تھیں کہ مختلف موسموں کی آزمائشوں سے گذر چکا ہو۔ مختلف ہیئتوں کو تجربہ در تجربہ کی جن آزمائشوں سے گذر کر برقرار رہنے یا ختم ہو جانے کی طرف رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ترقی پسند یا تنزل پسند ہونے کی کسوٹی پر پورا اترنا پڑتا ہے۔ ہماری نسل کا جدید تر اُردو ادب ابھی ان تمام آزمائشوں سے پار نہیں اترا تھا کہ اسے ناسازی حالات نے گھیر لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ توانائی پھیل گئی۔ کچھ جدید تر ہیئتیں مثلاً آزاد نظم کی ہیئت جہاں تھی وہیں رک گئی اور صرف ٹکے بندھے سکّے چلنے لگے۔ جو نئے تجربے

اس میدان میں ہو سکتے تھے ۔ جو تازگی اور رنگارنگی برقرار رکھ سکتے تھے ان میں کمی آ گئی اور جو نئی ہیئتیں نئی صورتیں ہمارے ادب میں وارد ہو چکی تھیں ان میں نہ صرف یہ کہ ٹھہراؤ پیدا ہو گیا بلکہ ان میں سے صحیح اور غلط، کامیاب اور ناکام شاخوں کو الگ الگ کر کے تراشنے کا عمل پورا نہ ہو سکا ۔

عبوری دور میں اگر جدید اور جدید تر موضوعات کے ساتھ جدید اور جدید تر ہیئتوں اور صورتوں کو بار بار چھانٹا نہ جائے تو انارکی پھیل جاتی ہے اور وہ چمن بندی نہیں ہو پاتی جس سے ادبی ارتقا عبارت ہے ۔ اردو ادب میں کچھ یہی صورت پیش آئی ہے ۔ ابھی تک نہ تو جدید ادب میں ترقی پسند ادب کی روشیں مکمل ہو سکی ہیں اور نہ ترقی پسند ادب نے نئی روشیں بنائی ہیں ۔

اب بھی ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہر جدید کوشش ترقی پسند ہوتی ہے اور اس پھیر میں پڑ کر Fantasia قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں ۔ غزلوں میں ردیفیں بدل بدل کر یا ایک آدھ جدید لفظ گھٹا بڑھا کر سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند ادب بلکہ اردو ادب کو یہ ان کی دین ہے ۔ اور دوسری طرف ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دوسری زبانوں میں ہر نئی ٹکنیک ہر نئی فارم اور ہر نئے اسٹائل کو اس رخ سے دیکھتے ہیں کہ کہیں اس کے استعمال کرنے والے پر رجعت پرستی، انحطاط پرستی یا سرمایہ پرستی کا داغ دھبہ تو نہیں لگا ہے ۔ اگر کہیں ایسے ادیب یا مصنف کا نام ترقی پسند ادیبوں کی فہرست میں شامل نہیں ہے تو ہمارے ادیب ان کی لائی ہوئی ٹکنیک کو بھی رجعت پرست سمجھنے لگتے ہیں اور چھوت چھات برتنے لگتے ہیں ۔

ٹکنیک کوئی رجعت پرست نہیں ہوتی ۔ ہاں اس کے اپنے امکانات ہوتے ہیں ۔ سامرسٹ ماآم کے افسانوں یا ڈراموں کی ٹکنیک کو یکسر رجعت پرست کہنا ادب کی احاطہ بندی کر کے اپنے کواڑ بند کر لینا ہے ۔ ماآم کی ٹکنیک ادب کی ایک جدید ٹکنیک اور ایک مخصوص اسٹائل ہے ۔ اس سے فیض اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اس کا اسلوب محدود ہے ۔ اسمیں ایموشنل اور جوش و حرکت پیدا کرنے والے افسانے یا ڈرامے لکھنے کا امکان بہت کم ہے ۔ اسی طرح موپاساں یا او ہنری کے افسانوں کا معاملہ ہے جن کی مخصوص بناوٹ ہوتی ہے ۔ افسانہ اپنے اختتام کو چھوتے وقت ایک اچانک راز کا انکشاف کرتا ہے ۔ جس سے پورے افسانے کی گتھیاں سلجھتی ہیں اور پورے واقعہ کو اختتام کے نقطے سے دیکھنا اور سوچنا پڑتا ہے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس ٹکنیک سے فائدہ نہ اٹھایا جائے ۔

میراجی پر ان کے جنسی اور مبہم ادب کی وجہ سے انحطاط پرستی کا الزام ثابت ہوا تو اردو ادب میں ان کے لائے ہوئے اسٹائل کو رجعت پرست سمجھنے لگے ۔ حالانکہ میراجی نے اپنے گیتوں میں جو زبان استعمال کی تھی جو بحریں استعمال کی تھیں اور اپنے تنقیدی یا تشریحی مضامین میں جو انداز اختیار کیا تھا نفسیاتی الجھنوں کی تشریح چھوڑ کر اس کو چن کر الگ کیا جا سکتا ہے ۔ اور اسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے ۔

میراجی کا ذکر آیا ہے تو اس موقع پر ن ۔ م ۔ راشد کی جدید نظم کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا جنھیں منظر عام پر آتے ہی فیض اور کرشن چندر تک نے ایشیا کا بڑا شاعر کہا تھا لیکن اب ان کی تشبیہوں کو اور صوتی تجربوں تک کو بے رخی سے دیکھا جاتا ہے ۔ کیونکہ راشد کی ترقی پسندی سے جب ہم کھٹکے تو ان کے اسٹائل ان کی ٹکنیک اور ان کی اختیار کی ہوئی جدید وضع کو بھی ہم نے "مال غیر" سمجھ لیا ہیئت کے معاملے میں یہ چھوت چھات دراصل ہیئت اور موضوع کے گہرے تعلق کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے ۔ اور یہ غلط سوچ بھی اردو ادب کی تازگی اور تنوع میں، اس کے حرکت و ارتقاء میں حائل ہو رہی ہے ۔

جو لوگ اردو ادب کے موجودہ باسی پن اور بے تہ پن اور بے کیفی سے دل برداشتہ ہو رہے ہیں انکے سامنے ایک نیا سوال یہ بھی ہے کہ ٹکنیک اور فارم کے معاملے میں اس چھوت چھات کے خلاف ہلہ بولیں اور ہر ایک ٹکنیک کو آزما کر دیکھیں کہ وہ کس موضوع کو کس قسم کے موضوع کو کتنی دور تک لے جا سکتی ہے اور کتنی دور لے جانے سے قاصر ہے تاکہ اس مخصوص فارم کو اور ٹکنیک یا اسٹائل کو صرف اسی کی حدود میں استعمال کیا جا سکے ۔

فن کے دوسرے شعبے

(۵) ایک اور سبب جو ہمارے جدید ادب اور خاص طور سے ترقی پسند ادب میں اس حالت کا ذمہ دار ہے جسے ہم "جمود" کے نام سے پکارنے لگے ہیں؛ وہ ہے ہمارے اہل قلم کی فنونِ لطیفہ سے بے خبری۔

ادب بھی ایک فنِ لطیف ہے۔ اور تہذیب کا ایک پروان چڑھا ہوا شعبہ ہے۔ لیکن تہذیبی خاندان کے دوسرے فنون بھی ہیں جن سے ادب کا گہرا رشتہ ہے۔ مثال کے طور پر موسیقی، اور موسیقی بھی قدیم موسیقی۔ جدید موسیقی۔ پیچیدہ کلاسیکل موسیقی اور عوامی موسیقی۔ اسی طرح مصوری۔ مصوری کے بھی مختلف سکول اور مختلف تجربے۔ پھر رقاصی اور اس کے مختلف طرز جن سے ہمارے اکثر ادیب بے بہرہ ہیں اگر ان سے بھارت ناٹیم یا لپیٹ کا ذکر کیا جائے تو بہت ایسے ملیں گے جو سوچیں گے کہ یہ ریس کے کسی گھوڑے کا نام ہے۔ یا اسٹنٹ فلم کا۔

جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اردو ادیبوں کی بڑی تعداد ادب میں جمود کی بحث پر یہ بات پڑھ کر بھڑک اٹھے گی۔ لیکن کل جب ادب میں جمود ہونے کی سبیل عام ہوگی۔ حالات پلٹا کھائیں گے اور فن و ادب کی نئے سرے سے تنظیم ہوگی، اس وقت یہی ادیب اپنی اس بے خبری پر افسوس کریں گے اور ان سے یہ روایتی غفلت دور کرنے کا تقاضا کیا جانے لگا۔

صرف شاعری کا نہیں بلکہ ادب کی دوسری اصناف کا بھی، مصوری، موسیقی اور رقص سے قریبی یا دور کا تعلق ضرور ہے۔ ہمارے جن بزرگوں نے شاعری کی مختلف اصناف کو آگے بڑھایا وہ اپنے اپنے زمانے کے فنونِ لطیفہ کی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ انیس کا مرثیہ صرف عقیدت کی پیداوار نہیں ہے، انیس اپنے زمانے کے فن حرب اور فن موسیقی سے بھی واقف تھے۔ میر اور نظیر اور آرزو لکھنوی اور عظمت اللہ خاں نے جو بحریں اردو زبان کو دی ہیں اور جن بحروں کو مقبول عام بنایا ہے وہ اس میں کبھی کامیاب نہ ہوتے اگر موسیقی کا درست مذاق ان میں نہ ہوتا۔ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادیب بھی اپنے ہاں کی موسیقی، مصوری وغیرہ کا ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے انھیں شاعرانہ موسیقی، شاعرانہ مصوری، نثر کی محاکات لفظوں کے انتخاب اور مختلف ماحولوں کی تصویر کشی میں۔ تاثیر پیدا کرنے میں فارم کے نئے تجربے کرنے میں مدد ملتی ہے۔

فنون لطیفہ کا ایک دوسرے سے ایسا گہرا رشتہ ہے کہ ایک شعبہ کی تربیت اور ایک شعبے کا علم و خبر دوسرے میں کام آتا ہے۔ اور ادیب کے مذاق کو، اس کے حسن وجمال کو اور اس کی بیانیہ صلاحیت کو نکھارتا ہے۔ ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ اس درجہ واضح حقیقت ہے کہ مجھے یہاں دوسرے مارکسی نقادوں خصوصاً کاڈویل، ٹھامسن، رالف فاکس یا سڈنی فنکل اسٹین وغیرہ کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہوئی جنھیں میں گواہ کے طور پر پیش کر سکتا ہوں۔

اگر ہمارے ادیب اسے مان لیں اور اپنی اس "بے نیازی" کو دور کریں (مقصد یہ نہیں کہ اسٹیج سے شعر سنانے کے بجائے منی پوری ڈانس شروع کر دیں بلکہ منی پوری ڈانس کی ٹکنیک اور دوسرے رقصوں کی ٹکنیک کا فرق نظریاتی طور پر معلوم کر کے اس سے حرکات اور ادا اور اشاریت کے مختلف درجوں کا اندازہ لگائیں۔ حسن جمال کو صیقل کریں اور اپنے محاکاتی اور فنی شعور کو اور شاداب کریں) تو یہ چیز خود ان کے یہاں ہے۔ چاہے وہ نثری ہو یا شعری، مفید ثابت ہوگی اور تنوع، رنگا رنگی اور تازگی کے گوشے نکالے گی۔

یہی صورت موسیقی کی ہے۔ بحریں صرف وہ نہیں ہیں جو اب تک اردو میں استعمال ہو چکی ہیں بحریں وہ بھی ہیں جو ساز کے مختلف نغموں سے ترتیب پاتی ہیں۔ ادھر ہندی ادب سے ہم "پنگل" لے کر استعمال کر چکے ہیں۔ اور جب ایک شاعر نے اسے آزمایا تو دیکھی بہت لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ پنگل میں انھوں نے بھی لکھا جو اس کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ لیکن اگر ہمارے شاعروں کو موسیقی کا شعور ہو تو شاعری میں نئی بحروں کے ساتھ ساتھ الفاظ کا نیا انتخاب نیا حسن پیدا ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے "پیامِ مشرق" میں نغمۂ ساربان یا ایسی دوسری نظموں میں جو بحریں اور ٹکنیک استعمال کی اس پر ہم اب تک سر دھنتے ہیں اور ان میں تازگی تنوع اور حسن پاتے ہیں۔ یہ حسن

اقبال پر الہام کے ذریعہ نازل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی بنیادیں دو باتیں۔ ایک اقبال کا راگ راگنی، سروں اور ستار سے ایک حد تک واقف ہونا، دوسرے ان کا تاجکستانی شاعر ابوالقاسم لاہوتی اور علامہ ابوالمعانی کے طرز ادا سے اکتساب کرنا۔ افسوس ہے کہ ان شعراء کے کلام ہندوستان اور پاکستان میں نہیں ورنہ لوگوں کو پتہ چلتا کہ اقبال نے ادب کے لئے کن کن سرچشموں پہ رجوع کیا ہے۔

یہاں میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پرانے ادیبوں کی ایک اچھی روایت تھی جس سے ہم کٹتے چلے گئے ہیں اور ہم صرف ادب پڑھ لینے اور ادب لکھ لینے کو کافی سمجھنے لگے ہیں حالانکہ ادب خود اپنے خاندان کے دوسرے افراد (فنون لطیفہ) سے نہیں کٹتا ہے اور فیض اٹھاتا اور فیض پہنچاتا رہتا ہے۔

اگر دوسرے فنون لطیفہ کی طرف سے ہماری "بے نیازی" اور بے خبری کا افسوسناک ذہنی رویہ بدل جائے تو اس طرح ایک در وا ہو کھلے گا ہمارے جدید تر ادب میں تازگی، قوت، حسن اور رعنائی آئے گی۔

پرانے اور نئے فارم

(۶) یاسیت، افسردگی، یکسانیت، بے تہہ پن کی صورت حال کچھ اس وجہ سے بھی بڑھ رہی ہے کہ جو اصناف ادب، سماج میں جدید ترانے کی پیش روی اور اس کا اعلان اور اس کی ترجمانی کرتی ہیں وہ اپنی جگہ اٹکی ہوئی ہیں اور ہمارے ادیب کو کوئی نہیں جھنجھوڑتا کہ وہ دوسری طرف بھی توجہ کرے۔

ہمارے جدید ادب میں اگر کوئی صنف ذرا تیزی سے چلی اور پنپی تو وہ مختصر افسانہ ہے۔ لیکن گیت، مثنوی، بیانیہ نظم، رزمیہ، ڈرامے، معرا نظم، ناول ڈرامہ، خاکہ، طنزیات، تاثرات، ذاتی مضامین Fantasia اور علمی مضامین کے میدان اسی طرح خالی ہیں جس طرح بظاہر بھرے بھرے نظر آتے ہیں۔

انگریزی ادب میں ایمرسن کے مضامین، باسول کی سوانح نگاری، ڈاکٹر جانسن کی زنگارنگی۔ عربی ادب میں طہٰ حسین، جرجی زیدان کے مضامین، خلیل جبران کے تاثرات کی ایک جگہ ہے۔ پھلی پھولی زبانوں میں جہاں قدیم ادب کے تناور درختوں کی آبیاری ہوتی رہتی ہے وہاں ان کے سہارے جدید بیلیں بھی اٹھائی جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں زندگی میں جتنی بے چینی بڑھتی جاتی ہے ادب میں اسی قناعت سے کام چل رہا ہے اور اس قناعت پسندی کی فضا طاری کرنے میں ایک بوڑھی ٹانگ اور ایک نوجوان خوردہ فروش کا بڑا ہاتھ ہے۔ میرا مطلب ہے غزل اور مختصر افسانے سے۔

جن لوگوں میں شعر کہنے کی صلاحیتیں ہیں وہ غزل پر اکتفا کرنے لگے ہیں۔ بہت ہوا تو نئی ردیفیں چھانٹ لیں۔ میر نہیں تو مومن یا حسرت کی پیروی کر لی۔ پرانے طرز سے اور کسی قدر زیادہ مترنم بحروں سے کھیل لئے۔ زیادہ بڑھے تو جدید تصورات کی علامتوں اور اشاروں کو سو طرح سے باندھ لیا کہ اسپ تازی نہ سہی سرکس کا گھوڑا تو ہے۔ فراق، جگر، جذبی، عدم، قتیل، سیف اور مجروح جیسے خوش گو شاعروں کی مقبولیت نے تو دوسرا اچھا کہنے والوں کو در غلایا ہی تھا لیکن مشاعروں کی واہ واہ، ڈرائنگ روموں کی "مکرر ارشاد" اور غور و فکر کی ذمہ داری سے گلو خلاصی نے پرانے پرانے لوگوں کو بھی اس ڈھرے پر لگا دیا ہے۔ حد ہے کہ آل احمد سرور جیسے تنقید نگار بھی غزل کے چکے میں آ گئے ہیں۔

میں آخری آدمی ہوں جس پر غزل دشمنی کا الزام دلیری کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک بار سے زیادہ غزل کے زندہ رکھے جانے کی حمایت کی ہے (اور اگرچہ یہاں نظم و غزل کی بحث چھیڑنا مقصود نہیں) لیکن پچھلے تین یا چار برس سے اردو کے اچھے رسالوں میں غزلوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور غزل گویوں کے بڑھتے ہوئے نام دیکھ کر غالب و حالی وہ شکوہ یاد آ جاتا ہے جو انھوں نے غزل سے کیا تھا۔ اور اس کا سبب بھی روشن ہوتا ہے۔ حالی خود بڑی اچھی غزل کہتے تھے لیکن انھیں غزل سے جہاد اسی لئے

شاہراہ

کرنا پڑا کہ اس کے امکانات جو بھی ہوں لیکن اس کا سب سے بڑا امکان یہ ہے کہ وہ فراریوں کی پناہ گاہ اور تھکے ہوئے مسافروں کا نہاں خانہ بن جاتی ہے۔ نہاں خانے کی بھی ضرورت آدمی کو ہوتی ہے لیکن ادب پر ایسا وقت بھی آیا ہے جب اس نہاں خانے پر دھاوا بولنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے صنفِ نظم کے دشمن نہیں ہیں تو ہمیں شاعروں کے بازو کھینچ کر غزل کے نہاں خانے سے انھیں نکالنا ہوگا۔

مختصر افسانے میں افسانہ نگاری کی اچھی اچھی صلاحیتیں جذب ہوئی جا رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارا مختصر افسانہ ہندستان کی ہر دوسری زبان کے مختصر افسانے سے گزبھر اونچا ہو گیا ہے [1]۔ لیکن ناول ڈرامے نثر پارے نظریات اور نثر کے دوسرے اصناف پڑھے سوکھ رہے ہیں انھیں کوئی پانی نہیں دیتا۔ جو لوگ ادھر متوجہ ہوئے تھے وہ بھی منی کاٹ رہے ہیں۔ ڈرامے کی تہی دامنی موجودہ حالات میں ——— جب کہ اسٹیج کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور بھی دردناک ہے۔

کچھ اس سلسلہ میں قابلِ قدر ادبی رسائل کی بھی ذمہ داری ہے۔ جنھوں نے طبِ یونانی کا سا نسخہ تجویز کر رکھا ہے کہ چھ ماشہ مقالہ (ادبی تنقید) چھ ماشہ اڈیٹوریل اور تبصرے دو تولہ افسانے دو تولہ غزلیں، ایک تولہ نظم کوٹ چھان کر اور اچھے گڈ آب کا خمیرہ ملا کر پی جائیں بفضلِ اللہ شفا دے گا۔

اس نسخے نے مریض کی حالت اور خراب کر رکھی ہے۔ اگر ہمیں اردو ادب کی نشوونما اس کی تازگی، فراوانی، گہرائی اور گیرائی عزیز ہے۔ تو ہمیں اس نسخے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دینا پڑے گا۔

اگر کوشش کی جائے اور جو لوگ ایک آدھ بار ڈرامہ نگاری کی صلاحیت کا ثبوت دے چکے ہیں مثلاً جدید لوگوں میں اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مرزا ادیب، بلونت سنگھ گارگی، حبیب تنویر وغیرہ ان سے خوشامد در آمد کر کے، ڈانٹ ڈپٹ کر ڈرامے لکھوائے جائیں۔ نئے لوگوں کے اچھے برے ڈرامے چھاپے جائیں۔ ان کی ہمت افزائی کی جائے ان کا چرچا کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ صنفِ ادب یوں پیاسی رہے۔

اسی طرح جنھوں نے منہ چھپانے کو ہی دوسری اصناف کی طرف توجہ کی ہے، انھیں پورا موقع ملے اور انھیں وقت کی ایک اہلی ضرورت سمجھ کر ہی قبول کر لیا جائے۔ ان کی اشاعت کی جائے تو ہریالی کا علاقہ بڑھے گا اور افسردگی، اکتا دینے والی یکسانی اور بے رنگی کی فضا ختم ہونے میں مدد ملے گی۔

اگر ہم نئے سال کی اشاعتی پروگرام میں اس سوال کو بھی داخل کریں تو اس کا حاصل اٹھانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

مطالعہ اور مشاہدہ

ہمارے ادب میں جمود کی شکایت زیادہ تر ان لوگوں کے لبوں سے سنی جاتی ہے جن کا اپنا شعور اپنا مطالعہ اور مشاہدہ تو مناسب رفتار سے بڑھ رہا ہے لیکن ان کے سامنے جو جدید ادب کی پیداوار آ رہی ہے اس کی کوالٹی اس کا دست اسی رفتار سے نہیں بڑھ رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا شکوہ اپنے اندر ایک منطق رکھتا ہے۔

جو لوگ خود کو ترقی پسند نہیں کہتے تھے اور آج بھی نہیں کہتے وہ بھی اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ ادب کی پیداوار میں وسیع سے وسیع تر مطالعے کی اور گہرے سے گہرے مشاہدہ کی کتنی زبردست اہمیت ہے۔

مطالعے کو مشاہدے اور مشاہدے کو مطالعے سے خوراک ملتی ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے گہرے ہوتے ہیں اور پھیلتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مطالعہ کا تعلق کتاب یا حرفِ مکتوب سے ہے اور مشاہدے کا زندگی اور سماج کے اندرونی جوڑ دیکھنے برتنے اور چھاننے بیننے سے ہے۔ مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں کے ادب اور اصنافِ ادب کو غور سے دیکھیں اسے ہضم کریں۔ اس کا صحیح ذوق پیدا کریں اور اسے اپنی کاوشوں کے لئے استعمال کریں۔ اس کے لئے سنجیدہ اور وزنی

ادارہ

[1] اس بیان میں ظ۔ انصاری صاحب سے سہو ہوا ہے۔ کم از کم بنگالی کے مختصر افسانے اردو سے بہتر ہیں۔

ادب کے اُردو ترجموں کی رفتار تیز کرنا پڑے گی۔

مشاہدہ کے لئے روزمرہ کی زندگی میں سماج کے دبے کچلے عوام کی تفصیلی زندگی میں چلنے پھرنے رہنے بسنے اور اپنے یگانگی کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اب اس طرف سے دیکھئے تو ادب کے جمود کا سبب ادیب کے جمود میں نظر آئے گا۔

شروع شروع میں جس وقت "حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں" کا نعرہ چلایا تھا تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے ادب کے مختلف اصناف میں کیسی جان پڑی تھی۔ کیسا جوش و خروش پیدا ہوا تھا۔ پچھلے پچاس برس اس کے گواہ ہیں اور ابھی پندرہ برس پہلے مطالعے کے شوق نے جیمس جوائس، ڈی ایچ لارنس۔ ٹی ایس ایلیٹ، لوئی آراگوں آندرے ژید تک کی نقلیں شروع کر دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ انحطاطی ادب کی نقل بھی انحطاط پرستانہ ہوگی۔ چنانچہ ہمارے یہاں ایسے تجربے بھی ناکامی کی موت مر گئے۔ لیکن صالح ادب کی نقل ایک کامیاب تجربے کی شکل میں مقبول ہوئی۔ منٹو نے گورکی کے ترجمے کرتے کرتے ہمایہ مقبولیت حاصل کی۔ احمد علی اور کرشن چندر نے چیخوف کا تجربہ اتارنے میں ہی اپنا ایک مستقل انداز اختیار کر لیا۔ ابھی کچھ روز پہلے امن پر پابلو نرودا کی نظم اور والٹ وہٹ مین کی نظموں سے رنگ و بو لے کر سردار جعفری، جاں نثار اختر لدروامق جونپوری نے پسندیدہ آزاد نظمیں لکھیں۔ میرا جی اور راحت ماکاؤں کے گیت اور عوامی نغموں Folklores کا مطالعہ کر کے سید مطلبی نے ہیا ہیا جیسے گیت لکھے۔ گاؤں گاؤں کے گیت جمع کر کے دیوندر ستیارتھی نے انھیں افسانوی جامہ پہنایا اور نیا ذخیرہ دیا۔

ہمارے ادیبوں پر دوسری زبانوں کے صالح ادب کے مطالعہ کی اہمیت بار بار واضح کی جانی چاہیئے تاکہ محض اپنے انداز بیان پر تکیہ کر کے اپنی اور اچھے اُردو ادب کی رفتار ترقی نہ روک لیں۔

لیکن مشاہدہ بھی برابر کی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہم بھی آخر سماج کے ایک طبقہ میں پیدا ہوئے ہیں اس طبقہ کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں اور جسے ہم جانتے ہیں اسی کے بارے میں لکھنے کی ذمہ داری ہم پر آتی ہے۔ دراصل اپنے سماجی اور ادبی فرائض سے جان چھڑانا ہے ـــــ ایک طویل بحث کو صرف دو جملوں مختصر کرنے کیلئے میں کہونگا کہ اگر اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گرد و پیش کے مشاہدے پر مطمئن ہو جانیکی اس دلیل کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی ہیں کہ ہم اپنے راہبروں سے منکر ہیں۔ گورکی، ٹالسٹائی، فلابیر، وہٹ مین، ہاورڈ فاسٹ، ایلیا آیرن، میرگ اور تیسوتن زادہ کے منکر ہیں۔ بلکہ اپنے ادب کو وہیں روک کر اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا چاہتے ہیں۔ جب یہ طبقاتی سماج ٹوٹ چکا ہوگا۔ اور محنت کشوں کے بیٹے آرٹ اور کلچر کے ادارے چلا رہے ہوں گے اور جن جن طبقوں سے وہ خود آتے ہوں گے ان کی زندگی کو ادب میں لا رہے ہوں گے۔

ادب میں ابہام کے فرسودہ تصور کو توڑ کر مطالعہ اور مشاہدہ کی اہمیت پر ہر پہلو سے زور دینا چاہیئے اور ایسے موقعے نکالنے چاہئیں جن سے ہمارے ادیبوں پر دیسی بدیسی ادب کے مطالعے اور مختلف طبقات کی اندرونی زندگی کے مشاہدے کی ضرورت کھلتی جائے۔

یہ سوال اتنا نیا نہیں ہے لیکن پھر بھی اردو ادب کو موجودہ گھٹن حالت سے نکالنے کے لئے فوری تدبیر چاہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ان تدبیروں کے اختیار کرنے سے یہ دور جس سے اُردو ادب گذر رہا ہے ختم ہو جائے اور فوراً عظیم ادب پیدا ہونے لگے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ادبی فضا میں زندگی اور چہل پہل پیدا ہوگی۔ اور عظیم ادب کی تخلیق کے لئے زمین تیار ہوتی چلی جائے گی۔

سید احتشام حسین

جوش کا نظریۂ شاعری

"شکستِ زنداں" اور "شکستِ زنداں کا خواب"

(۱)

یہ بات ہر شاعر نے ضروری نہیں سمجھی کہ فنِ شاعری کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بھی نظم یا نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ شعر کے حسن و قبح، اسلوب اور انداز، مضمون اور موضوع کے متعلق اُس نے جو کچھ کہا ہو وہ مکمل طور پر اُس کی شاعری پر بھی صادق آتا ہو یا مکمل طور پر اُس نے اس کی پیروی بھی کی ہو تاہم جب کبھی کسی شاعر کے یہاں شاعری کے اصول اور فن کے متعلق رائے ملتی ہیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ انھیں یکسر نظر انداز کر کے اس کے نظریۂ شاعری سے بحث کی جائے۔ ممکن ہے کہ وہ خود اپنے اصولوں کا پابند نہ رہ سکا ہو یا قول و عمل میں مطابقت سے قاصر رہا ہو یا اپنے خیال میں وہ نظریہ سے مطابقت پیدا کر لیتا ہو لیکن دوسرے لوگ اسے نہ سمجھ سکتے ہوں تاہم اس طرح کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے کی کوشش رائگاں نہیں کہی جا سکتی۔ لاشعوری اور تحت نفسیات کے ماننے والے بعض انتہا پسند ناقد اور سخن فہم اس بات پر اصرار کریں گے کہ یہ طریق کار بے سود ہے کیونکہ فنکار اور شاعر جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے اور کیوں کہتا ہے لیکن اس وقت اس پہلو سے بحث نہیں، بحث صرف اس سے ہے کہ اگر کوئی شاعر فنِ شعر یا موضوعِ شاعری کے بارے میں کچھ کہتا ہے تو اسے "راز درونِ خانہ" سمجھ کر اہمیت دینا ضروری ہے۔ جو سینے فن کی آگ میں تپتے رہے ہیں جو دلِ تخلیق کی لگن میں دھڑکتے رہے ہیں۔ اُن کی آواز یقیناً وزن اور وقار رکھتی ہے تاہم یہ بھی درست نہ ہوگا کہ غور و فکر کے بغیر اس آواز کو کبھی "غلط آہنگ" نہ رکھنے والی آواز سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اقبال نے بھی اپنے دو شعروں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا ؎

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اور ؎

کرمک شب تاب است شاعر در شبستانِ وجود
در پر و بالش فروغے گاہ ہست و گاہ نیست

کبھی کبھی غلط آہنگ ہو جانے اور کبھی کبھی پر و بال کے بے فروغ ہو جانے کی صورت ایک پیچیدہ نفسیاتی عقدہ ہے جس کے سلجھانے کے لئے کسی شاعر کے مزاج اور شعور کی تشکیل کرنے والے تمام کڑیوں کا جاننا ضروری ہوگا۔ جس طرح خیال کے اظہار میں غلطی ہو گئی ہے اسی طرح جذبات کے اظہار میں بھی ہو سکتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے شعر اور شاعر کی تنقید ایک بامعنی بات بنتی ہے ورنہ بعض شاعروں اور ان کے ہم نوا ناقدوں کا تو خیال ہے کہ شعر کی تنقید ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ شاعروں اور نقادوں دونوں کے نقطۂ نظر سے برابر زیرِ بحث آ چکا ہے لیکن اس نے ہمیشہ الجھن اس لئے پیدا کی ہے کہ غلطی سے لوگوں نے دونوں کے دائرۂ شعور کو بالکل الگ الگ سمجھ لیا ہے۔

حالانکہ فرق نقطۂ نظر اور اختلافِ شعور کا نہیں ، طریق کار کا ہوتا ہے ۔ شاعر اور ناقد دونوں برابر ایک دوسرے کی دنیا میں داخل ہوتے رہتے ہیں ۔ اور کیوں نہ ہوں ، دونوں حقائق کی ایک ہی دنیا کے باسی ہوتے ہیں ۔ دونوں فن اور ہیئت کے بعض اصولوں ، تاثر اور تاثیر کے بعض پہلوؤں ، جانی بوجھی دنیا کے بعض تجربوں کا ادراک اور احساس رکھتے ہیں اور شاید (بہ اختلاف عقائد) شاعری سے ایک ہی کام لینا چاہتے ہیں ۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ شاعری ، شاعر اور ناقد کے متعلق اور ناقد ، ناقد اور شاعر کے متعلق اسی اشتراک کی بنیاد پر رائے دینے کا حق رکھتے ہیں ۔ جیسے ناقد اور ناقد کے درمیان ادب کی پرکھ کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے ۔ یا شاعر اور شاعر فن کے مختلف نظریات کے حامل ہو سکتے ہیں اسی طرح شاعر اور ناقد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے ۔ یہ اختلاف فن اور مواد دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے اس لئے اس "کاروبارِ ادب" میں بڑی وسعت ہے اور اس کی جانچ بھی وسیع النظری ہی کی بنیاد پر ہو سکے گی ۔ یہ وسیع النظری محض ذوق اور وجدان سے نہیں علم و آگہی سے پیدا ہوتی ہے ۔ اگر کوئی شاعر اس میدان میں آتا ہے تو اس کی ذمہ داریاں بھی وہی ہونگی جو ناقد کی ہوتی ہیں ۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اس وقت جوش ملیح آبادی کے بعض خیالات سے بحث مقصود ہے ۔

(۲)

جوش ملیح آبادی عصر حاضر کے سب سے بڑے اور سب سے اہم شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں کیونکہ انھوں نے فکر و فن کے اتصال کی کوشش کی ہے اور شاعری کو زندگی سے ہم آہنگ کیا ہے ۔ ان کے جذبات کی دنیا بڑی رنگین اور خیالات کی دنیا بڑی متنوع ہے اور یہاں اس کی جھلک پیش کرنا بھی ممکن نہیں ہے ۔ اس وقت محض یہ دیکھنا ہے کہ شاعری کے سلسلہ میں وہ جو خیالات نظم و نثر میں پیش کرتے رہے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور ان سے کوئی نظریۂ شاعری ترتیب دیا جا سکتا ہے ؟ لیکن قبل اس کے کہ جوش کے ادبی نظریہ کی جستجو کی جائے ، ان کی ایک نئی نظم "شکستِ زنداں" پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے کیونکہ یہی نظم اس مضمون کی محرک ہے اور یہی ان کے موجودہ خیالات کی ترجمان ہے ۔

"شکستِ زنداں" کے نام سے غلام ربانی تاباں نے موجودہ دور کے کئی شعراء کی سیاسی نظموں کا ایک انتخاب شائع کیا ہے جس کی تمام نظمیں ایشیائی ممالک کی تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں ۔ اُردو کے بائیس شعراء کی یہ چھتیس نظمیں نہ تو اس موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں اور نہ ان کا بہترین کلام کہی جا سکتی ہیں ۔ یہ تو شاعروں کا وہ خراجِ تحسین اور اظہارِ ہمدردی ہیں جو وہ ایشیا کے لیے برابر مختلف مواقع پر پیش کرتے رہے ہیں ۔ ان نظموں میں مکمل طور پر کسی عقیدے کا اظہار بھی نہیں ہے ۔ ان سے تو بس اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ شعراء صرف اپنی ہی نہیں ، اُن تمام قوموں کی آزادی کے متمنی ہیں جو اس کی جدوجہد میں مصروف ہیں ، ان کی نگاہ یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ اس آزادی میں روڑے کون اٹکا رہا ہے ، وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اب جو یہ قومیں آزاد ہوں تو یہاں منصفانہ نظامِ زندگی قائم ہو ۔ یہ ساری نظمیں جوش کے اس شعر کی تفسیر کہی جا سکتی ہیں ؎

یہ مشرق محو ہے صبحِ تجلی زار ہونے میں
یہ روحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

لیکن جب انھوں نے اس مجموعہ کو دیکھا تو انھیں اس میں اتنی فنی خامیاں نظر آئیں کہ خاموش نہ رہ سکے اور "خوردوں" کو "بزرگانہ" نصیحت دینے کی ضرورت کا شدید احساس ہوا ۔ اس جذبہ کے تحت انھوں نے "شکستِ زنداں" ہی کے نام سے ایک نظم لکھی جو ایک نوٹ کے ساتھ نقوش لاہور (دسمبر ۳۶-۳) میں شائع ہوئی ہے ۔ نظم سے پہلے جو نوٹ ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ جہاں تک ان نومشق اور نوخیز شعراء کا تعلق ہے ۔ ان کے عقائد سے اختلاف جوش کے نزدیک کفر ہے لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق ہے انھیں ان نو واردان کوچۂ شعر سے شدید اختلاف ہے ۔ ان شعراء کی فنی بیماریوں اور ادبی خامیوں کو دیکھ کر (حالانکہ عقائد صحیح ہیں) جوش

سے رہا نہ گیا اور انھوں نے سوچا کہ اگر بزرگ یونہی چپ سادھے بیٹھے رہے تو خود اپنا اور اپنی شاعری کا بیڑا غرق کر دیں گے۔ اس نظم کی بنا پر جوشؔ کو اندیشہ ہے کہ لوگ ان سے بدگمان ہوں گے اور انھیں مطعون کریں گے۔ لیکن ان کو رنج ہوگا اگر ان کی نیت پر شک کیا گیا کیونکہ انھوں نے ہمیشہ ان نوجوان شعراء کے مقاصد سے اتفاق اور ان کی ذات سے محبت کی ہے۔

ان پُر خلوص خیالات کے باوجود بعض اہم باتوں کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ یہ نومشق، نوخیز اور نوجوان شعراء کون ہیں؟ کیونکہ ان بائیس شعراء میں سے تقریباً نصف ایسے ہیں جن کی عمریں چالیس سال سے زیادہ ہیں۔ غلطیاں تو سبھی سے ہو سکتی ہیں لیکن "نئی نسل" "نسلِ تازہ" کے یہاں اسکا امکان زیادہ ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ صحت زبان و بیان کی طرف سے بعض شعراء بے اعتنائی برتتے ہیں اور ایسی غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں جس سے کسی زبان کی شاعری کا بیڑا غرق ہو سکتا ہے لیکن اُن غلطیوں کی طرف متوجہ کرنے کا جو طریقہ جوشؔ نے اختیار کیا وہ درست نہیں۔ طنز کے ملتے نشتران "نومشق" شعراء کے سینے میں توڑ دینا انھیں ان غلطیوں سے آگاہ نہیں کرتا کیونکہ اگر وہ غلطیوں سے واقف ہوتے تو ان سے بچنے کی کوشش ضرور کرتے۔ ساری نظم میں طنز ہی طنز ہے کوئی تعمیری یا تنقیدی اشارہ نہیں ہے۔ گو جوشؔ نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ ان نظموں میں بیان کئے ہوئے عقائد کو پسند کرتے ہیں اور عقاعد سے بحث نہیں ہے لیکن نظم کے کئی اشعار میں خیالات سے بھی بحث آگئی ہے اس کے باوجود نظم میں جو مرکزی خیال ہے وہ یہ ہے ؎

شاعری میں بیان ہے سب کچھ   کاش ہوتی یہ بات انھیں محسوس

اور یہی وہ خیال ہے جس سے اس وقت مجھے بحث کرنا ہے۔ ضمناً اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ جن شعراء کی نظمیں "شکستِ زنداں" میں شامل ہیں اُن میں سے اکثر سے میں ذاتی طور پر واقف ہوں اور اس واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ان سے کسی کو یہ دعوےٰ نہیں ہے کہ وہ "جالینوس" ہے اور کسی کو یہ ضد نہیں ہے کہ ملتے "قاموس" کہا جائے۔ رہ گئی یہ بات کہ ان نظموں میں شعریت نہیں ہے، بحر و ترکیب و لفظ و معنی و صوت۔ ناسزا، ناشگفتہ، نامانوس ہیں، جذبات ہیں تو بہت مگر جھوٹے ہیں۔ فکرِ سخن کو درد قولنج اور طرزِ کلام کو کابوس ہے، تو ان پر الگ الگ گفتگو ہو سکتی ہے۔ اگر جوشؔ نے چند اہم غلطیوں اور فنی خامیوں کی طرف یا انداز کلام کی بے مائگی کی طرف باقاعدہ متوجہ کر دیا ہوتا تو ان میں سے اکثر شعراء وہ ہیں جو اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود ان سے گہری محبت رکھتے ہیں، وہ ان کے مشورے اور اصلاح کو اپنی مستقبل کی کاوشوں کے لئے مشعل راہ بناتے اور غلطیوں سے واقف ہو کر آئندہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے لیکن کچھ بتانے کے بجائے جوشؔ نے انھیں محض "مینڈک" کہہ کر اپنی بزرگی کا فرض ادا کر دیا۔ پرانی نسل سے مایوس ہونے والا نئی نسل سے بھی مایوس ہو گیا۔ اس مینڈکوں کے جلوس میں فیضؔ، فراقؔ، سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، عرشؔ ملسیانی، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، روشؔ صدیقی، ساحرؔ لدھیانوی اور خود جوشؔ ہیں اور یہ سب جیسے بھی ہیں اُردو کے مایۂ ناز شعراء ہیں۔

جوشؔ کی شاعری اور خیالات سے ترقی پسند تحریک میں جو اعلانے ہوئے ہیں اور جدید شعراء نے جو فیض اٹھاتے ہیں ان کا صحیح اندازہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اُن کے ٹوک دینے، مشورے دینے، غلطی نکالنے پر شاید ہی کوئی بدگمان ہو لیکن بعض بے چین طبیعت رکھنے والے یہ سوال ضرور پوچھتے ہیں کیا "شکستِ زنداں کا خواب دیکھنے والا" "شکستِ زنداں" کی جدوجہد کرنے والوں کے خیالات، ولولہ اور عزم کے لئے ایک حرفِ تحسین بھی نہیں رکھتا؟ نظم کے لہجہ میں اس جذبہ کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی۔ جوشؔ کے لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ایشیا کی بیداری سے خوش نہیں یا ملکوں کی آزادی کی جدوجہد کا شعلہ ان کے سینے کو گرم نہیں کرتا۔ ان کی شاعری کا سارا آہنگ اور سارا فکری سرمایہ اس گرمی کا امین ہے اس لئے اس نظم میں اگر انھوں نے ان آزادی پسند شعراء کو سراہا نہیں تو یہ کوئی بڑی فروگذاشت نہیں ہے۔ اس کا مقصد ہی کچھ اور تھا تاہم اگر یہ تین شعر نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

وہ دو عالم کا شاعر یکتا   شعر میں گاتھے ہے جو چین و روس
ان کے ذوقِ سخن کی دنیا میں   صرف اک فصل ہے نہ ماہ نہ پوس

ایک ہی میکدے میں سب مدہوش　　ایک ہی دائرے میں سب محبوس

کیوں کہ ان اشعار نے مسئلہ کی نوعیت بدل دی اور اگر کوئی شخص یہ بحث چھیڑ دے کہ جن شعرا کا کلام اس مجموعہ میں شامل ہے ان میں سے کتنے ہیں جنھوں نے محض روس اور چین کو ایک ہی میں گا نٹھ دینے کو شاعری سمجھا ہے یا ایک ایسے مجموعے میں، جس کا موضوع معیّن ہے۔ ایک ہی قفس اور ایک ہی دائرے میں محبوس ہونے کے نظریے کیا مقصود ہے، تو بات کہیں سے کہیں پہونچ جائے گی۔ خود میں اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میں اس نظم کے صرف اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس میں شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نظم بہت اہم ہے۔ نثر سے قطع نظر، نظموں میں یہی وہ نظم ہے جس میں نقاد (فکر و نشاط اور سیف و سبو) کے بعد انھوں نے مکمل کر شعر کے متعلق کچھ کہا ہے۔ اب مجموعی طور پر جوشؔ کے ان خیالات پر نظر ڈالی جائے گی جن سے اُن کا نظریۂ شعر مرتب کیا جا سکتا ہے۔

(۳)

اُردو کے بہت کم شاعر ایسے ہیں جنھوں نے شاعری کے متعلق، مختلف پہلوؤں سے، اتنا کہا ہے جتنا جوشؔ نے۔ اگر کسی قسم کا تبصرہ یا تجزیہ کرنے کے بجائے صرف اُن کی تحریروں کے ضروری اقتباسات یکجا کر دیئے جائیں تو وہی بہت کچھ کہہ جائیں گے۔ اُن نظموں کو چھوڑ کر جن میں انھوں نے اپنے عقائد کا ذکر کیا ہے۔ اور وہ عقائد ان کے مذہبِ شعر گوئی پر بھی منطبق ہو سکتے ہیں، بہت سی نظمیں تمام و کمال ایسی ہیں جن میں شعر یا شاعر کا ذکر ہے مثلاً "شعلہ و شبنم" میں شاعرِ ہندوستان، غلامی سے خطاب، "فکر و نشاط" میں نقاد، بارگاہِ شعر، آوازِ شاعر، شاعر اور لیڈر، شاعر کا دل، دنیا اور شاعر، عالم اور شاعر، غزل گوئی، "حرف و حکایت" میں شعر کی آگ، شاعر کی بخششیں، شاعر و خدا، شاعر کا ایثار، "سرود و خروش" میں جلال و جمال۔ ان کے علاوہ نہ جانے کتنی رباعیوں میں، کتنی کتابوں کے تعارفوں اور مقدموں میں، رسالہ کلیم (دہلی) کے کتنے اشارات اور مضامین میں (جن میں سے اکثر اشارات مرتبہ نگارستان بک ایجنسی دہلی میں یکجا کر دیئے گئے ہیں) یہ خیالات بکھرے ہوئے ہیں۔ اکثر یہ خیالات ایسے شاعرانہ، جذباتی، وجدانی رنگ میں ظاہر کئے گئے ہیں کہ ان کی اصل اور حقیقت کے متعلق اختلافِ رائے ہو سکتا ہے۔ بعض نظمیں محض تعلّی آمیز اور فخریہ انداز میں شاعر کے منصب اور مرتبہ کا ذکر کرتی ہیں۔ ان میں جذبہ کی شدت کے مطابق خیالات جگہ پاتے گئے ہیں اور محض عارضی ہیجاناتِ شعری سے منسوب کرنے ہی سے اُن کا تضاد سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثلاً جہاں یہ خیال ملتا ہے کہ شاعری پیغمبری کا جزو ہے، وہیں یہ خیال بھی موجود ہے کہ شاعری عرش کی بازی گری یعنی پیمبری نہیں ہے۔ اوپر دیئے ہوئے نظموں کے عنوانات ہی سے معلوم ہوگا کہ زیادہ تر نظمیں شاعر سے متعلق ہیں، اُن میں فنِ شعر گوئی یا خصوصیاتِ شاعری سے بحث نہیں کی گئی ہے پھر بھی ان میں شاعر کی عظمت، اہمیت یا منصب کے متعلق جو اشارے ملتے ہیں ان سے مفید نتائج نکل سکیں گے۔

جوشؔ نے اس مسئلہ پر جو کچھ بھی لکھا ہے اگرچہ اس میں واضح طور پر شعر کی ہیئت اور ماہیت، موضوع اور مواد، فلسفۂ شاعری سے بحث نہیں کی گئی ہے، مختلف شعراء کے متعلق چند اشاروں کو چھوڑ کر تفصیل سے اظہارِ خیال نہیں کیا گیا ہے پھر بھی حسبِ ذیل مسائل جن کا تعلق براہِ راست شعر گوئی اور سخن فہمی سے ہے، بار بار نقادوں کے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ شعر اور شاعری سے کیا مراد ہے؟ شاعر کی کیا خصوصیات ہیں؟
۲۔ شاعر کس حد تک ماحول سے متاثر ہوتا ہے؟ کس حد تک اپنے وقت سے آگے ہوتا ہے؟
۳۔ لفظ اور معنی میں کیا تعلق ہے؟ کیا شاعری محض بیان ہے؟
۴۔ شاعر کس کے لئے کہتا ہے؟ ضرورت کے وقت شاعر کا فرض کیا ہے؟
۵۔ شاعر اور شاعری کی تنقید ممکن ہے یا نہیں؟

۶۔ مجموعی طور پر شاعری کے متعلق کیا نقطۂ نظر، ان مباحث کے بعد قائم کیا جا سکتا ہے؟

شاعری کیا ہے؟ اپنے مضمون غزل گوئی میں اس عنوان کے تحت لکھتے ہوئے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے ”شاعری جہاں آپ بیتی ہے وہاں جگ بیتی بھی ہے۔ شاعری اگر داخلی ہے تو خارجی بھی ہے۔ اس لئے اگر ہم شاعری کو حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی کا لقب دیں تو در اصل یہ حقیقت سے بعید نہ ہوگا“

ایک اور مضمون ”ہمارے شاعر“ میں یہ جملے ملتے ہیں۔ ”شعر کی بنیاد تو لامحدود اور عالمگیر محبت پر ہے“ ”شعر ایک ازلی عکس ہے“ ”یہ تو ایک معلوم عوام حد تک مانی ہوئی بات ہے کہ شعر سراسر ایک ذوقی اور وجدانی شے ہے۔ یہ کوئی مادّی چیز تو ہے نہیں کہ ہم اسے چکھ یا چھو سکیں۔ یہ کوئی نگینہ بھی نہیں ہے کہ کانٹے میں رکھا اور پل بھر میں وزن معلوم کر لیا۔“ جوش کے یہاں شاعر زیادہ تر تلمیذ رحمانی سے فیضیاب نظر آتا ہے، جس کے راستے کی شمع روح الامین کی سانس ہے اور جس کے قلب پر حسنِ ازل کی ضرب پڑ رہی ہے، جس کے دل پر الہام کی بارش ہوتی ہے اور جس کا ہم صفیر طائر سدرہ ہوتا ہے اس لئے اگر ان کے خیال میں شعر ایک ازلی عکس ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن اس کی تخلیق کا عمل جن صورتوں سے ہوتا ہے وہ انسے حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی کی شکل ہی میں پیش کرتی ہیں۔ خود انھیں کے الفاظ میں اس عمل کی شکل یہ ہے ”یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی میں آئے دن انسانی قلب پر جو اثرات پڑا کرتے ہیں وہ شعوری و غیر شعوری طور پر نوع انسانی کے افعال افکار اور اقوال کو مختلف سانچوں میں ڈھالا کرتے ہیں لیکن جب شاعر کے قلب پر یہی اثرات پڑتے ہیں تو ان کی کیفیت و شدت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ توپوں اور بادلوں کے گرجنے سے غیر شاعر پر وہ اثر نہیں پڑتا جو عینک کے تال پر ایک ذرّے کے گرنے سے شاعر کے دل پر ہوتا ہے۔ ہر وہ جذبہ خواہ دیکھنے میں کتنا ہی حقیر ہو، جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور ہر وہ اثر جو شاعر کے قلب پر پڑتا ہے وہ اس کے دل و دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جنبش کرنے لگتا اور اس کے خون میں شامل ہو کر اس کے ہر بُن مو میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے مشتعل سینے میں اس وقت تک برابر تڑپتا اور مچلتا رہتا ہے جب تک کہ اپنے بہ احسن الوجوہ اظہار کے لئے مناسب الفاظ اور موزوں بحر انتخاب نہیں کر لیتا اور مناسب الفاظ اور موزوں بحر، جیسے ہی اس کی گرفت میں آ جاتی ہے وہ شعر بن کر شاعر کے قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ شاعر جو کچھ دیکھتا اور سنتا، سونگھتا، چھوتا اور چکھتا ہے، جو کچھ اس پر گذرتی یا وہ دوسروں پر گذرتے ہوئے دیکھتا ہے، نیز جو کچھ بھی سوچتا، سمجھتا اور غور کرتا ہے، یہ تمام چیزیں اس کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی رہتی ہیں اور جلد یا بہ دیر پختہ و رسیدہ ہو کر شعر کا لباس اختیار کر لیتی ہیں۔ کبھی تو یہ عمل بجلی کی سرعت کے ساتھ واقع ہوتا ہے اور کبھی دیر لگ جاتی ہے لیکن .... ناممکن ہے کہ شاعر پر کوئی اثر پڑے اور وہ شعر بننے کے عوض خود اس کے دماغ میں کھپ کر رہ جائے اور اپنے پالنے ہی میں گھٹ کر مر جائے۔“

یہ طویل اقتباس تخلیق شعر کے متعلق کئی میکانکی اشاروں کے باوجود بے حد اہم ہے کیونکہ ان سطروں میں محض خیال آرائی نہیں ہے بلکہ تجربہ کی مادّی نوعیت، اس سے اثر پذیری اور اس کے اظہار کا ذکر ہے۔ بہت کچھ پیچیدہ ہونے کے باوجود فن کے یہی مدارج ہیں اس لئے تجربہ حاصل کرنے کی منزل سے لیکر اس کے جذباتی اور فنی اظہار تک کی منزل میں فن اور تنقید دونوں کے مدارج آ جاتے ہیں۔ جوش خود اپنی شاعری میں ان منازل سے گذرتے ہیں لیکن شاعر کے منصب کے متعلق ان کا مادرائے نقطۂ نظر انھیں محض تخیلی دنیا میں کھینچ لے جاتا ہے جہاں شاعر ایک مافوق الفطرت مخلوق بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جو کئی اور خیالات کی بنیاد بنتا ہے اور فنکار یا شاعر دوسرے لوگوں کے درمیان افہام و تفہیم کی خلیج وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس وقت تو ہمیں یہ معلوم ہوا کہ شاعر اپنی اور دوسروں کی زندگی کو دیکھتا ہے اور اپنے حواس خمسہ کی مدد سے حقیقتوں کا ادراک کرتا ہے، اس سے اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور یہ ہیجان اُسے شعر کہنے پر، اظہار خیال پر مجبور کرتا ہے۔ شاعر کا احساسِ فن مناسب الفاظ اور موزوں بحر کا انتخاب کر کے انھیں فن پاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ خیالات اور جذبات کے اس اظہار یا ترسیل میں شاعر کبھی کامیاب ہوتا ہے کبھی ناکام۔ ابھی خیال اور جذبہ کی صداقت، افادیت یا قدر و قیمت کی بحث نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ ”لفظ و وزن“ کے سانچوں میں ڈھل کر شعر اس حقیقت کی مصوری کرتا ہے یا نہیں جو شاعر کے تجربہ میں آئی تھی اور جس کے ہیجان نے

اُسے شعر کہنے پر مجبور کیا؟ ہم اسے مواد اور ہیئت، لفظ اور معنی کی بحث بھی کہہ سکتے ہیں۔ جوش نے اس پر بار بار کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن جس چیز پر انہوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ معنی کو الفاظ پر قربان کرنا پڑتا ہے، جذبہ کی شدت الفاظ میں نہیں ظاہر ہوتی۔ شعر شاعری کا اثاثہ نہیں ہوتا کیونکہ ؎

شعر کیا؟ جذبِ دروں کا ایک نقشِ ناتمام	مشتبہ سا اک اشارہ ایک مبہم سا کلام
کیف میں اک لغزشِ پا کلکِ گوہر بار کی	اضطراری ایک جنبش سی لبِ گفتار کی
ایک صوتِ خستہ و موہوم سازِ ذوق کی	مرتعش سی ایک آوازِ انتہائے شوق کی
بے حقیقت نے کے اندر زمزمہ داؤد کا	عارضِ محدود پر اک عکس لا محدود کا
ظلمتِ ابہام میں پرچھائیں تفصیلات کی	پیچ و خم کھاتے بگولے میں چمک ذرات کی
جھنے قدرت کی روانی دشت مصنوعات میں	ٹوٹتا رنگین ستارے کا اندھیری رات میں
شعر کیا؟ کچھ سوچنا دل میں بہ حسنِ دلنشیں	شعر کیا؟ ہر چیز کہہ کر کچھ نہ کہنے کا یقیں
شعر کیا؟ نیم بیداری میں بہنا موج کا	برگِ گل پر نیند میں شبنم کے گرنے کی صدا
بر زبانی اور خاموشی کی مبہم گفتگو	لفظ و معنی میں توازن کی نہفتہ آرزو

یہ صورت حال بہت سے سوالات پیدا کرتی ہے۔ کیا کسی خاص شاعر کی زبان یا کوئی خاص زبان اظہارِ جذبات میں ناکام رہتی ہے یا تمام شاعروں، تمام زبانوں اور تمام جذبات کا یہی حال ہوتا ہے۔ اگر کسی ایک یا چند کا یہ معاملہ ہے تو اسے قوتِ اظہار کی ناکامی کہہ سکتے ہیں اگر عالمگیر ہے تو لفظ اور معنی کے درمیان ایسا ہی رشتہ قائم ہوگا کہ جذبات کچھ ہوں اور اظہار کچھ، جذبات شدید ہوں اور اظہار کمزور۔ اور اسی کمزور شکل میں ادا کئے ہوئے جذبے کی ترسیل ہوگی۔ چونکہ یہ بات ہمیشہ ہوتی رہے گی اس لئے سامع اور ناقد پہلے ہی سے اس بات کیلئے تیار ہوں گے کہ شعر پڑھ کر جذبات محسوس کریں اُس سے کئی ہزار گنا پُر شور اور پُر زور شکل میں اُسے شاعر کے ذہن اور دل میں تصور کریں۔
ایک حد تک تو سبھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ بعض اوقات الفاظ جذبات کا ساتھ نہیں دیتے اور الفاظ میں جادو بھرنے کیلئے اشاروں، علامتوں تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اگر تجربے اور اظہار میں وہ بُعد ہو جس کا احساس جوش کو ہے تو پھر سارے فنونِ لطیفہ اور خاص کر شاعری کے متعلق نئے سرے سے غور کرنا پڑیگا کیونکہ جب الفاظ ساتھ ہی نہیں دے سکیں گے، اظہار کی ساری طاقت بیکار ہوگی تو شاعر کبھی یہ بتا ہی نہیں سکے گا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ ہر جذبہ گونگے کا خواب ہوتا، جب شاعر ہی بتا نہیں سکے گا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا تو پھر اسے کوئی سمجھے گا کیا، اسی وجہ سے تخلیق شعر کی یہ منطق جوش کو وہاں لے گئی جہاں اٹلی کا مشہور فلسفی کروچے دوسری راہوں سے پہونچا۔ یعنی وہ شعر ہے جو شاعر کے دل میں ہے۔ وہیں شاعری کی تکمیل ہوگئی جو باہر آیا وہ کچھ نہیں۔ اصل شعر اظہار کا محتاج نہیں بلکہ بقول جوش اگر اس کا اظہار ہوا تو شعر باقی نہیں رہے گا۔ نطق شاعری کے خانماں کو لوٹ لیتا ہے اور شاعری کی شراب جام میں آتے اُڑ جاتی ہے۔ مبالغہ آمیزی سے قطع نظر، جوش نے ایک لحاظ سے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ لفظ اور معنی میں کوئی حقیقی تعلق قائم ہی نہیں ہو سکتا، اس طرح شاعر اور دوسرے افراد میں جو رشتہ قائم ہوگا وہ برائے نام ہوگا۔ اور شاعری حیات کی مصوری اور زمانے کی تاریخ نویسی بے حقیقت ہوگی۔
ان خیالات کی روشنی میں جوش کا یہ مطالبہ کہ ؏ شاعری میں بیان ہے سب کچھ۔ اور یہ فیصلہ کہ ؎

خس نشیمن ہے عندلیب اگر اس سے بہتر گل آشیانہ خروس

یہ الجھن بھی پیدا کرتا ہے کہ ان کے یہاں خیال اور جذبہ کی عظمت اہم نہیں ہے۔ شاعری میں بیان بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں ہے۔ یہی وہ تصورِ فن ہے جس کی وجہ سے شاعری ترجمانِ حیات بننے کے بجائے محض لفظی شعبدہ بازی رہ جاتی ہے۔ اب اگر اسے جوش کے دوسرے خیالات سے ملا کر دیکھا جائے تو یہ مطلب نکل سکتا ہے کہ شاعری میں تو مضمون کا سوال ہی نہیں، انداز بیان ہی سب کچھ ہے اور انداز بیان کا یہ نقص ہے

کہ اس میں داخلی جذبات کی صلاحیت ہی نہیں۔ گویا یہی شاعری ہے۔ جوش خود اس نظریہ پر عامل نہیں ہیں لیکن اُن کا یہ نظریہ گمراہ کن اور غلط ہے اور فن کی ساری قوت اور حسن اور ضرورت کو منہ بند کر دیتا ہے۔ مثلاً یہ ہے کہ جوش شاعر کے فرائض اور شاعر کے اخلاقی مسلک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نوعِ انسان کو دوست اور ہمدرد رکھنا بھی فرض ہے۔ ان کے خیال میں شاعر بے زبانوں کی زبان بن جاتا ہے اور زندگی میں ناانصافی اور ظلم دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اس سے خدمت انسانی کی بہترین آرزوئیں وابستہ کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت دل و جان کی قربانی دینے پر آمادہ رہتے ہیں۔ انھیں ہندوستان میں بھوک کے ننگے ناچ نظر آتے ہیں، بیروزگاری دکھائی دیتی ہے، جہالت اور بیماری کے بھوت منڈلاتے نظر آتے ہیں، خود داری، اخوت، حریت کی ناؤ ڈوبتی نظر آتی ہے اور وہ شاعروں سے کہتے ہیں کہ اٹھو اور انسانیت کے کام آؤ۔ یہ سب فرائض کس نظریۂ شاعری سے پورے کئے جا سکتے ہیں، جوش نے ان کی توضیح نہیں کی ہے کیونکہ یہ ساری باتیں شاعری میں جگہ پا سکتی تو محض بیان کے دائرے سے باہر جا پڑے گی۔ الفاظ ہی کام آئیں گے لیکن یہ وہ الفاظ نہیں ہوں گے جو مافی الضمیر کے اظہار پر قادر نہیں ہیں بلکہ وہ ہوں گے جو ذہنی حیات ہیں، جو انسان و سماج کے مختلف عناصر میں رشتہ کا کام دیتے ہیں ــــ ان الفاظ کا جو تعلق شاعر سے ہے جوش نے اُن کا بہت ہی دقّت نظر سے بیان لپنے ایک مضمون "الفاظ اور شاعر" میں کیا ہے۔ جو شاعر بیان کی اہمیت کا منکر ہوگا۔ وہ شاعر نہیں ہوگا، جو اس کے لئے بیان نہیں کرے گا وہ فن سے نابلد ہے گا لیکن جو محض بیان کو شاعری قرار دے گا وہ دوسروں کے شعور میں وسعت اور گہرائی نہیں پیدا کر سکے گا۔ جوش کی تصوریت اور جذباتیت ان کے یہاں یہ تضاد پیدا کرتی ہے کہ وہ شاعری سے حیات کی مصوری کا کام بھی لینا چاہتے ہیں اور اسے محض رموز اور وجدانی چیز بھی قرار دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے لپنے اور لپنے ملک ہی کے لئے کہا ہے ؎

کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے ۔۔۔ لایا ہوں وزن و شعر کی ادبستاں میں ڈھالکر

انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ذہنی انقلاب کا سرچشمہ قوموں کے ادبیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعروں اور ادیبوں کو ادبیات میں حیات و بیداری کا نون دوڑانے کی قسم بھی دلائی ہے لیکن یہ سب کچھ زندگی کی قدروں کے تعین کے بغیر کس طرح ممکن ہوگا۔ جوش کے ذہن میں قدریں گڈمڈ ہو گئی ہیں ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ "کلِ آشیانہ خروس" "خس نشیمن عندلیب" سے بہتر ہے۔

شاعر اور نقاد میں کیا تعلق ہے، یہ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جوش نے شاعر کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں اور شاعری کا جو تجزیہ اپنی نظم "نقاد" میں کیا ہے، اس کا منطقی نتیجہ صرف ایک ہی نکلتا ہے۔ شاعر اور ناقد میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے، کوئی شاعر کے دل کی بات جانتا ہی نہیں کیونکہ وہ الفاظ میں قید نہیں ہوتیں، اس لئے تنقید ممکن نہیں ــ اس کی مزید توضیح انھوں نے لپنے انتخاب "سیف و سبو" کے دیباچہ میں کی ہے۔ وہاں یہ تو نہیں کہا ہے کہ شعر شاعر کے خیالوں کی تصویر ہی پیش نہیں کرتا، مگر تنقید کی شرطیں ایسی سخت لگا دی ہیں کہ کوئی شخص ان پر قادر ہو ہی نہیں سکتا۔ جوش کا خیال ہے کہ جب تک "من تو شدم تو من شدی" کی صورت نہ پیش ہو جائے کوئی نقد شاعر سے واقف ہی نہیں ہو سکتا اور اگر جان بھی لیگا تو یا تو اُس سے محبت کریگا یا نفرت، اور ان دونوں صورتوں میں تنقید بے لاگ نہیں ہو سکتی۔ حیرت ہے کہ اس ساری بحث میں جوش نے فن، اسلوب، اندازِ بیان کی خصوصیات اور اُن سے واقفیت کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے بہرحال جوش کے نقطۂ نظر سے تنقید ممکن ہو یا نہ ہو، تنقید کا عمل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا اظہار (محض سمجھ لینا نہیں) شعوری زندگی کا ناگزیر جزو بن گیا ہے ـــــ ابھی تشریح اور تجزیہ کی بہت گنجائش ہے اور بحث کے بہت سے پہلو ہیں لیکن اصل باتیں واضح ہو گئی ہیں۔ متضاد خیالات کے باوجود تا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جوش کا رجحان ایک تصور پرست، اعینیت پسند رومانی کا رجحان ہے جو جمالیات کو فلسفہ کی حیثیت سے نہیں وجدان کی حیثیت سے ذوق کا رہنما بنانا چاہتا ہے۔ وہ شاعر کے شعور سے زیادہ اسکے وجدان، اس کی پُراسراریت اور صلاحیت پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ شاعر سے حیات کی مصوری کے متمنی ہیں لیکن اقدارِ حیات کی تعین پر زور نہیں دیتے۔ انھوں نے ہمیشہ شاعری کے فنی پہلوؤں پر زور دیا لیکن ادھر انھوں نے اسی کو سب کچھ سمجھ کر موضوع اور مواد کی اہمیت، صحت مندی، عظمت اور افادیت کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ جس وقت عام طور سے فن اور صحت زبان و بیان کی طرف سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہو اس وقت اُردو کے سب سے اہم جدید شاعر کا اس پر زور دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اگر ہمارے نئے شعراء نے اسے نظر انداز کیا تو بڑی غلطی ہوگی لیکن اگر صحت زبان کے نام پر موضوع اور مواد کی صحت کی طرف سے بے پروائی ظاہر کی گئی تو ادب بے جان ہو کر رہ جائے گا۔

صابرہ زیدی

اسپین کا عوامی شاعر لورکا

(اس مضمون کے سلسلے میں میں نے ایک امریکی مضمون سے خاصا مواد لیا ہے چونکہ انگریزی میں لورکا کے تمام کلام کا کوئی مجموعہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے حوالے وغیرہ کام میں لائے گئے ہیں۔ (صابرہ زیدی)

فیدریکو گارسیا لورکا اسپین کا شعلہ نوا شاعر ان لوگوں میں سے ہے جن میں ہسپانوی فاشزم نے اپنے لئے خطرناک سمجھ کر ہمیشہ کے لئے راہ سے ہٹا دیا۔
جس زمانے میں فرانکو کی فوجوں نے ہسپانوی ری پبلک کے خلاف بغاوت کر کے اسپین میں ایک خونی دور کا آغاز کیا اس سے کچھ ہی پہلے لورکا غرناطہ گیا ہوا تھا جو اس کی جائے پیدائش ہے۔ یہ تاریخی شہر جلد ہی فرانکو کے قبضے میں آ گیا اور بغاوت شروع ہونے کے چند ہی دن بعد اسپین کا سب سے زیادہ مشہور اور مقبول شاعر اور ڈرامہ نویس فرانکو کے تہذیب دشمن بربری سپاہیوں کے ہاتھوں ۳۸ سال کی عمر میں ختم ہو گیا۔ اسپین کے اس محبوب شاعر کی یہ قدر کی گئی کہ اسے ہاتھ سے اپنی قبر کھودنے پر مجبور کیا گیا، اور اس کے بعد اس کے کنارے کھڑا کر کے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اپنے خیال میں فاشسٹ فوجیوں نے لورکا کے تڑپنے، دھڑکتے دل کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا، لیکن در اصل وہ اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہوئے، کیونکہ لورکا کے دل کی دھڑکن اب بھی اس کے تمام ہموطنوں کے دل کی دھڑکن بن کر اس کے کلام میں سنائی دیتی ہے، اور وہ اب بھی اس کے خون میں ڈوبے ہوئے دلوں کی پکار کے ساتھ ان گنت بے شمار دلوں کو گرماتی ہے ..... فرانکو کا فاشزم اپنی جہالت پرستی اور کلچر دشمنی میں جرمن اور اطالوی فاشزم سے کچھ پیچھے نہیں ہے اور لورکا کا قتل کوئی ہنگامی حادثہ نہیں تھا بلکہ اس کی تہذیب کشی اور انسانیت دشمنی کی پالیسی کا ایک مظاہرہ تھا۔ شروع ہی سے فرانکو کے چیلوں کی نظروں میں لورکا کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا، اور اسی لئے انہوں نے سب سے پہلے موقع میں لورکا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لورکا جو اپنے وطن کے عوام کی زبان تھا، جس کا حساس اور درد مند دل ان کے دکھ درد کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا ـــــ اس لورکا کا فرانکو کی فوجوں کے ہاتھ مارا جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ساری عوام دشمن رجعت پسند قوتیں لازماً ہر حسین اور اچھی چیز کی دشمن ہوتی ہیں۔ وہ محنت کشوں کو غلامی اور مجبوری کی حالت میں رکھنا چاہتی ہیں اور اس کے لئے ان کو صرف مادی آسائش کے ذرائع ہی سے محروم نہیں رکھتیں بلکہ ان کو کلچر اور فن سے بھی محروم رکھنا چاہتی ہیں کیونکہ شعر و ادب، رقص و موسیقی، سائنس اور ٹکنالوجی، غرض انسانی جینیس کے تمام مظاہر سے عوام کو بے بہرہ رکھنا ان کے مفاد میں ہے۔ اسی لئے کلچر کے جو علمبردار اپنا علم و فن عوام تک لے جانا چاہتے ہیں جن کی تخلیقوں اور ایجادوں سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہے، جو اپنے فن کا موضوع اور مخاطب عوام کو بناتے ہیں، وہ لازمی طور پر فاشسٹ حملے کی زد میں آ جاتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ لورکا کو سیاست سے کوئی بالواسطہ، عملی یا قریب کا تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ شعوری طور پر کسی سیاسی جماعت کے اصول اور نظریوں پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھتا تھا لیکن اس کی شاعری سماجی مسائل سے دور کسی خیالی دنیا کی شاعری نہیں تھی۔ وہ ان فنکاروں میں سے نہیں تھا جو بڑھتی، بدلتی سماجی حقائق سے منہ موڑ کر دنیا کی آویزشوں سے الگ تھلگ اپنی اپنی فراریا بیزاری کے جذبات کی پرستش کرتے رہتے ہیں، اور انہیں جذبات کے لفظی اظہار کو تخلیق کا نام دیتے ہیں۔ وہ ان تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے فنکاروں میں سے بھی نہیں تھا جو اپنی روح اور دماغ اور اپنے فن کو سرمایہ اور جاگیر کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں اور زندگی کی ابھرتی ہوئی قوتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنے آقاؤں کے نظریوں کی اشاعت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس طرح کا ناپاک رول ادا کرنا لورکا کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس کا عوام کی زندگی سے گہرا تعلق تھا، اسی لئے ان کے مسائل سے واقفیت اور ہمدردی تھی۔ ان کی امیدیں اور آرزوئیں، ان کا غم اور خوشی، ان کے خواب اور آئیڈیل یہ سب لورکا کے شاعرانہ شعور کا جزو اور اس کے فنی فیضان کا سرچشمہ تھے۔ وہ لطیف شاعرانہ احساس کا مالک تھا۔ اسی لئے اس کے دل کی دھڑکن سارے مظلوموں اور بے نواؤں کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی لورکا تمام ہسپانوی زبان بولنے اور سمجھنے والی جنتا کو بڑا عزیز ہے۔
لورکا کی شاعری کو سمجھنے کے لئے لوک آرٹ کی خصوصیات کو کسی حد تک سمجھنا ضروری ہے کیونکہ لورکا کی شاعری تہذیب (کلچر یا ثقافت) اور عوامی عناصر کا مرکب ہے۔

مشاہدات

اور پھر جاگتی جنتا کے تو خود مذہب کے ٹھیکیداروں سے ٹکر لینے کا اندیشہ ہوسکتا ہے اسے وہ کیسے برداشت کرسکتے ہیں۔ "Romancero Gitano" بھی اپنی جاندار امیجری اور اس سے بھی زیادہ اپنی عوامی اسپرٹ کی وجہ سے عام لوگوں میں بہت مقبول ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی امیجری بعض اوقات کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لیکن ہسپانوی عوام اس سے آسانی سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں کیونکہ ان کی شاعرانہ اور پُر زور زبان سے وہ کچھ بہت مختلف نہیں ہے۔

لورکا کے شاعرانہ احساس پر امریکہ کے قیام نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ جس طرح نیویارک کے ماحول نے ـــــ جس کی نمایاں خصوصیات وہاں کے سماجی اور معاشی امتیازات، مادی اور روحانی گندگی اور تاجرانہ ذہنیت ہیں ـــــ لورکا کے لطیف جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی، اسی طرح بدصورتی اور بے انصافی کی یہ فضا ہمارے اس حسن پسند، عوام دوست اور سادہ طبیعت شاعر پر بھی بہت گراں گذری۔ وہ اس کے خلاف ایک پُرزور شاعرانہ احتجاج کرتا ہے۔ اس زمانے کی نظمیں "شاعر نیویارک میں" کے عنوان سے چھپی ہیں۔۔۔ بعض اعتبار سے یہ نظمیں اس کی اور باقی شاعری سے ـــــ جس کا پس منظر اسپین ہے ـــــ خاصی مختلف ہیں۔ کیونکہ نیویارک کی زندگی کے سارے بھیانک پہلوؤں کے اظہار کے لئے ہسپانوی لوک شاعری کی نرمی اور بھولاپن موزوں نہیں تھا۔ اسی لئے لورکا نے اس نئے موضوع کے لئے نئے شعری تجربے کئے اور ایک مختلف ہیئت اختیار کی جو نیویارک کی سخت، بے جھجک اور بے روح زندگی کی عکاسی کرسکے ـــــ لیکن بنیادی طور پر اور شاعرانہ اسپرٹ کے لحاظ سے، لورکا کی شاعری کا یہ دور دوسرے ادوار سے مختلف نہیں ہے؟ نیویارک والی نظموں میں بھی اسی مخلص، دردمند، آشنا شاعر کا دل دھڑکتا ہے جو فطرت کے حسن کا دلدادہ، ہر طرح کی بدصورتی کا دشمن اور عام لوگوں کے گرم اور زندہ جذبات کا ترجمان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان نظموں میں اس کی مخصوص امیجری اور نرم موسیقی نہیں ملتی لیکن لورکا کے زرخیز تخیل نے اس کھردرے اور بے کیف ماحول کی عکاسی کے لئے بھی موزوں تشبیہات تلاش کر لی ہیں۔ نیویارک کی انسانیت کش فضا کا وہ اس طرح نقشہ کھینچتا ہے:

"نیویارک کی صبح کاذب
چار کیچڑ کے ستونوں پر چڑھ کر آئی۔
اور گندے جوہڑوں میں تیرتی ہوئی۔
کالے کبوتروں کی ایک آندھی ساتھ لائی۔

صبح کاذب آئی ہے اور اسے کسی نے منہ میں نہیں لیا۔
کیونکہ وہ نہ صبح صادق کا کوئی امکان لائی نہ امید کا۔
کبھی کبھی سکوں کے غضب ناک جھنڈ۔
لاوارث بچوں کو چھید کر ہضم کرجاتے ہیں۔

روشنی آوازوں اور زنجیروں میں دفن ہے
اس سائنس کی بے ہودہ بھول بھلیاں میں جس کی نہ جڑ ہے نہ بنیاد
دور گلیوں میں لوگ نیند میں غرق، لڑکھڑا رہے ہیں۔
جیسے ابھی کسی خون کے طوفان سے بچ کر آئے ہوں"

نیویارک کی بڑی بڑی آسمان رس عمارتوں میں گھرے ہوئے دفتروں کی فضا میں لورکا کو بڑی گھٹن محسوس ہوئی ہے کیونکہ اسے وہاں کی "نمبروں" اور "تقسیموں" کے نیچے ہزاروں انسانوں کے خون کا دریا ابلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور اسی لئے وہ "وال اسٹریٹ" کے زردالوں اور زر پرستوں کے خلاف گواہی دیتا ہے جو دوسرے نصف کو نظر انداز کردیتے ہیں"۔

لورکا کو سامراج کے ہر پہلو اور ہر مظہر سے نفرت تھی۔ جس طرح وہ اس نظام کی بے پناہ معاشی ناانصافیوں اور عوام کی مادی بدحالی کے خلاف احتجاج کرتا ہے اسی طرح اسے اس زرگری کا نظام کے روحانی کھوکھلے پن سے بھی شکایت ہے۔ اسے اس کا بڑا دکھ ہے کہ عام لوگ جو کمر توڑنے والی محنت کرنے پر مجبور ہیں اپنی ذہنی صلاحیتوں

بیماری کے تاریک سے سائے ہیں۔

اسے اس شہر سے، اس سماج سے اور اس نظام سے نفرت ہے جو انسانوں میں جنسی گھٹن اور طرح طرح کی ذہنی اور روحانی بیماریاں پیدا کرتا ہے، اور اسی کے خلاف اس کی آواز اٹھتی ہے۔ جو گندی موت کے قطرے، کڑوے زہر میں ملا کر لڑکوں کو دیتا ہے۔ تمہارے خلاف، ہمیشہ تمہارے خلاف؟

بے چارگی، بدصورتی اور بے انصافی کی دنیا کے خلاف شاعری کی درد اور کرب سے بھری ہوئی یہ چیخیں اس کے دردمند دل کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ عام انسانوں کی دکھ بھری، میلی کچیلی اور حسن سے عاری زندگی کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے، اس کے دل کے تار لرزنے لگتے ہیں اور ان کا یہ ارتعاش اس کے شاعرانہ احتجاج کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے لیکن شاعر کی حقیقت بین نگاہ اس سے آگے بھی کچھ دیکھ سکتی ہے۔ وہ کسی ایسے سنہرے دور کا تصور بھی کر سکتا ہے جہاں تاجرانہ اقدار کے بجائے انسانی اقدار کا دور دورہ ہوگا۔

انسان چاہے تو اپنی تمناؤں کو،
آسانی عریاں جسم میں سے، سیپی کی رگوں میں سے نکال کر آگے لے جا سکتا ہے۔
کل محبت ایک چٹان ہوگی، اور وقت باد صبا
جو شاخوں کے جھرمٹ میں سے نیم خوابیدہ گذرتی ہے۔

لورکا کو عظیم امریکی شاعر والٹ وہٹمن کی شاعری سے وہ زور، تاثر اور گرمی نظر آئی جو اس نظام کے ڈالے ہوئے فریب، گندگی اور روحانی بیماری کے ڈالے ہوئے پردوں کو چیر کر انسانوں کی "حقیقت" بیان کر سکتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ مکا کی سنہری بالیاں ایک دن ضرور لہلہائیں گی، جن سے حبشی اور غیر حبشی کو یکساں فیض پہنچے گا۔ والٹ وہٹمن سے مخاطب ہو کر وہ کہتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ گہری اور گمبھیر رات کی پر زور ہوا
تمہاری سونے کی جگہ سے سارے الفاظ سمیٹ لے، اور سب پھول۔
بس ایک حبشی لڑکا ہو جو سفید زر پرستوں کو خبر دے
کہ مکا کی بالی کا دور آگیا!

نیگرو قوم سے لورکا کو بڑی گہری ہمدردی تھی۔ وہ ہارلم (نیویارک کی نیگرز کالونی) سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"آہ ہارلم!
کوئی کرب، کوئی درد تمہاری مظلوم آنکھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا
نہ تمہارے سیاہ گرہن میں لرزتے ہوئے خون کا۔
نہ تمہارے تاریکی میں لپٹے ہوئے، بے زبان تشدد کا۔
اور نہ ہی تمہارے عظیم بادشاہ کا جو دربان کی یونیفارم میں قید ہے!

لیکن لورکا کا شاعرانہ شعور محض نیگرو اور دوسرے معمولی لوگوں کی زبوں حالی پر آنسو ہی نہیں بہاتا۔ لورکا جانتا ہے کہ یہی عام لوگ تہذیب کا سرچشمہ ہیں، محبت اور دوسری اعلیٰ انسانی اقدار کے یہی لوگ حامل ہیں، اونچے محلوں میں بیٹھنے والے نہیں۔ اپنی ایک نظم "کرائزلر بلڈنگ کے برج سے روم کو آواز" میں وہ یہی خیال بڑے پر اثر پیرائے میں ظاہر کرتا ہے۔

"ماسٹر بچوں کو بتاتے ہیں۔
کہ پہاڑی پر سے بڑی حسین، بڑی بے مثل روشنی بہہ رہی ہے۔
مگر بستی فقط گندی نالیاں ہی ہیں۔
جن کے آس پاس غصہ کی دیویاں چلاتی ہیں۔

شاہراہ

یا سفید خاموش عمارت سے جو خوبصورت خوشبودار گنبدوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں

پیلی گھروں سے جن کی چھت ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہے۔

ٹوٹے ہوئے شیشوں کی تختیوں کے پیچھے محبت کہاں!

محبت تو پیاس سے کملائے ہوئے جسموں ہی میں ملتی ہے۔

یا اس چھوٹی سی جھونپڑی میں جو طوفان سے ٹکر لیتی ہے۔

محبت تو ان غاروں میں ہے جہاں سانپ کے سانپ رینگتے ہیں۔

اور گھونگھوں کے نیچے دبے ہوئے تیز اور تاریک گرم بوسوں میں!

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نیویارک محض تاریخی کا مسکن نہیں معلوم ہوا۔ وہ ایک بہتر اور زیادہ خوبصورت امریکہ کی جھلک بھی دیکھ سکتا ہے — جو مستقبل کا امریکہ ہے۔ عوام کا امریکہ ہے۔

لورکا کی ایک اور نظم جس میں اس کا فن پوری طرح نکھرا ہوا نظر آتا ہے اس نے اپنے ایک دوست Ignacio Sanchez Majias کی موت سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ جو اسپین کا مشہور ترین bull fighter ہونے کے علاوہ شعر و ادب کا قدرداں اور خود شاعر بھی تھا۔ اس مرثیے میں لورکا نے بڑی فنکاری سے جذبات کے مختلف رنگوں اور سطحوں کے اظہار کے لئے مختلف انداز اور تخیل کو اپنایا ہے۔ آخر میں وہ اپنے دوست کو اس طرح خراج محبت پیش کرتا ہے:

کوئی تمہیں نہیں جانتا، کوئی نہیں لیکن میں تمہارے گیت گاتا ہوں۔

آنے والی نسلوں کے لئے تمہاری صورت کشش اور لطافت کے گیت۔

اور تمہارے شعور کی بے مثال پختگی کے گیت۔

شاید صدیاں بیت جائیں۔

اس سے پہلے کہ اینڈالوشیا کوئی فرزند پیدا کر سکے

تمہارے جیسا بلند اور تمہاری طرح بھرپور اور رنگین زندگی رکھنے والا۔

میں اس اینڈالوشین کی شرافت کے گیت گاتا ہوں، کراہتے ہوئے الفاظ میں

اور مجھے زیتون کے درختوں میں سے گذرتی ہوئی غمگین ہوا یاد آجاتی ہے!

لورکا کا فن عوام کے لئے تھا اور اس کی نظمیں دیہات کے تمام گھروں میں مزے لے لے کر گائی جاتی تھیں۔ لیکن شاعر کا اپنے سامعین سے اور زیادہ قریبی گہرا اور زندہ تعلق اس وقت قائم ہوا جب اس نے بہت سے طالب علموں اور دوسرے لوگوں کو جمع کر کے ایک عوامی تھیٹر کمپنی کی تنظیم کی۔ "لا باراکا" کمپنی جس کا روح رواں لورکا تھا، ڈرائنگ روم اور تجارتی منڈی دونوں کے اثر سے آزاد تھی۔ ہسپانوی عوام کو کلاسیکی اور جدید ہسپانوی ادب سے روشناس کرانا، اور اس طرح ان علم و ادب کے بھوکے کسانوں کے لئے اعلیٰ پائے کی تفریح کے سامان مہیا کرنا، اس کمپنی کا مقصد تھا۔ لورکا کی قیادت میں یہ کمپنی گاؤں گاؤں گھومتی، کبھی کبھی کھلیان میں اور کبھی کھلے آسمان کے نیچے اس کے ناٹک کھیلے جاتے۔ اور اس طرح زندگی میں پہلی دفعہ دیہات کے محنت کشوں کو اچھی ذہنی اور روحانی غذا نصیب ہوئی۔ عام طور پر لورکا ایسے ہی ڈرامے چھانٹتا تھا جو عوام کی زندگی سے قریب ہوں، جن کے ہیرو عوام ہوں۔ مگر لورکا صرف ہسپانوی ادب العالیہ کو ہی کسانوں سے قریب نہیں لایا۔ اس کی بڑی تمنا آرزو تھی کہ خود بھی ڈرامے لکھے اور اس زمانے میں اس کی یہ خواہش حقیقت کا جامہ پہن سکے۔ اس زمانے میں لورکا بڑی بھرپور اور پرمسرت زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ڈرامے لکھتا، اداکاری اور ہدایت کاری کرتا، اسٹیج اور سینری تیار کرتا، غرض ڈرامائی آرٹ کو عوام کے لئے وقف کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرتا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔

لورکا کے ڈرامے خصوصاً شروع کے — متوسط اور اونچے طبقے میں زیادہ مقبول نہیں ہوئے لیکن عام لوگوں نے شروع ہی سے ان کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔

خاص طور پر اس کے Farce اور طربئے (کامیڈی) کسانوں وغیرہ میں بہت پسند کئے جاتے تھے۔ کیونکہ ان میں عوامی آرٹ کی خصوصیات ہوتی تھیں۔ لیکن ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اس کی شہرت کا آغاز اس کے ڈرامے "خون کی شادی" (Blood Wedding) سے ہوتا ہے۔ یہ اور دوسرا ڈرامہ "یرما" (Yerma) دونوں المیئے "ٹریجیڈی" ہیں۔ دونوں اسپین کے جاگیرداری نظام کی گھٹی گھٹی فضا اور غیر انسانی اخلاقی قوانین اور کیتھولک چرچ کی بے جا بندشوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ "خون کی شادی" کا موضوع زبردستی کی شادی اور اس کے خوفناک نتائج ہیں۔ "یرما" بھی ایک دیہاتی لڑکی کا المیہ ہے جس کی شادی سماجی قوانین کے مطابق کردی گئی جس سے اسے کسی قسم کی روحانی مسرت یا تسکین نصیب نہیں ہوسکی۔ اور اس کی سب سے گہری آرزو ——— اولاد کی آرزو ——— بھی پوری نہیں ہوسکی، ایک بچے جاگتے کھلونے کی تمنا اس کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی لیکن مذہب اور سماج نے اسے مجبور کردیا تھا کہ وہ اس تمنا کا گلا گھونٹ کر ہمیشہ بے کیف اور بے رنگ زندگی گذارے۔ اس کے اور ڈرامے "روزیتا اور کنواری بڑھی" اور "برنارڈا البا کا خاندان" بھی متوسط طبقے کے مصنوعی معیار اخلاق، جذباتی گھٹن اور محبت کش روایتوں کے خلاف احتجاج ہیں اور فطری محبت کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔ بنیادی طور پر لورکا کے تمام ڈرامائی آرٹ کی بنیاد سماجی مسائل اور حقائق پر تھی اس کا ہر ڈرامہ بوسیدہ اور بیکار جاگیرداری نظام کے خلاف فطرت اور خلاف انسانیت معیار کے خلاف احتجاج ہے۔ اس کے ساتھ ان میں شاعرانہ اپیل اور زبان و بیان کی چاشنی بھی موجود ہے۔ لورکا کے ڈرامے منظوم ڈرامے ہیں۔

لورکا کے کلام میں علامتی طرز بعض دفعہ کچھ ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتا ہے کہیں کہیں جنسی علامتیں اس کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں پر چھا سی جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے اس کے یہاں کسی حد تک ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی شاعری کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے بورژوا نقاد یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لورکا کا فن قطعی بے مقصد تھا، وہ ایک خالص فنکار تھا جسے جانبداری سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کی شاعری سیاست تو سیاست، سماجی مسائل کی آلودگی سے بھی بالکل پاک ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت اس دعوے کے خلاف ہے۔ لورکا کی شاعری اپنے "Symbolism" کے باوجود مقصدی شاعری ہے۔ وہ جانتا تھا کہ عوام کی دکھ بھری، تاریکی کے پردوں میں چھپی ہوئی زندگی میں بھی بڑی تڑپ ہے، گرمی ہے اور رنگینی ہے، اور یہی زندگی ادب اور آرٹ کی جان ہے۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ تخلیق کے اس سرچشمے سے ناطہ توڑ کر شاعر کا فیضان بے رنگ، بے کیف اور نامکمل رہ جاتا ہے۔ اور اسی لئے اس نے اپنے فن کا رشتہ ہمیشہ سیدھے سادے کسانوں، حبشی قبیلوں اور عام محنت کشوں سے قائم رکھا۔ اور یہی اس کی عظمت اور مقبولیت کا راز ہے۔ اگر لورکا کو فاشزم کے بے رحم ہاتھوں نے بے وقت ختم نہ کردیا ہوتا تو وہ یقیناً اپنے ابتدائی دور کی شاعری سے آگے بڑھ جاتا اور اپنے ابہام اور علامت پسندی کو چھوڑ کر اور زیادہ سادہ، اور حقیقت پسندانہ رنگ اختیار کرتا، جس طرح چلی کے عظیم شاعر پابلو نیرودا نے کیا ہے۔ لیکن اس نے جو کچھ بھی شاعرانہ میراث چھوڑی ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے اسپین کے عوامی شاعر کا درجہ دے سکے۔ اس کے ایک نقاد کے الفاظ میں۔ لورکا کی شاعری بڑی شدت، گہرائی اور طمطراق کے ساتھ ہسپانوی ہے لیکن ساتھ ہی وہ ایک آفاقی انسان دوستی کی قائل بھی ہے۔

○

ضروری اعلان۔

"شاہراہ" کا مارچ سنہ ۱۹۵۴ء کا شمارہ بھی سالنامۂ شاہراہ کا سلسلہ ہوگا جس میں آپ کو کرشن چندر، کرتار سنگھ دُگل اور دوسرے ادیبوں کے افسانے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب "اردو تنقید کا ارتقاء" پر وارث حسین علوی کا بسیط مقالہ اور دوسری ایسی ہی ادبی تخلیقات ہونگی جو کسی وجہ سے سالنامہ میں شامل نہ ہوسکیں۔ اور اسطرح وہ شمارہ سالنامہ کا ایک جزو تصور کیا جائیگا۔

ادارہ ماہنامہ "شاہراہ" دھلی

سنہ ۱۹۰۱ء میں ۱۹ سال کی عمر میں وہ پیرس آگیا جو ہمیشہ سے مصوری کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں آ کر اس نے Vangogh ' Gauguin Degas ' Loutrec اور Ravior جیسے مشہور مصوروں کی تصویروں کا مطالعہ کیا اور کچھ ہی دنوں بعد اپنے کام کی ایک نمائش کی۔ مگر اس کی تصویریں یہاں کے بلند مذاق پر پوری نہ اتریں۔ اور لوگوں نے یہ کہہ کر سخت نکتہ چینی کی کہ یہ سب تو Vangogh اور Loutree کی نقالی ہیں اور بس۔

سنہ ۱۹۰۱ء سے پکاسو کی مصوری کا ایک نیا دور یعنی Blue Period شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس دور کی مدت بہت مختصر یعنی صرف تین سال ہے لیکن اس میں پکاسو کو طرح طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی زمانے کی اس کی ایک Self Portrait ہے جس میں پچکے گال، آنکھوں کے چاروں طرف حلقے اور داڑھی مونچھوں کا بڑھا ہونا اس کی غربت اور پریشانی کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں۔

پکاسو مالی مشکلات کی وجہ سے پیرس میں اپنے ایک ایسے دوست کے ساتھ رہتا تھا جو کسی پریس میں نوکر تھا جب اس کا دوست رات میں نوکری پر چلا جاتا تو بیٹھ کر موم بتی کی روشنی میں کام کرتا۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ اس دور کی تصویریں موضوع کے اعتبار سے سنجیدہ اور رنگ کے اعتبار سے مدھم نظر آتی ہیں۔

اس دور کی سب سے مشہور تصویر Mother With Child ہے جس میں ایک عورت اپنے بچے کو بغل میں لیے بہت ہی پیار سے سر جھکائے بیٹھی ہے۔ تصویر کچھ اس انداز سے بنائی ہے کہ ممتا کا جذبہ پوری طرح سے اجاگر ہو گیا ہے۔

Old Guitarist ایک بڈھے مغنی کی تصویر ہے جس کے ہاتھ میں ایک ستار ہے۔ کپڑے پھٹے ہیں۔ گردن لٹکی اور آنکھیں اندھی ہیں۔ انداز میں ایک عجیب غریب قسم کا کھچاؤ، اور انتہائی درجے کی بے بسی اور حزن و ملال پایا جاتا ہے۔

ایک دوسرا اسکیچ "ایک پاگل" کا ہے جو سڑک پر ننگے پیر کھڑا ہے۔ پاجامہ گھٹنوں تک پھٹا ہے اور سر پر بڑھے ہوئے بالوں کے گچھے۔ آنکھ، منہ اور ہاتھوں کے انداز سے ایک پاگل آدمی کی وحشت اور اس کے جنون کا پورا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

پیرس میں پکاسو کے پڑوسی بہت ہی معمولی لوگ تھے۔ یا تو کوئی نانبائی تھا یا دھوبی یا پھر سرکس میں کام کرنے والے ایکٹر جو اپنے گھٹیا مذاق سے لوگوں کو خوش کر کے روزی کماتے تھے۔ چنانچہ اس دور کی بہت سی تصویروں میں پکاسو نے ان لوگوں کی زندگی کی بھی عکاسی کی ہے۔

سنہ ۱۹۰۶ء کے بعد سے پکاسو نے اپنے آرٹ کا رخ بالکل بدل دیا۔ اور ہیئت کے لحاظ سے ایک نئے انداز کا یہ چار کیا جس کو بعد میں لوگوں نے کیوبزم کا نام دیا۔

کیوبزم نے نہ صرف پکاسو کی مصوری کا رخ بدلا بلکہ بہ حیثیت مجموعی آرٹ کی پوری دنیا پہ اس کا اثر پڑا۔ یہ کہنا کچھ غلط ہوگا کہ اس مخصوص انداز کا بانی پکاسو ہے۔ بلکہ دراصل یہ ایک مشترک کوشش اور مختلف خیالات کا نتیجہ تھا جس میں مصور Braque کا خاص حصہ ہے ——— اور Seurat ' H Rousseau Cezanne نے اسے اور آگے بڑھایا۔ لیکن یہ پکاسو کے فن کا زور کمال تھا کہ جس کی بدولت کیوبزم کو اس صدی کے ابتدائی حصے میں ایک تحریک کی حیثیت حاصل ہوئی۔

اگر کوئی اس نقطۂ نظر سے کہ کیوبزم عام فہم نہیں ہے۔ پکاسو کی مصوری پر الزام لگاتا ہے تو دراصل یہ الزام اس کی مصوری سے کہیں زیادہ اس سرمایہ داری نظام کے زوال پذیر آرٹ پر ہوگا جس میں فن ایک تجارتی شے بن کر رہ گیا ہے۔ اور مصور کی تخلیقی قوت کو کچل کچل کر اسے منفی بغاوت کی طرف مائل کر دیا۔ اور یہاں اس کا اعتراف کرنا بالکل منطقی بات ہے کہ پکاسو اپنے آرٹ کی ہیئت میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اگر ہم پکاسو کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ اس کا آرٹ سرمایہ دارانہ آرٹ کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے تو وہ ایک اہم شخصیت کا مالک نظر آئے گا یہ ایک ایسی بے اطمینانی اور بے چینی کا دور ہے جس میں صنعتی ترقی اور اجارہ داری کی بدولت فن کار اور دانش وروں نے ایک طرف تو عام آدمی کے گرے ہوئے مذاق سے بغاوت کی اور دوسری طرف "خداوندان" تہذیب کی خدمت گذاری بھی چھوڑ دی۔ پکاسو اور دوسرے بہت سے مصوروں نے اپنے

فن کے ذریعہ انھیں لوگوں کی خصوصیات کی جو اس بیسویں صدی میں زندگی کے ہر شعبے میں حاوی ہیں۔

لیکن کیوب ازم سے قبل

تصویر کو ... ایسے ہی ... اور ... انداز ... جس میں موضوع Content کی اہمیت بالکل ثانوی ہوا۔ ہیئت (Form) کو مقدم ہو۔ یہ سچ ہے کیوبزم کی بنیاد تو تصویر ... ماضی کی ان روایات سے بغاوت کا نتیجہ ہے جس میں موضوع کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی، اور ہیئت کو اس کے مطابق عام فہم بنایا جاتا تھا۔ اس سے کیوب ازم نے نئی نئی شکلیں اختیار کیں۔

نشاۃ ثانیہ کے مصور اپنی تصویروں کو Geometric Perspective کے لحاظ سے تیار کرتے تھے۔ اپنی تصویروں میں تناسبی فاصلے کا بھی خیال رکھتے تھے، لیکن ... پکاسو اور براک وغیرہ نے علم الاشکال پر مبنی چہروں اور اشیاء کو تصویری شکل دی۔

پکاسو نے اس میں اور جدت کی اور تصویروں کو اس انداز میں بنایا جس میں کئی کئی رخ بیک وقت نظر آنے لگے۔ کیوبزم کی انتہائی شکل Collage ہے جس میں مصور صرف رنگ ہی سے کام نہیں لیتا بلکہ کپڑے اور اخبار کی کترنوں اور لکڑی اور تار کے ٹکڑوں کے استعمال سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔

پکاسو کے ان مختلف دور کی تصویروں کو دیکھ کر اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی انداز سے نہ صرف دلچسپی رکھتا ہے بلکہ اس طرف اس کے لوٹ جانے کا بھی گمان ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ادیب دوستوں کی بعض کتابوں کے Illustration بنائے وہ سب کلاسیکی انداز میں ہیں اور ان کے خطوط کی نزاکت ... اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ اپنے فن کا استاد ہے۔ لیکن ان کلاسیکی تصویروں کی ہیئت میں مکمل اصلیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک ایسی کشمکش کا اندازہ ہوتا ہے جو اس کو اپنے اظہار کے لئے ایک نئے انداز کی طرف مائل کرتی نظر آتی ہے۔

۱۹۳۷ء میں اسپین میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ فرانکو کے اشارے پر نازیوں نے اسپین کے ایک گاؤں 'Guernica' کو بمباری سے تباہ و برباد کر دیا۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس نے دنیا کے ہر جمہوریت پسند انسان کے دل میں شدید نفرت کا جذبہ بیدار کر دیا۔ یونان کی جنگ کے بعد شاید یہ پہلا سیاسی واقعہ تھا جس پر دنیا بھر کے مصوروں نے اسپین سے اپنی ہمدردیوں کا اظہار کیا۔ بھلا پکاسو کیسے چپ رہ سکتا تھا۔ وہ صرف مصور ہی نہیں تھا۔ بلکہ ایک اسپینی بھی تھا۔ پکاسو نے اس سے پہلے کبھی بھی سیاسی اعتبار سے عوام میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اس خانہ جنگی کے شروع ہوتے ہی اس نے پورے جوش و خروش اور سخاوت کے ساتھ جمہوری اسپین کی حمایت شروع کر دی اور محض امداد کی خاطر اس نے اپنی بہت سی تصویریں بیچ دیں جن کو وہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

اپنے غصے اور نفرت کے اظہار میں اس نے سب سے پہلے Dreams and Lies of Franco سے متعلق چودہ تصویروں کی ایک سیریز بنائی اور اسپینی زبان میں ایک نظم بھی کہی جو اخباروں میں شائع ہونے کے بعد بہت پسند کی گئی۔

D. L. F. کو دیکھ کر بعض لوگوں نے پکاسو پر فاشسٹ دوستی کا الزام لگایا جس کے جواب میں پکاسو کہتا ہے "فرانکو کی یہ کوشش دراصل عوام اور ان کی آزادی کے خلاف ایک جنگ ہے اور میری زندگی بحیثیت مصور جنگ بربریت اور فن کی موت کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کے دماغ میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ بات کیسے آتی ہے کہ میں جنگ اور موت کا ساتھ دوں گا۔ میں نے اس تصویر کے علاوہ جو آج کل تیار کر رہا ہوں اور جس کا نام میں نے گورنیکا رکھا ہے۔ جتنی بھی تصویریں اب تک بنائی ہیں۔ ہر ایک میں میں نے اس ناجائز فوجی اقدام کے خلاف انتہائی نفرت کا اظہار کیا ہے جس نے اسپین کو درد اور موت کے سمندر میں ڈبو دیا ہے۔"

جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے اس سلسلے کی سب سے معرکۃ الآرا تصویر Guernica ہے جس میں پکاسو کا پیغام اشاروں (Symbols) میں ہے لیکن پھر بھی قابل فہم ہے۔ اس میں بیل کی قسم کا ایک خوفناک جانور ہے جو انسان دشمن ہے۔ ایک آدمی اپنے زخمی گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑا ہے اور اس کا مضبوط پنجہ ٹوٹی ہوئی تلوار کے دستے پر ہے جس کے قریب ایک تازہ ابھرتا ہوا پھول اس بات کی دلیل ہے کہ شکست صرف وقتی ہے اور گرنے سے فتح کا پھول کھل رہا ہے اور شکلیں بظاہر بہت گھناؤنی ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے موت بھی گھناؤنی ہے اور جنگ اور تباہی بھی بھیانک چیز ہے

ہیں۔ لیکن تصویر کے اوپر کے حصے میں ایک پھیلا ہوا ہاتھ بھی ہے جس میں امید کی جلتی ہوئی شمع اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مستقبل میں ہماری ہی جیت ہے جو اپنے ساتھ روشنی لئے ہے۔

گورنیکا موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے کتنی عالمگیر تصویر ہے۔ اس کا اندازہ ہم آج اچھی طرح لگا سکتے ہیں۔ پکاسو نے آج سے سترہ برس پہلے جس حقیقت کی پیشن گوئی کی تھی وہ حقیقت صرف گورنیکا کے شہر کی حدود ہی میں سمٹ کر نہیں رہ گئی بلکہ اس کی سرحدیں دوسری جنگ عظیم میں لندن، فارکو، استالن گراڈ، برلن، طلان ... اور ماگو ساکی تک پھیل گئیں۔ اور آج وہی حقیقت ایک اور جنگ کی شکل میں کوریا میں ظاہر ہوئی۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ پکاسو کے دل میں ابھی اسپین کی جنگ کا زخم نہ بھرا تھا کہ فاشسٹوں نے اس کے دوسرے وطن پر قبضہ کر کے اس کے زخم کو پھر سے تازہ کر دیا۔ وہ چاہتا تو دوسرے بہت سے مصوروں کی طرح فرانس چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ لیکن اسے فرانس کی سرزمین سے بہت پیار تھا ہٹلر کے سپاہیوں نے چار سال تک فرانس پر پوری شدت اور تشدد کے ساتھ قبضہ رکھا۔ لیکن اس تمام عرصے وہ پیرس ہی میں رہا۔ جب اس کے دوست اس خیال سے کہ کہیں اتنا بڑا مصور نازیوں کی درندگی کا شکار نہ ہو جائے۔ اسے کہیں اور بھاگ جانے کا مشورہ دیتے تو پکاسو ان سے کہتا کہ یہی تو وقت ہے کام کرنے کا۔ ایک مصور کے لئے جس کا کام تخلیق ہے۔ دبنے اور ڈرنے کے بجائے دن رات اپنے کام سے جد وجہد کو تیز کر دینا چاہیئے تاکہ آزادی کا دن قریب سے قریب تر آجائے۔ جب اس کے دوست اور زیادہ اصرار کرتے تو کہتا "میں تو آخری شخص ہوں گا جو پیرس کو چھوڑ کر کہیں جائے گا۔"

جنگ کے زمانے میں اس نے جس تندہی سے کام کیا اس کی مثال پکاسو کی مصوری کی تاریخ میں کہیں نہ ملے گی۔ نازیوں نے اسے مختلف مراعات دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس نے ان انسانیت دشمنوں کا کوئی احسان اٹھانا گوارا نہ کیا۔

پکاسو خود کہتا ہے کہ "میرے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں فرانس کی آزادی کی جنگ میں حصہ نہ لوں۔ غیر جانبدار رہ کر دور ہی دور سے اس جد وجہد کو دیکھنے سے بہتر یہی سمجھا کہ میں ان نوجوان مجاہدوں کے ساتھ شریک ہو جاؤں جن کے پاس دشمن کو ہراسنے بھگانے کے لئے بجز ان کی ہمت اور عزم کے کچھ بھی نہیں مجھے جنگ سے اوپر رہنا پسند نہ تھا۔ بلکہ میں جنگ کے اندر گھسنا چاہتا تھا۔"

چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جو اسے آندرے برتن، پال الیوارڈ، Meris th cray اور لوئی اراگاں جیسے دانشوروں اور ترقی پسندوں کی صف میں کھینچ لایا اور وہ آزادی کے فوراً بعد فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر ہو گیا۔ اس کے اس اقدام نے سارے فرانس، لندن اور امریکہ میں تہلکہ مچا دیا۔

فرانس کے کمیونسٹوں سے پکاسو کو بڑی عقیدت ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کا وہ حب الوطنی کا جذبہ اور خلوص ہے جس کا اظہار اسپین کی خانہ جنگی اور دوسری عالمگیر جنگ کے زمانے میں ہو چکا ہے۔

"New Masses" کے اڈیٹر کو جنگ کے بعد اس نے بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میرا عقیدہ ہے کہ دنیا کو سمجھنے اور اس کو بنانے میں کمیونسٹ سب سے پیش پیش ہیں۔ گذشتہ جنگ میں انھوں نے ہی سب سے زیادہ بہادری کا ثبوت دیا۔ خواہ وہ فرانس میں ہوں، یا روس میں یا خود اس کے وطن اسپین میں۔ اور جب میں جلا وطن تھا تو یہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی ہی تھی جس نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔" وہ خود کہتا ہے کہ "مجھے فخر ہے کہ میرے دوستوں کے حلقے میں جو اتفاق سے کمیونسٹ ہیں۔ بڑے سے بڑا سائنسدان، بڑے سے بڑا شاعر اور بڑے سے بڑا دانشور موجود ہے۔ جن کا میں دل سے احترام کرتا ہوں۔"

اس کے دوست کہتے تھے کہ جنگ کے زمانے میں پکاسو کی ذات ہی تھی جس نے بہت سے مایوس دلوں میں ہمت قائم رکھی۔ جنگ کے زمانے میں پیرس کے سرمایہ داروں نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ پکاسو اپنی تصویروں کی نمائش نہ کرے۔ لیکن حق اور انصاف کی آواز کو کون دبا سکتا ہے وہ نمائش کرنے سے روک سکتے تھے۔ لیکن اسے تصویریں بنانے سے نہ روک سکے۔ اس کے دل میں بھی وہی آزادی کا جذبہ تھا جو اس کے نئے وطن فرانس کے باشندوں میں تھا۔ وہ بھی نازیوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھا۔ جس طرح سارا فرانس لڑ رہا تھا۔ فرق صرف طریقے کا تھا۔ دوسروں کے پاس بندوقیں تھیں اس کے پاس اس کا فن تھا۔

پکاسو کا عقیدہ ہے کہ:

"مصوری صرف دیواروں کو سجانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا ہتھیار بھی ہے جس سے دشمن کو مار بھگایا جا سکتا ہے:"

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی کی تباہیوں کا پکاسو پر اتنا شدید اثر تھا کہ اس زمانے کی بنائی ہوئی ہر تصویر میں اس نے اس کا اظہار کیا اور یہ عجیب بات ہے کہ [illegible] تاریکی کو روشنی سے تشبیہ دی ہے اور تہذیب اور موت کے درمیان ایک کشمکش ظاہر کی ہے ۔۔۔ اس کی ایک مثال Still Life with Bull's Skull ہے جس میں ایک بیل کا خوفناک سر کھڑکی سے کمرے کے اندر جھانک رہا ہے۔ میز پر برش، 'Pallet' کتاب اور شمع جو تہذیب کے نشان ہیں اور بیل کی ہیبتناک صورت سے کچھ کانپ سے گئے ہیں۔ لیکن چھت میں لٹکی ہوئی تیز روشنی اس کے چہرے پر کچھ اس انداز سے پڑ رہی ہے کہ گویا بیل کی آنکھیں پتھرا کر مردہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

جنگ کے دوران میں پکاسو [illegible] کے ہاتھوں روحانی، جسمانی اذیت رسانی کی خبریں بھی سنا کرتا تھا۔ ایک دن ایک پورے خاندان کے مرجانے کی خبر نے پکاسو کو بہت متاثر کیا۔ اس تاثر کا نتیجہ The Charnel House جیسی مشہور تصویر میں ظاہر ہوا۔ کہتے ہیں گورنیکا کے بعد یہ سب سے بڑا ایکون ہے جس کی لمبائی [illegible] اور چوڑائی [illegible] فٹ ہے۔

[illegible] متواتر شائع ہوئیں کہ گورنیکا جیسی شہرت نہیں پائی لیکن اس میں بنائی ہوئی صورتیں اصلیت سے قریب ہیں اس میں گورنیکا جیسی [illegible] نہیں ہے۔

[illegible] سے بنائی ہوئی اس تصویر میں ایک فاقہ زدہ اذیت کا مارا ایک برہنہ انسان ہے جس کا جسم اوندھا پڑا ہے اور ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں پیر پھیلا کر [illegible] کا چہرہ اوپر اٹھا اور اس کا [illegible] پیروں پر گرا ہوا ہے۔ بچہ اپنے ہاتھوں میں ایک کھلونا لئے باپ کے پاس پڑا ہے۔ پیروں کا رخ [illegible] کی طرف ہے۔ [illegible] سے [illegible] نکل رہے ہیں۔ [illegible] میز پر رکھی ہوئی [illegible] اور ایک خالی ہنڈی ان کی مفلسی کا احساس دلاتے ہیں۔

پکاسو کو جنگ سے کتنی نفرت اور تہذیب سے کتنا پیار ہے اس کا اظہار اس کے ایک زبانی پیغام سے ہوگا جو اس نے امریکی مصوروں کے نام ایک نمائش کے موقع پر بھیجا تھا۔ کہتا ہے:

"میں اپنے امریکی مصور دوستوں سے خود تو نہیں مل سکتا لیکن میں اپنی اس خوشی کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں کہ فاشسٹوں نے ہم اسپینیوں کے خلاف سارے عالم میں جو پروپیگنڈا کر رکھا تھا اس کا پول ان [illegible] بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے کھول دیا ہے جو ہمارے وطن اسپین آئے تھے۔ وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ اسپین کے عوام نے اپنی تصویروں اور تہذیب کی ہر چیز جس کو بچا سکتے تھے اپنی جان پر کھیل کر بموں کی زد سے بچا لیا۔"

آگے کہتا ہے کچھ دنوں قبل ایک نمائش نیویارک میں ہوگی اور پھر لوگ خود ہی دیکھ لیں گے کہ تہذیب کے بچانے والے کون ہیں اور برباد کرنے والے کون؟

اسی پیغام میں امریکی مصوروں کو ان کی ذمہ داریوں کا بھی احساس دلانا اپنا خاص فرض سمجھا ہے۔

"لیکن میری تمنا ہے کہ میں اپنے امریکی مصور دوستوں کو اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کر دوں کہ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ وہ مصور جو روحانی قدروں کے ساتھ زندہ رہتا ہے اور کام کرتا ہے وہ اس کشمکش سے جس میں انسانیت اور تہذیب کی بازی لگ گئی ہو (خطرے میں پڑ جائیں) نہ تو کبھی الگ رہ سکتا ہے اور نہ رہنا چاہیئے۔"

پکاسو ہماری اس صدی کا پہلا مصور ہے جس نے اس بات کو ثابت کر دکھایا کہ مصور کے لئے حقیقت پسندی ہی اس کا رویہ ہونا چاہیئے نہ کہ ہیئت۔ ایک مصور اپنی تصویر کی ہیئت میں کیمرے جیسی اصلیت پیدا کر سکتا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کا موضوع اور پیغام غلط ہو۔

حال کی ایک تصویر Massacre in Korea میں کوریا کی تباہی اور بربادی کا نقشہ کھینچ کر پکاسو نے نہ صرف انسانیت سے جنگ بازوں کے خلاف اپیل کی ہے بلکہ ایک بار پھر اپنے اس قول کو پورا کر دکھایا کہ "تصویر صرف کمرے کو سجانے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وہ دشمن کے ظلم کو روکنے کیلئے ایک ہتھیار بھی ہے۔"

آج جبکہ ہمارے تہذیب و تمدن کے چاروں طرف ایک تیسری جنگ کا خطرہ گھیرا ڈال رہا ہے دنیا کے بڑے بڑے فنکاروں ادیبوں اور دانشوروں کی طرح یہ عظیم مصور امن چاہنے والوں کی صف میں سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کے پرچم پر سفید فاختہ جو دنیا بھر کے امن پسندوں کیلئے ایک بین الاقوامی نشان بن گئی ہے پکاسو ہی کی دین ہے۔ اس کا یہی خلوص محبت اور انسان دوستی کا جذبہ ہے جس کی بدولت وہ ہم سے بہت قریب آگیا ہے۔ بلکہ وہ ہم میں سے ایک بن گیا ہے اور امن کا فن دنیا بھر کے انسانوں کی نجات اور فاتح مستقبل کا ناقابل شکست نقیب ہے۔

ممتاز حسین

افسانوی کردار کی تعریف

ادھر کچھ دنوں سے ہمارے افسانہ نگاروں کے درمیان یہ احساس تو پیدا ہو گیا ہے کہ کہانی بغیر کردار کے نہیں چل پاتی ہے، لیکن اس معاملے میں کم ہی لوگوں کا ذہن صاف ہو سکا کہ کردار کے کیا معنی ہیں، یوں کہنے کو تو کردار ہر شخص کا ہوتا ہے لیکن اب ایسا نہیں ہے کہ ہم کچھ لوگوں کو بے کردار (character less) بھی کہتے ہیں، ایسی صورت میں کیا یہ مناسب ہے کہ ہم کسی بے کردار شخص کی کردار نگاری تاریخ کو کیریکٹر کا نام دیں حالانکہ فی زمانہ نہ تو ایسے بے کردار افراد کی کمی ہے اور نہ لوگوں کی بے کرداری کو پیش کرنا ہی بے معنی ہے، پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ آپ ان افراد کو کیریکٹر کا نام نہیں دے سکتے ہیں، اور اگر آپ انہیں کیریکٹر کے نام سے یاد کرنے پر مصر ہیں تو انہیں منفی کردار کہئے یعنی ایسے افراد جو انفرادیت رکھتے ہیں لیکن کیریکٹر کے حامل نہیں ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ہم ان دونوں تصورات کو کیونکر ہم آہنگ کریں، ایک شخص انفرادیت رکھتا ہے لیکن کیریکٹر نہیں رکھتا ہے، اس کا جواب انفرادیت اور کیریکٹر کے فرق کی وضاحت ہی سے ابھر سکتا ہے اور یہ بہت ضروری ہے کیونکہ انفرادیت اور کیریکٹر کے فرق کو نہ جاننے ہی کے باعث ہمارے بہت سے افسانہ نگار اپنی کہانیوں ناولوں میں افراد یا اشخاص تو پیش کر لیتے ہیں لیکن کیریکٹر پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں، اگر اس موقع پر میں کرشن چندر کی کسی معمولی کہانی کا حوالہ دوں تو ممکن ہے کہ آپ میری یہ بات آسانی سے مان لیں کیونکہ ان دنوں ان پر کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے بڑی کڑی تنقیدیں ہو رہی ہیں لیکن اس میں وہ مزہ نہ ہوگا جو کسی بات کو کافی رد و کد کے بعد قبول کرنے میں ہے اس لئے میں ان کی ایک ایسی کہانی کا حوالہ دوں گا جسے بالعموم کیریکٹر اسٹوری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس کہانی کا نام ہے "کالو بھنگی"۔ چونکہ زیر بحث کرشن چندر کی افسانہ نگاری نہیں ہے، اس لئے یہ بات بڑی ہی نازیبا ہوگی اگر کوئی شخص انفرادیت اور کردار کی اس بحث میں کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو گھسیٹ لائے، یہاں کالو بھنگی کی افسانویت بھی زیر بحث میں ہے، یہاں کالو بھنگی کا ذکر از رہ استشہاد ہے، انفرادیت اور کردار کے فرق کو واضح کرنے کے لئے کیا گیا ہے،

کالو بھنگی جیسا کہ اسے پیش کیا گیا ہے ایک جیتا جاگتا انسان ہے، اس نے اپنی زندگی میں محبت بھی کی ہے، لیکن بھنگیوں یا عام انسانوں کی اس مشترکہ خصلت پر شریک ہونے کے علاوہ وہ اور بھنگیوں سے مختلف بھی ہے، وہ دھوپ میں بیٹھ کر اپنی صفاچٹ چندیا کو اپنی کانگے سے چھوتا بھی ہے، اس ایک نرالی ادا کے علاوہ اس کی کچھ اور بھی ادائے خاص (Idiosyncracies) ہیں جو اسے دوسرے بھنگیوں سے ممتاز کرتی ہیں، کسی بھی فرد کی انفرادیت یہی تو ہے کہ اس کا چہرہ مہرہ، اور اس کے کو بڑ دوسروں کے چہرے مہرے اور کوبڑے مختلف ہوں، لیکن کیا یہ چیزیں کسی شخص کی اپنی تراش خراش اپنا رکھ رکھاؤ، طرز رفتار و گفتار، اپنا مذاق، اپنی رغبت اپنی نفرت یا بقول فرائیڈ اپنے (Complexes) اسے ایک کردار کا حامل بھی بنا سکتی ہیں، میرا جواب نفی میں ہے۔

کسی آدمی کا نام بے وجہ بطور سند پیش کرنا تو یقیناً برا ہے لیکن اگر کسی کا جملہ بالشافہ سامنے آ ہی جائے تو اسے چھپانا بھی اس کی حق تلفی ہے، گوئٹے کا قول ہے کہ کسی بھی کیریکٹر میں شیطان یا Demon کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ اسی شیطان کو ego یا خودی کا بھی نام دیتا ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شیطان کیا ہے جس کے پائے جانے سے ہم کسی شخص کے کیریکٹر کو پہچانتے ہیں، ہم مسلمانوں کا تو یہی عقیدہ رہا ہے کہ ہمیں شیطان سے بچنا چاہئے اور اگر کبھی وہ ہماری غفلت سے ہم میں حلول کر جائے تو ہمیں لاحول پڑھ کر دور کر دینا چاہئے، اَستَغفِرُاللہ میرا مفہوم کب اس شیطان سے ہے، میں تو اس شیطان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو اس خالق کے مقابلے میں تسلیم و رضا، صبر و قناعت بندگی و بیچارگی اور عدم جذبۂ تجسس کے خلاف ایک قوت بن کر اسے خالق بننے یا تکمیل شخصیت کے لئے اکساتا ہے، کیونکہ انسان کی شخصیت تو اسی وقت متعین ہوئی جبکہ وہ حیوانوں کے برعکس خالق بنا ہے، اشیا کی اقدار، ورنہ اس منزل سے پہلے یعنی خالق بننے سے پہلے تو وہ سزا خوار کا

شاہراہ

شعور ہی رہا ہے اور اس پر لو تقریباً تمام ہی ترقی پسند فکر حضرات متفق ہیں کہ کسی بھی فرد کی تکمیلِ شخصیت اس وقت تک نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ اس کے معاشرے کے تمام افراد کی شخصیت پایۂ تکمیل کو نہ پہونچے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب تک کسی شخص کا شیطان یا خودی، جماعتی خودی کا حصہ بن کر کسی مشترک نصب العین کی طرف گامزن نہ ہو وہ اس کی شخصیت کی نفی کرتا رہے گا خواہ اس کا شیطان کتنا ہی زور دار کیوں نہ ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ کیریکٹر بعض افراد میں فی الواقع تو کسی امکانی صورت میں پایا جاتا ہے جو کہ فطرت اور سماج کے رجحانوں کو اپنے معاشرے کے تمام افراد کی تکمیلِ شخصیت کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ ان کا یہی عمل ان میں وہ قوتِ ارادی پیدا کرتا ہے جو انشاء اللہ کی قوتِ ارادی سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ انشاء اللہ صرف اپنی ہی قوتِ ارادی پر بھروسہ کرتا ہے اور وہ دوسروں کی قوتِ ارادی پر بھی۔ چنانچہ یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ جتنی ہی زیادہ کسی فرد کی خودی، جماعتی خودی کے ساتھ منضبط اور جماعتی نصب العین سے باخبر ہوگی اتنی ہی زیادہ اس کی قوتِ ارادی بھی مضبوط ہوگی۔ لیکن چونکہ ہمارا معاشرہ متصادم طبقات میں منقسم ہے جو کہ مخالف سمتوں میں جدوجہد کرتے ہیں اس لئے بہت سے افراد کا کردار اس جدوجہد میں کٹ پٹ کر ختم یا (cancelled out) بھی ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ متصادم طبقات اپنے اپنے نمائندہ کیریکٹر پیدا بھی کرتے ہیں۔ ان طبقوں میں سے کس طبقے کے کیریکٹر جماعتی خودی اور جماعتی نصب العین کے حامل ہیں اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس طبقے کا تاریخی رول کیا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہم کسی کیریکٹر کو اس کے طبقے کے تاریخی رول سے جدا کر کے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ یوں تو سرمایہ داری کیریکٹر کش یقیناً واقع ہوئی ہے کیونکہ تاجروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ منافع خوری اور حصولِ زر کے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں سکتا ہے لیکن جس زمانے میں وہ اپنی اس تنگ نظری کے باوجود جاگیردارانہ نظام کے خلاف حصولِ طاقت اور ذہنی ترقی کے کاموں میں منہمک تھی اس نے کچھ کیریکٹر پیش بھی کئے ہیں مثلاً فاوسٹ لیکن جب سے یہ نظام انحطاط کی طرف گامزن ہوا اور اس کی طاقتیں صرف اقوام کو غلام بنانے اور سماجی ترقی کو روکنے پر صرف ہونے لگیں اس لئے نہ صرف اپنے ماتحت طبقوں پر بلکہ خود اپنے طبقے پر بھی کیریکٹر کا صفایا شروع کر دیا، چنانچہ امپیریلزم کے عہد میں اس نے جو کردار پیش کئے ہیں، لارڈ بیلنگ، ہٹلر، مسولینی، ایچ یا اب جو مکارتھی اور ٹرومین ہی ہیں وہ عرفِ عام میں تو شیطان ہو سکتے ہیں لیکن گوئٹے والے شیطانی طاقت کے نمائندہ نہیں ہیں، کیونکہ گوئٹے کا شیطان فاوسٹ ہیگل کی جدلیات، اسپینوزا کی اخلاقیات، ادم کی افتصادیات اور ملٹن کے حسن کا جویا تھا، گوئٹے کا شیطان نہ تو میکاولی تھا اور نہ ہٹلر، اس لئے ہم سومرسٹ ہام کے میکاولی کو جو ہٹلر کی ابدیت کو ثابت کرنا چاہتا ہے، کیریکٹر نہیں کہہ سکتے ہیں، ناخن عقل کو گرہ کشائی اور رخون ریزی دونوں ہی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، لیکن جب کوئی درندہ استعمال کرتا ہے تو اسے کیریکٹر نہیں بلکہ درندہ ہی کہتے ہیں۔ اس فرق کو بتلانا اس لئے ضروری تھا کہ جاسوسی ناولوں کے ڈاکو، جرائم پیشہ، سماج بدر افراد، اور توپ و تفنگ کے ذریعے سامراجی مقام کو قائم رکھنے والے جنرل کرمی اور ڈکٹیٹر کیریکٹر نہیں ہیں، کیونکہ ان کے یہاں شیطان خواہ وہ ہٹلر کا ہو یا کسی اور کا، کیوں نہ ہو نہ صرف دوسروں کی بلکہ خود اپنی شخصیت کی بھی نفی میں مشغول رہتا ہے تحرکات مختلف ہو سکتے ہیں لیکن نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے، ہٹلر کا کوئی مزار بھی نہ بن سکا، اور کیا عجب جو چند بچے ہوئے مزار بعد میں نہ رہیں، پھر یہ کہ ان کی شخصیت میں داخلی قوت آتی نہیں ہوتی ہے کہ خارجی قوت وہ دوسروں کی قوتِ ارادی یا تاریخ کی قوتِ ارادی پر بھروسہ کرنے کے بجائے توپ و تفنگ اور ایٹم بم پر بھروسہ کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ جب ان سے ہتھیار چھین جاتے ہیں تو یا تو وہ خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر سپر انداختہ ہو جاتے ہیں لیکن گیبرل جولیس فیوچک اور روزنتا برگس جو انہیں کے ملکوں میں پیدا ہوئے اور جو محنت کش انسانوں کے طبقات کی ترجمانی کرتے تھے موت کے سائے میں بھی سپر انداختہ نہ ہوئے اور نہ خودکشی کی، یہ تینوں کیریکٹر ہیں زندگی کے بھی اور انسانوں کے بھی، لیکن ہٹلر مسولینی اور اس کے بھائی بندری وغیرہ نہ تو زندگی کے کیریکٹر ہیں اور نہ انسانوں کے، اگر کسی کیریکٹر میں گیبرل جو جولیس فیوچک اور روزنتا برگس کی جیسی روحانی قوت یا اس کا کچھ حصہ نہیں ہے تو وہ کیریکٹر نہیں ہے سامراجی اور اس کے محتاج ملکوں کی دنیا میں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان ملکوں میں کیریکٹر ہی کی روحانی طاقت کا مظاہرہ پھانسی کے سائے ہی میں ہو، اس کا مظاہرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ہو سکتا ہے کسی سے محبت کرنے، کسی معمولی سی پوسٹ پر نڈر ہو کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں، اور اگر یہ بھی نہیں تو خود اپنی ہی ذات کے ساتھ صداقت برتتے ہیں، لیکن اس کا مظاہرہ ان کی زندگی میں یقیناً نہیں ہوتا ہے جن میں مطابقت بالکل نہ ہو، جو اپنے ذاتی مفاد کے آگے کچھ دیکھ ہی نہ پائیں، وہ بڑے کرمار بڑے کردار یا فلسطین تو ہو سکتے ہیں لیکن کیریکٹر نہیں۔ اس کے علاوہ ایسے لوگ بھی کیریکٹر نہیں ہیں جن کے بغیر حیات کا ایک لمحہ بھی اس کا رواں کے نزدیک گزرا ہو جس سے زندگی عبارت ہے۔ اعتبار ایک ترقی کرنے والے منظر کے، ترقی کے تصور میں حصہ لئے بغیر کوئی بھی شخص کیریکٹر کے نام سے یاد کئے جانے کے لائق نہیں ہے، ایک ایسا شخص جسے

وشانی سیاست سے مطلق واسطہ نہ ہو وہ نہ تو کیریکٹر ہے اور نہ انسان، ایسا تو صرف سرمایہ داروں ہی کی ادبی لغت میں آیا ہے کہ ایک جعل ساز بھی کیریکٹر ہے اور ایک قاتل بھی، اور اس طرح سے یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ ناول یا افسانے میں جو بھی افراد پیش کئے جائیں وہ سب کے سب کیریکٹرس ہیں، غالباً اس لئے کہ سرمایہ داروں کا کوئی کیریکٹر نہیں ہے یا پھر اس لئے کہ سرمایہ داری کا ہی کیریکٹر ہے کہ وہ کیریکٹر ختم کرکے سماج دشمن انفرادیت کو فروغ دے، امید ہے کہ اب میرا مفہوم واضح ہو چکا ہے، کیریکٹر فردی ہوتا ہے، اس لئے ہر کیریکٹر میں انفرادیت پائی جاتی ہے لیکن ہر فرد باوجود اپنی انفرادیت کے کیریکٹر کا حامل نہیں ہوا کرتا،

چونکہ کیریکٹر ایک فردی ہوا کرتا ہے اس لئے کسی بھی کیریکٹر کا تصور بغیر فرد کے نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن فرد کو پیش کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسے صرف ایک نام دیا جائے اور اس کے اوصاف بغیر کسی منطق کے اکٹھا کرلئے جائیں، اس قسم کے کیریکٹر میں کوئی کامیابی وحدت پیدا نہیں ہو پاتی ہے، بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول یا افسانہ لکھتے وقت فن کار کے ذہن میں صرف خیالات تھے شخصیتیں نہ تھیں، اس کے برعکس کامیاب فن کار وہ ہوتا ہے جو منفرد شخصیتوں کے ذریعے سوچتا یا اپنے خیالات کو کھولتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کیریکٹر صرف اپنے نام کے ساتھ ہے بلکہ اپنی عنصری کیفیات کے ساتھ آئے گا، ایک متحرک جاندار منفرد شخص کی حیثیت سے جو صرف واقعات کی منطق ہی کے سہارے آگے نہیں بڑھتا ہے بلکہ کچھ اس سے ہٹ کر بھی جو صرف عقل ہی کا پتلا نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنے جذبات احساسات اور اپنی انفرادیت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے،

لیکن ایک فرد شخص اور ایک کیریکٹر کی انفرادیت میں فرق ہوتا ہے، کیریکٹر کی انفرادیت اس کی اس شخصیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جو کیریکٹر میں تبدیل ہوتی رہتی ہے، کیونکہ کیریکٹر اسکالی پیدا ہوتا ہے نہ کہ فی الواقع، وہ کیریکٹر بنتا ہے اپنی مسلسل جدوجہد سے وہ اس کی اپنی جدوجہد دوسروں کی جدوجہد سے مختلف ہوتی ہے، جو لوگ کیریکٹر کو عمل کے طریق کار میں نہیں دیکھ پاتے ہیں وہ کسی دوسرے کی شخصیت میں کسی اور کا کیریکٹر ڈال دیتے ہیں یا پھر وہ افراد کا انتخاب بلا کسی تمیز اور شعور کرتے ہیں، وہ کسی بھی شخص کی تصویر کھینچ دینے یا حلیہ لگا دینے پر قادر ہیں لیکن اشخاص کے ذریعے سماجی حیثیت کو بے نقاب نہیں کر پاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے معاشرے کی نمائندہ خصوصیات کو متعین کرلے اور پھر اس نقطۂ نگاہ سے کیریکٹر ڈھونڈھنے سے قاصر رہتے ہیں،

اسی طرح (Typical) یا کردار کی نمائندگی کے بارے میں جو غلط فہمی ہے وہ بھی دراصل کیریکٹر اور فرد کے فرق کو نہ سمجھنے ہی کے باعث ہے لیکن یہ بھی ہماری سہل پسندی ہوگی اگر ہم اسی کو واحد سبب ٹھہرائیں، اس سے ہٹ کر بھی نمائندگی کے کچھ اور مفہوم ہیں جنہیں سمجھنا ضروری ہے، کسی بھی کیریکٹر کی (Typical) یا نمائندگی اصل میں ایک مجرد تصویر ہے، کیونکہ یہاں فن کار تحقیق سے نہیں بلکہ تعمیم سے کام لیتا ہے، کیریکٹر کی انفرادیت کو اجاگر کرتے وقت وہ تخصیص سے کام لیتا ہے لیکن جب وہ اسے نمائندہ بناتا ہے کسی خاص طبقے یا گروہ کا تو وہ تعمیم سے کام لیتا ہے، چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ انفرادیت کے اجاگر کرنے پر مشاہدہ زیادہ اور فلسفیانہ نظر کم کام کرتی ہے لیکن اسے نمائندہ بنانے وقت فلسفیانہ نظر زیادہ اور مشاہدہ کم کام کرتا ہے، گو فلسفیانہ نظر مشاہدے ہی سے پیدا ہوتی ہے اور فلسفیانہ نظر ہی سے مشاہدے میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے تاہم سمجھنے کے لئے انہیں علیحدہ کرنے کی ضرورت ہے اور تعمیم کا یہ کام ایسا ہے کہ اس میں فن کار کے ([illegible]) یا علم کو کافی دخل ہوتا ہے وہ اپنے کردار کی مخصوص خصوصیات کو، ان خصوصیات کو جو تعمیمات میں ممد و معاون ہوتی ہیں بڑھا چڑھا کر بھی پیش کرتا ہے، اس کا یہ کیریکٹر دراصل افسانوی ہوتا ہے لیکن اسے کچھ لوگ مثالی بھی کہہ دیتے ہیں، اب یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے، کیا کسی کیریکٹر کا مثالی یا افسانوی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حقیقت نگاری کے درجے سے گرا ہوا ہوتا ہے، میرا جواب نفی میں ہے، ڈان کوئکزوٹ ایک افسانوی کردار ہے گو مثالی نہیں، اس کے بارے میں یقین کامل ہے کہ اس عجیب و غریب شخصیت کا کوئی بھی آدمی اسپین کی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا ہے لیکن کیا اس کا یہ افسانوی پہلو اسے کم حقیقی یا کم دلکش بناتا ہے، اس کا جواب صاحب ذوق ہی دیں گے، چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر مبالغہ مسخرے کو مسخرہ تر یا لارڈ اور ہاکویس کے عیب کو جو یقیناً گیکزات کے دشمن تھے، بڑھا چڑھا کر پیش کرنا، آرٹ میں حق کا درجہ رکھتا ہے تو پھر کیریکٹر کی قوت اور توانائی کو بھی مبالغے کے ساتھ پیش کرنا حق میں داخل ہے، پہلی صورت میں وہ کردار صرف افسانوی ہوتا ہے، دوسری صورت میں وہ افسانوی اور مثالی دونوں ہی ہو جاتا ہے، یقیناً تناسب اور توازن کو برقرار رکھنا ضروری ہے ورنہ وہ آرٹ کاہے کو ہوگا، لیکن اس قسم کی واقعیت نگاری میں جسے کہ سرمایہ داروں نے جنم دیا ہے، جس میں فنتشی اور تخیل کو بہت کم دخل ہوتا ہے ایسا نہیں ہوتا ہے کیونکہ ان کے ناولوں میں وہ (Status quo) ہوتا ہے، وہاں نہ تو کوئی کیریکٹر بنتا ہے اور نہ بگڑتا ہے، بلکہ سماجی رشتوں کی چٹائی ہمیشہ یکساں نظر آتی ہے، نہ تو کوئی پیرا تار رفتہ ٹوٹتا ہے اور نہ نیا بنتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام انسانوں کو انسانوں سے، انسانوں کو اپنی تخلیقات سے بیگانہ بنا دیتا، کارخانوں اور مشینوں کو مہیب دشمن کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے اور انسانی رشتوں کو پیسوں کے رشتوں میں بدل دیتا ہے کیریکٹر کی شکست واقع ہوتی ہے، چنانچہ یہی سبب ہے کہ سرمایہ داری کا دور بالعموم اور اپنے انجام کے قریب بالخصوص کیریکٹر کی تخلیق میں مانع رہا ہے، اور ہمارے وہ فن کار جنہیں اس نظام سے نفرت تھی اور جو حقیقت نگاری کا حمایت کو فریضہ سمجھتے تھے وہ مجبور تھے اس بات پر کہ منفی کرداروں کے ذریعے وہ کردار جو سرمایہ دار کے گئے تھے، اس نظام کی بربریت کو بے نقاب کریں ان کے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کیونکہ اس کے زمانے میں سرمایہ داری کا فلسفہ ناقابل شکست معلوم ہوتا تھا لیکن سوویٹ انقلاب کے بعد سے وہ پوزیشن بدل گئی ہے، نہ صرف اس اعتبار سے کہ اب یقیناً متزلزل ہو گیا ہے کہ سرمایہ داری چند دنوں کی مہمان ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ اس لئے نہ صرف سوویٹ ممالک میں ہی سرمایہ دارانہ اور ... بلکہ دنیا میں بھی اس جدوجہد کو تقویت پہونچائی جس میں کردار بنتے ہیں، وہ روشنی بخشی جس سے کردار منور ہوتے ہیں وہ انقلابی راستہ دکھایا اور مثال قائم کی جس سے کردار میں قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے، آج جو کہ انقلاب چین نے براعظم ایشیا کے ایک بہت بڑے حصے کو سامراجی استحصال سے آزاد کر دیا ہے نو آبادیاتی ملکوں پر کیریکٹر بننے والے طریق کار کو مزید قوت پہونچی ہے آج وہ کیریکٹر سامراج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف مختلف محاذوں پہ جنگ کر رہے ہیں ان میں تخلیق ہو رہا ہے تشکیل پا رہا ہے، کیا پاکستان اور کیا ہندوستان آج کسی بھی نیم سامراجی اور نیم جاگیردارانہ ملک میں کیریکٹر کا تصور اس جدوجہد سے باہر نہیں کر سکتے ہیں، یقیناً افراد اور منفی کیریکٹر ابھی رہیں گے، وہ جن تک کہ شعور نہیں پہونچا ہے، وہ جو کہ راستہ ڈھونڈھ رہے ہیں وہ جو کہ شعور کی مخالفت کرتے ہیں لیکن انہیں مثبت کیریکٹر کے مقابل یا مخالف پیش کرنا چاہئے تاکہ حقیقت کے صحیح رخ کا پتہ چلے، لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ آزادی کی یہ لڑائی سامراج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف صرف سیاست اور اقتصادیات ہی کے میدان میں نہیں لڑی جا رہی ہے، یہ جنگ اخلاق و فلسفہ، فن اور ادب، مذاق شعر، فن اور نفسیات کے میدان میں بھی لڑی جا رہی ہے، بڑی پیچیدگیوں کے ساتھ لڑی جا رہی ہے، بالخصوص شعور کے مظاہر میں تو وہ پیچیدگیاں اور بھی زیادہ ملتی ہیں، ہم اگر سہل انگاری یا سیدھے پن کو دخل دیں گے تو اپنے افسانوں سے لذت کھو دیں گے، ہمارے افسانہ نگار اگر بھولے بھٹکے کبھی کسی باشعور دہقان یا مزدور کو کیریکٹر بناتے ہیں تو اسے اقتصادی ... سیاسی تصورات پر کچھ ایسا جکڑ دیتے ہیں کہ وہ اچھا خاصا ایک سیاسی یا اقتصادی نعرہ بن جاتا ہے اس میں وہ حرکت، توانائی اور مختلف سمتوں پہ بڑھنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی جو کہ ایک [illegible] کا بھرپور افسانوی کردار میں ہونی چاہئے۔ نقص ہر صورت میں نکلتا ہے۔ کیریکٹر ہیرو بھی ہوتے ہیں کیوں نہ اپنے کیریکٹر پیش کیجئے جن کی تقلید میں ہم سب کیریکٹر بن سکیں اور اس نظام سے چھٹکارا حاصل کریں جو کردار کی تشکیل الگ الگ کرتا ہے جس نے منفی کرداروں کو اس بڑے پیمانے پر جنم دیا ہے نسبتاً مثبت کم دکھائی دیتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ان کی سطح سے اوپر ابھرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا ہے۔

شھلا

علی سردار جعفری

اُردو ہندی کی کشمکش

(کشمیر یونیورسٹی کے توسیعی لکچروں کی دوسری کڑی)

میں نے اپنی پہلی تقریر میں اُردو اور ہندی کے ادبی روپ اور اسٹائیلوں کے الگ الگ ہونے کے سماجی اور سیاسی اسباب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آج کی تقریر میں میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ ان دونوں کے ادبی روپ میں بنیادی فرق کیا ہے اور دونوں کا امتزاج کیسے ممکن ہے!

اس سوال کو دو طریقوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ہندی دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہندوستانی قوم کی زبان ہے اور اُردو فارسی رسم الخط کے ساتھ اس ہندی کا ایک روپ یا ادبی اسٹائل ہے۔ اس سوال کو پیش کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اُردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں یعنی ہندوستانی زبان کے دو ادبی روپ ہیں۔ جو دو مختلف رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں۔ میں سوال پیش کرنے کے دوسرے طریقہ کو صحیح سمجھتا ہوں۔ چونکہ ہندوستانی قوم کی تشکیل ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے اس لئے اس زبان کے دو ادبی روپ اس کے تہذیبی امتزاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ جاگیرداری دور کی یادگار ہے۔

اس سوال کو جس طرح بھی پیش کیا جائے دونوں طریقوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہندوستانی قوم کی تشکیل اور اتحاد کے ساتھ دونوں ادبی اسٹائیلوں کا امتزاج ناگزیر ہے جو ایک ادبی روپ اور ایک رسم الخط کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ امتزاج کیسے ممکن ہے۔ آج ہندی ادیبوں کی اکثریت یہ چاہتی ہے کہ اُردو کو کچل دیا جائے اسے پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اتحاد اور امتزاج کا یہ طریقہ غلط ہے۔ دو چیزوں کا امتزاج کسی ایک کو کچل کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ آج رجعت پسند حلقے تو بڑی بے شرمی اور بے رحمی کے ساتھ یہ حرکت کر رہے ہیں۔ لیکن بعض ترقی پسند حلقے بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ زبان سے تو وہ اُردو کو کچلنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن عمل میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستانی علاقوں میں اردو تقریباً تمام ابتدائی اور ثانوی مدارس سے نکال دی گئی ہے۔ سرکاری دفتروں میں اس کے لئے جگہ تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ اُردو کتابوں کی خریداری کے لئے سرکاری رقم میں کم سے کم حصہ رکھا جاتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب کیلئے اردو کتابوں کی اشاعت قریب قریب بند ہو چکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کہیں اُردو نصاب کی حیثیت سے باقی بھی رہ گئی ہے تو پڑھنے اور پڑھانے کے لئے کتابیں نصیب نہیں ہوتیں۔ آل انڈیا ریڈیو نے بھی اُردو پروگرام کا تناسب بہت کم کر دیا ہے۔ اخبارات اور رسائل اپنی بڑی بڑی اشاعتوں کے باوجود اشتہارات سے محروم رہتے ہیں۔ ہندوستانی اکیڈمی کو عملی طور سے ہندی اکیڈمی کی شکل دے دی گئی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان حرکتوں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ صرف اُردو حلقوں سے احتجاجی آوازیں بلند ہوتی ہیں جنہیں فرقہ پرستی کا الزام لگا کر بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر ہم اُردو کے مخالفین کی یہ بات مان بھی لیں کہ اردو صرف ہندی کا ایک ادبی روپ ہے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اردو ادب اور ادیبوں کو برابر درجہ کیوں نہیں دیا جاتا۔ جوش، جگر، کرشن چندر، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کیفی، جذبی وغیرہ کو ہندی ادیبوں کی حیثیت سے کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان کی کتابیں دیوناگری لپی میں کس طرح کیوں نہیں چھاپا جاتا۔ جس طرح مثال

کے طور پر داس، سنسکرت، من دیشپال، ادیچن وغیرہ کی کتابیں چھاپی جاتی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں میرؔ اور غالبؔ کی شاعری کو تلسی داس اور کبیر کی کتابوں کے ساتھ کیوں نہیں شریک کیا جاتا۔ لیکن ہندی حلقوں میں آجکل ایک عجیب وغریب منطق سے کام لیا جارہا ہے۔ پہلے اُردو کو ہندی کا ایک روپ کہا جاتا ہے پھر اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس پر بھی اکتفا نہ کرکے اسے کچلنے کا سامان کیا جاتا ہے۔

اب تو اُردو ادب کی حیثیت پر بھی ایک نظر ڈالئے۔ صرف اتر پردیش کے صوبہ میں انجمن ترقی اُردو نے ایک درخواست پر ان بالغوں کے بیس لاکھ دستخط حاصل کئے ہیں جو اُردو کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ دستخط کرنے والے خاندانوں کے نابالغوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو اردو والوں کی تعداد ۵۰ لاکھ سے زیادہ پہنچ جاتی ہے اور یہ تنہا اتر پردیش کے صوبہ میں ہے۔ اگر اس میں بہار، دہلی، انبالہ، رہتک، حصار، راجستھان، اور مدھیہ پردیش کے سرحدی علاقہ کے ان باشندوں کو بھی شامل کیجئے جو اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں تو کم سے کم تعداد چار پانچ کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ حکومت ہند کے پریس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق جسکا حوالہ لکھنؤ کے کانگریسی اُردو اخبار قومی آواز نے دیا ہے پورے بھارت میں روزناموں کی سب سے بڑی تعداد اُردو میں شائع ہوتی ہے۔ اُردو اخبارات اور رسائل کی اشاعت بھی سب سے زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر اُردو کے ماہنامہ "شمع" کی اشاعت ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اردو میں ایسے روزنامے اور ہفتہ وار بھی ہیں جو پچیس اور تیس ہزار شائع ہوتے ہیں۔ دہلی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے دہلی کے چیف منسٹر نے اخبارات اور رسائل کے جو اعداد و شمار دئے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں اور اُردو کی پوزیشن پر بہت اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ چیف منسٹر کے بیان کے مطابق دہلی میں اردو اخبارات و رسائل کی تعداد ۱۵۰ ہے۔ انگریزی کی ۱۴۰ اور ہندی کی ۱۰۷۔ یہ تصویر اس وقت کی ہے جبکہ پانچ سال تک اردو کچلی جاتی رہی ہے اور درجنوں پبلشنگ ہاؤس اور سینکڑوں اخبارات اور رسائل بند ہو چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستانی قوم کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں اور بھی ہیں جو پورے بھارت کے برصغیر میں بکھرے ہوئے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ کلکتہ، بمبئی، مہاراشٹر، گجرات، حیدرآباد دکن اور بنگلور میں آباد ہیں۔ ان میں سے کم سے کم پچاس ساٹھ لاکھ لوگ ہیں جو اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں۔ صرف حیدرآباد دکن میں ایسے لوگوں کی تعداد جو اردو کو اپنی مادری زبان بتاتے ہیں ۱۲ لاکھ ۵۹ ہزار دو سو چودہ ہے۔ (میمورنڈم انجمن ترقی اردو ہند، بخدمت جناب چیف منسٹر صاحب ریاست حیدرآباد دکن) ان علاقوں میں جو ہندوستانی قومی اقلیت آباد ہے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ہندی کے مقابلہ میں اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ یہ تمام اعداد و شمار ہندوستانی علاقہ میں اور سارے بھارت میں اُردو کی حیثیت اور مقبولیت کو ظاہر کرتی ہے۔

زبان کی حیثیت سے اُردو کا وجود ایک مخصوص علاقہ میں ہے۔ اور اس کے کروڑوں باشندے اسے اپنی مادری زبان کہتے ہیں ادبی حیثیت سے اس کی روایات تقریباً پانچ سو برس پرانی ہیں۔ اس کے بعد بھی اس زبان کے وجود سے انکار کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کرچکا ہوں پہلے اسے ہندی کا ایک روپ کہا جاتا ہے اور پھر اسے بالکل نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مخالفین کی دلیل کچھ اس قسم کی ہے کہ چونکہ اردو صرف ہندی کا روپ ہے اس لئے اسے ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند مسلمانوں کو اس سے جذباتی لگاؤ ہوسکتا ہے۔ وہ اسے استعمال کرکے اپنے جذبات کی تسکین کرسکتے ہیں۔ لیکن اس زبان یا اس ادبی روپ میں تعلیم حاصل کرنے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ یا سیاسی نظم ونسق میں اسے جگہ دینے کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ اگر ایسا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ فرقہ پرستی کا مطالبہ ہے۔ جس سے ہندوستانی قوم کی وحدت کو نقصان پہنچتا ہے اور اس منطق سے اردو بالکل کچل دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ محض یہ کہ اردو اور ہندی کا امتزاج ناممکن ہوا جارہا ہے بلکہ خود ہندی زبان کی جڑیں کٹی جارہی ہیں۔ آج بدقسمتی سے ہندی کا گلا وہ لوگ گھونٹ رہے ہیں جو اس کے پرستار ہونے کے دعویدار ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ خود ہندی کی ترقی کے لئے اردو کا تحفظ ضروری ہے۔ اور اس بات کی وضاحت صرف اس وقت ممکن ہوگی جب ہم دونوں اسٹائیلوں کے بنیادی فرق کو صحیح طور سے سمجھ لیں گے۔

حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کچھ فارسی کی طرف زیادہ جھکی ہوئی ہے اور ہندی سنسکرت کی طرف لیکن یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے ۔ اگر اس طرح اس مسئلہ کو پیش کیا جائے تو یہ کچھ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور دلیل کچھ اس قسم کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ چونکہ فارسی ایک بیرونی زبان ہے اس لئے فارسی کی طرف جھکاؤ قوم پرستی کے مفاد کے خلاف ہے بلکہ قوم کے نظریہ سے غداری کرنے کے برابر ہے ۔ مگر سنسکرت خواہ وہ مردہ ہی سہی لیکن ہندوستان کی کامیاب زبان ہے اور اس لئے صرف اس سے تقویت حاصل کی جا سکتی ہے ۔ یعنی ہر جدید ہندوستانی زبان کو ۔ دردارا ور باوقار زبان بننے کے لئے سنسکرت کا سہارا لینا چاہیئے ۔ اس طرح ایک مصنوعی زبان بنانے کیلئے راستہ ہموار ہوتا ہے ۔ اس لئے مسئلہ کو اس طرح پیش کرنے کا طریقہ غلط ہے ۔ ایسے سینکڑوں اشعار اور فقرے اور مصرعے پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں ایک لفظ بھی فارسی یا عربی کا نہ ہو پھر بھی انھیں ہندی کے بجائے اردو کا نام دیا جائے گا ـــــ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرونگا۔

ننگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

تارہ ٹوٹتے سب نے دیکھا یہ نہ دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا نہ ہوتا کچھ تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

بکھرے ہیں آنکھ میں آنسو اداس بیٹھے ہیں

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہیں لمبے دیکھو بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ بنے

تم سے لڑیں گے آ کے وہ ایسے کہاں کے ہیں

شاہراہ

بھیا تم ہی سے لے گی بہن لپنے بھائی کو

ان دونوں میں حد، اور نالہ کے سوا کوئی بیرونی لفظ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایسے اقتباسات بھی پیش کئے جا سکتے ہیں جو اور نالہ کے الفاظ کی آمیزش سے۔ پھر بھی انھیں اُردو نہیں بلکہ ہندی سمجھا جائے گا۔ مثلاً

رام کی دیوانی میرو دردونہ جانے کوئے

حد حد سب ہی کوئی جائے بے حد کے جو کوئے
بے حد کے میدان میں سکھ سے گیرا ہوئے

یہاں نہ محنت کش کی روٹی چھین اور کھا پائے

یہ دیتوں کی تیرتھ بھومی ٹیگ کا پریل تقاضا
صرف پرتھم ساماراجیوں کا یہاں نکلا جنازہ

یہاں سنگھٹت جنگجیوں کی ٹولا کرتی ٹولی

پھر شہید رکت دان یاد کر رہے ہیں

بھارت بھر میں اگر غلامی کا رہ گیا نشان کہیں
بہتر ہے دنیا کے نقشہ میں ہے ہندوستان نہیں

سدا دیانت محنت ہمت سے کرتے تھے کام کٹھن تھے

ان مصرعوں میں شعروں میں۔ دیوانی، درد، محنت، حد، بے حد، میدان، محنت کش، تقاضا، جنازہ، ٹولی، شہید، یاد، اگر، غلامی، نشان، بہتر، دنیا، نقشہ، ہندوستان، دیانت اور ہمت عربی اور فارسی الفاظ ہیں۔

اس لئے دونوں ادبی اسٹائلوں کے اصل فرق کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس مسئلہ کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ بول چال کی زبان ایک ہے لیکن اس کے ادبی روپ دو ہیں تو اس بات کو میکینکل طریقے سے نہیں سمجھنا چاہئے اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ زبان جس نے دہلی، آگرہ اور لکھنؤ جیسے شہروں میں ترقی کی ہے ان بولیوں سے مختلف ہے جو اودھی اور برج بھاشا کی طرح کل تک ساہتی عہد تک تو بیوں کی زبانیں تھیں۔ اور اب دیہات میں ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ زبان اور ان بولیوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اودھی اور برج بھاشا کھڑی بولی کی ترقی اور نشو و نما پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستانی علاقہ کے عوام کی قومی زبان کی حیثیت صرف کھڑی بولی کو حاصل ہوئی ہے اور اس لئے اب اودھی اور برج بھاشا کو وہ بنیادی اہمیت حاصل نہیں رہ گئی ہے جو آج سے چند صدی پہلے حاصل تھی۔ اب وہ کھڑی بولی میں جذب ہو جائیں گی۔ جسے ہم جدید ہندی یا جدید اُردو کہتے ہیں۔

برج بھاشا، اودھی اور دوسری بولیوں کی ادبی ترقی صرف شاعری تک محدود تھی جس نے اس ادب کا روپ اختیار کیا جسے ہندی کہتے ہیں۔ ان بولیوں کے بڑے بڑے شاعر کبیر، سور داس، ملک محمد جائسی، تلسی داس وغیرہ تھے۔ لیکن ان کے برعکس کھڑی بولی کی ادبی ترقی صرف شاعری تک محدود نہیں ہے اس نے جدید ہندوستانی قوم کی قومی زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس کی ادبی ترقی نظم و نثر کے ساتھ ہر علمی شعبہ میں نظر آتی ہے۔ اس زبان کی ادبی ترقی نے اپنے ابتدائی تین چار برس میں جو روپ اختیار کیا وہ اُردو تھا باوجود اس کے کہ کبیر اور تلسی داس کی زبان میں کہیں کہیں کھڑی بولی کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ یہ بنیادی طور سے کھڑی بولی کے شاعر نہیں تھے۔ کھڑی بولی کے اصلی شاعر ولی، میر، نظیر، سودا، غالب، انیس، حالی وغیرہ ہیں جو اُردو شاعروں کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ابتدا میں اپنی زبان کو ہندی کہتے تھے پھر اس کا نام اُردو پڑ گیا (میں ابھی جدید دور کی بات نہیں کر رہا ہوں) اس لئے سور، کبیر، اور تلسی وغیرہ کی شاعری کی زبان دیہات کی بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے جو اب بھی رائج ہے۔ یہ زبان بہت خوبصورت اور سادہ ہے۔ لیکن اب شہروں کی زبان سے دور ہٹ گئی ہے۔ ولی، نظیر، میر، سودا، اور غالب وغیرہ کی شاعری کی زبان شہروں میں رائج بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے لیکن دیہات کی بولیوں سے بہت دور ہٹی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ہے

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

شہروں اور قصبوں کی بول چال کی زبان میں کہا گیا ہے لیکن یہ شعر

کن کن کن کن تو پڑ دھن سن
کہت لکھن سن رام ہرلے گن

دیہات کی بول چال کی زبان میں کہا گیا ہے۔ پہلا شعر غالب کا ہے اور دوسرا تلسی داس کا۔

اس حقیقت کو صرف پنڈت جواہر لال نہرو اور منشی پریم چند ہی نے تسلیم نہیں کیا ہے جنھوں نے یہ کہا کہ اُردو شہروں کی زبان ہے اور ہندی دیہات کی بلکہ جدید ہندی ادب کے بانی بھارتیندو ہرلیش چندر نے بھی مانا ہے جنھوں نے ۱۸۷۱ء میں اگروالی جاتی پر اپنی کتاب کی بھومیکا میں یہ لکھا ہے کہ

"یہ بات صرف اگروالوں، کایستھوں اور کشمیری برہمنوں ہی کے متعلق نہیں ہے بلکہ ہندوستانی علاقہ کے تمام فرقوں اور جاتیوں کے لئے صحیح ہے۔ جس طرح ایک قوم کے مختلف فرقے الگ الگ زبانیں نہیں بولتے اسی طرح ایک قوم کی مختلف جاتیاں بھی الگ الگ زبانیں استعمال نہیں کر سکتیں۔"

غرض یہ کہ صدیوں تک کھڑی بولی ہی کو اُردو سمجھا جاتا رہا ہے۔

وہ دور جس میں کھڑی بولی نے نشو و نما پا کر ہندوستانی علاقے کے عوام کی قومی زبان کی حیثیت اختیار کی مسلم حکومت اور پھر برطانوی اقتدار کا دور ہے یہی وجہ ہے کہ پہلے عربی فارسی اور ترکی کے الفاظ اور پھر پرتگالی اور انگریزی الفاظ کی سب سے زیادہ آمیزش کھڑی بولی میں ہی ہے۔ اودھی اور برج بھاشا میں اتنی آمیزش نہیں ہے۔ یہ اثر اتنا زبردست تھا کہ صرف ہماری زبان ہی نہیں بلکہ ہماری قوم کا نام بھی فارسی ہی سے لیا ہے۔ جس طرح اُردو اور ہندی بیرونی الفاظ ہیں بالکل اس طرح ہندوستان اور ہندوستانی بھی بیرونی الفاظ ہیں۔ جس طرح گوتم بدھ کی تصویروں کو ان کے یونانی چہرے کے بغیر نہیں پہچانا جا سکتا اسی طرح ہم اپنی زبان کو بھی اس کے فارسی نام کے بغیر نہیں پہچان سکتے۔

ہماری زبان میں بیرونی الفاظ کی آمیزش کتنی ہے؟ اُردو کی مشہور لغت فرہنگِ آصفیہ میں کل ۵۴ ہزار الفاظ ہیں۔ ان میں سے (۵،۸۴۴) عربی الفاظ ہیں (۶۰،۶۱) فارسی الفاظ (۱۰۱) ترکی، پرتگالی، انگریزی اور فرانسیسی الفاظ ہیں۔ قریب قریب ان تمام

والا ہے۔ ہمیں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ چنانچہ ہندی کی مشہور لغت "شبد ساگر" میں جو ناگری پرچارنی سبھا کے زیر اہتمام مرتب کی گئی ہے یہ تمام الفاظ موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گذشتہ چھ سو برس میں ہماری زبان نے پچیس فیصدی سے کم بیرونی الفاظ لئے ہیں۔ ان الفاظ نے ہماری زبان کے سرمایۂ الفاظ میں یقیناً اضافہ کیا ہے۔ اور کسی طرح زبان کو نقصان نہیں پہونچایا ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگر قرون وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں اور مسلم عوام کو ایک ہی سمجھ لیا گیا اور سب کو بدیسی کا لقب دے کر علیحدہ اور دور قرار دے دیا گیا تو زبان اور تہذیب کے متعلق کوئی صحیح نقطۂ نظر اختیار کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے زیر اثر بہت سے ہندی تاریخ داں ایک غلط تصور رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کوئی ایک خالص ہندوستانی تہذیب کے قسم کی چیز ہے جو اس وقت مکمل ہو چکی تھی جب ہندوستان بدیسی اثرات سے محفوظ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس سے ہندوستانی تہذیب مسخ ہوئی ہے، خراب ہو گئی ہے، گندی ہو گئی ہے، اور اس لئے آج ہمیں بدیسی اثرات سے اپنی تہذیب، سماج اور زبان کو پاک کرنے کیلئے جد و جہد کرنی چاہئے لیکن ایک ارتقا پذیر اور متحرک سماج کا تصور اس سے مختلف ہوتا ہے جس میں سماج یا تہذیب کو ساکن اور جامد چیز نہیں سمجھا جاتا۔ سماج کے ساتھ ساتھ تہذیب بھی بدلتی اور ترقی کرتی رہتی ہے۔ اس تصور کے بغیر ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہندوستانی قوم کی تشکیل کے زمانے میں جو گذشتہ تین چار سو برس سے جاری ہے۔ نہ صرف بہت سی پرانی سامنتی قومیتوں فرقوں اور ذاتوں کی شیرازہ بندی ہوئی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمان بھی اس جدید قوم کے حلقے میں داخل ہوئے ہیں جو یہاں بدیسیوں سے بدیسی زبانیں اور مذہبی روایات اور رسم و رواج لے کر آئے تھے۔ جب وہ یہاں آکر بس گئے تو انھوں نے اپنی زبانیں، اپنے لباس ترک کر کے ہندوستانی اور ہندوستانی طور طریقے اختیار کرنے شروع کئے۔ اس عمل میں وہ بدیسی۔ ہندوستانی بن گئے لیکن ہندو نہیں بن سکے جو راہل سنکرتیاین اور پنڈت بال کرشن شرما کی خواہش ہے۔ ہندوستانی بننے اور ہندوستانی قوم کی شیرازہ بندی کے اس عمل میں مسلمانوں نے بھی ہندوستانی تہذیب کے مشترکہ خزانہ میں کچھ بیش بہا اضافے کئے۔ یہ اثر ہماری مشترکہ قومی تہذیب کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ موسیقی، مصوری، عمارت گری، کھانا، لباس، طور طریقے غرض ہر چیز اس سے متاثر ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر راگوں میں خیال اور میاں کی توڑی، سازوں میں ستار اور طبلہ اور سرود، عمارت گری میں محراب گنبد اور مینار، لباس میں شیروانی اور پاجامہ، کھانوں میں قورمہ، پلاؤ اور کباب وغیرہ سب مسلمانوں کی دین ہے۔

ظاہر ہے کہ زبان اور ادب بھی اس اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ زبان ایک بہت حساس شے ہے جو ماحول، تہذیب، مزاج ہر چیز کی تبدیلی کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

کیا آپ ایسے آدمی کو دیوانہ نہیں کہیں گے جو قوم پرستی، حب الوطنی اور اتحاد کے نام پر طبلہ، ستار، خیال اور میاں کی توڑی کو مٹانے پر اس لئے آمادہ ہو جائے کہ ان میں سے مسلمانوں کی بو آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بدیسی نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی بنیاد ہندوستان کے صدیوں پرانے نظام موسیقی پر قائم ہے۔

اسی طرح ان دیوانوں کی دیوانگی کو بھی آزادی نہیں ملنی چاہئے جو اردو کو مٹا کر ہماری حسین اور میٹھی زبان کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ معصوم سی جد و جہد جو بظاہر بدیسی اثرات کے خلاف ہندوستان کی قومی اور تہذیبی جد و جہد معلوم ہوتی ہے آخر میں بڑی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے اور زبان اور تہذیب کے گذشتہ کئی صدیوں کے ارتقا سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ لیکن واقعات اور حقائق کی منطق بڑی ظالم ہوتی ہے۔ اگر یہ عناصر اپنی دیوانگی میں بھی تھوڑی سی ایمانداری سے کام لیں تو انھیں اپنی جد و جہد کی ابتدا یہاں سے کرنی پڑے گی کہ وہ اپنی زبان ہندی اور اپنی قوم ہندوستان کا بدیسی نام تبدیل کر کے انھیں کوئی دیسی نام دیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایسے دیوانے بھی موجود ہیں جو ہندی زبان کا نام تبدیل کر کے اسے بھارتی کہنا چاہتے ہیں۔

کھڑی بولی کو نشو و نما اس پورے دور میں جس میں یہ بولی ترقی کر کے جدید ہندوستانی قوم کی قومی زبان نہیں ہے ہندی شاعروں کی اکثریت برج بھاشا میں اس لئے شاعری کرتی رہی ہے کہ ان کے نزدیک کھڑی بولی شاعرانہ اظہار و بیان کے لئے موزوں اور لچکدار زبان نہیں تھی۔

اس لئے پہلے پہل کھڑی بولی کو ادبی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا سہرا اُردو شاعروں کے سر ہے۔ انھوں نے بول چال کی زبان کو مانجھا ایسے خوبصورت اور لچک دار بنایا اور ایسے اس قابل کر دیا کہ وہ بولی کی محدود دنیا سے نکل کر زبان کے وسیع میدان میں آجائے اور دوسری قوموں کی ترقی یافتہ زبانوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ ان کی کوششوں سے زبان اور محاوروں کی صحت کا ایک معیار قائم ہوگیا۔ اس دور کے بڑے ادبی مرکز دہلی اور لکھنؤ کے شہر تھے۔ اور وہیں کی بول چال کی زبان معیاری اور ٹکسالی زبان سمجھی جاتی تھی۔ ہندی کے پاس اس قسم کا کوئی معیار نہیں تھا۔

گوسائیں تلسی داس اور بھارتیندو ہریش چندر کے درمیان تقریباً تین سو برس کا فاصلہ ہے۔ اس پورے عرصہ میں آپ کو کھڑی بولی میں لکھنے والے کسی بڑے ہندی شاعر کا نام نہیں ملے گا۔ یہ سارا دور اُردو شاعروں کے ناموں سے جگمگا رہا ہے جن میں عظیم ترین نام ولی دکنی (سترھویں صدی) نظیر، میر، سودا۔ (اٹھارویں صدی) انیس، غالب، حالی، اکبر (انیسویں صدی) کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی علاقہ کے عوام کی زبان پر ضرب المثل کی طرح جو اشعار اور مصرعے چڑھے ہوئے ہیں وہ یا تو تلسی داس اور کبیر کے ہیں یا سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اردو شاعروں کے ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر ہندی والے بھی مجبور ہیں کہ کھڑی بولی کو معیاری ادبی زبان اُردو شاعروں اور ادیبوں نے بنایا ہے۔ لیکن وہ اسے اس طرح مسخ کر کے پیش کرتے ہیں کہ اُردو زبان کی لطافت اور نفاست مغل درباروں کی رہین منت ہے حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو کبھی مغل درباروں کی سرکاری زبان نہیں رہی ہے۔ ہندی شاعروں نے سنجیدگی کے ساتھ کھڑی بولی لکھنے کی طرف انیسویں صدی کے آخری زمانہ میں توجہ کی ہے۔ اس لئے بھارتیندو ہریش چندر کو جدید ہندی کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اُردو اور ہندی دونوں میں نثر نگاری اٹھارویں صدی کے آخری زمانے میں تقریباً ساتھ ساتھ شروع ہوئی ہے لیکن اُردو والوں کو ہندی والوں پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ ان کے پاس کھڑی بولی میں دو تین سو برس کی شاعرانہ نشو ونما کی روایات موجود تھیں جس کی بدولت انھیں ایک ٹکسالی اور معیاری زبان مل گئی تھی۔

چونکہ ہندی کے ادبی روپ کی نشو ونما اردو کے ادبی روپ کی نشو ونما سے کئی صدی پیچھے رہ گئی تھی اس لئے آج ہندی اور اردو کے ادبی اسٹائیلوں میں اتنا فرق نظر آتا ہے۔ یہاں ان باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جن کا ذکر میں اپنی پہلی تقریر میں کر چکا ہوں۔ ایک یہ کہ ابتدائی دور میں اُردو ادب پر تصوف کے اثرات بہت گہرے تھے اور ہندی ادب پر بھگتی تحریک کے اثرات تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہندی شاعروں نے کھڑی بولی کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا تو اُردو شاعروں نے برج بھاشا اور اودھی کو ترک کر دیا تھا۔ سودا، غالب آخری کلاسیکی شاعر ہیں جنھوں نے برج بھاشا اور اودھی کو استعمال کیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ رسم الخط کے علاوہ دونوں اسٹائیلوں میں کیا فرق ہے؟ فارسی آمیز اُردو اور سنسکرت آمیز ہندی سے قطع نظر جو بول چال کی زبان سے بہت دور ہو جاتی ہے اور صرف ایک چھوٹے سے علمی حلقہ میں سمجھی اور پسند کی جاتی ہیں اور اس لئے عوام میں مقبولیت نہیں حاصل کر سکتیں، اُردو اور ہندی کے ادبی روپ کا بنیادی فرق حسب ذیل ہے۔

(۱) ہندی کے مقابلہ میں اُردو میں الفاظ کا سہل اور آسان ہو جانے کا عمل زیادہ گہرا ہے مثال کے طور پر ہندی کے الفاظ جیسے کھنڈہر، جوا ہی، اونٹھ، لوہو، سہاونا، سنہلی، گھبرانا، پودھا اور دھوکھا اُردو میں آکر کھنڈر، جماہی، ہونٹ، لہو، سہانا، سنہری، گھبرانا، پودا اور دھوکا بن جاتے ہیں۔ ہندی کے مشہور ادیب مہا پنڈت راہل سنکر تیاین کا یہ جملہ کہ "دنیا اپنی جیٹھی کنیا کو کماری رکھ کر دوسروں کا وواہ کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔" جب اُردو میں لکھا جائے گا تو "جیٹھی کنیا بڑی بیٹی کماری۔ کنواری اور وواہ بیاہ بن جائے گا۔

(۲) اکثر الفاظ کا آخری حرف ہندی میں زور دے کر ادا کیا جاتا ہے لیکن اُردو میں بڑی نرمی کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اس لئے ہندی کا "یہہ" اور "وہ" اُردو میں آکر "یہ" اور "وہ" بن جاتا ہے۔

(۳) بعض اُن حروف کا جن کی ہندی میں آدھی آواز نکلتی ہے اُردو میں پورا تلفظ کیا جاتا ہے کیونکہ یہ تلفظ زیادہ آسان ہے۔ مثلاً ہندی میں "شکتِ" شانتِ" اور "کرِ" کہیں گے لیکن اُردو میں شکتی، شانتی اور کری کہا جائے گا۔ اسی طرح ہندی کا "جنّم" اردو میں جنم ہو جائے گا۔

(۴) اُردو اور ہندی میں تلفظ کے دو ایک فرق بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندی کا "بہوت" اردو میں "بہت" بن جاتا ہے ہندی میں "اپنا" اور "اپنی" "اپن" ہے لیکن اُردو میں اپنا اور اپنی۔

(۵) بعض الفاظ میں ہندی "ای" اُردو میں "یہ" بن جاتا ہے۔ مثلاً ناگن اور ناگن، مندیا ور مندر (اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُردو کے ادیبوں نے جان بوجھ کر ہندی کے تلفظ کو مسخ کیا ہے۔ دراصل یہ کھڑی بولی کا قانون ہے جس نے ہندی کے الفاظ کے تلفظ کو بدلا ہے، اس کے ساتھ ساتھ "تدبھو" سے "تت سم" کی طرف جانے کا عمل جاری تھا جس کی ہندی والوں نے مخالفت کی ہے اور اُردو والوں نے حمایت کیونکہ یہ عمل ہماری زبان کے صوتی نظام کے مطابق ہے جو سنسکرت اور فارسی کے صوتی نظام سے مختلف ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہندوستانی علاقہ اور خصوصیت کے ساتھ مغربی علاقے جو کھڑی بولی کا علاقہ ہے وہاں کے عوام الفاظ کا تلفظ ہندی کے ادبی روپ کے مطابق کم اور اُردو کے ادبی روپ کے مطابق زیادہ کرتے ہیں۔ روزمرہ میں وہ تت سم کا استعمال تدبھو سے زیادہ ہے)

(۶) ہندی اور اُردو میں مذکر اور مونث کے بھی بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً "دھارا" کا لفظ ہندی میں مونث ہے اور اُردو میں مذکر۔ اس لیے اس کی جمع ہندی میں "دھارائیں" اور اُردو میں دھارے بنتی ہے۔ ہندی کے اکثر ادیب "سایہ" کو مونث اور "جنگ" کو مذکر استعمال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندی میں مذکر اور مونث کے معاملہ میں بڑا کھیلا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ ان کے پاس ٹکسالی اور روزمرہ کا کوئی معیار نہیں ہے۔

(۷) ہندی اور اُردو کے درمیان بیشتر محاورے مشترک ہیں لیکن بعض شہری محاورے ایسے ہیں جو ہندی میں جگہ نہیں بنا سکے اور بعض دیہاتی محاورے ہیں جو اُردو سے خارج ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض محاورے ذرا سے اختلاف کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً اُردو میں کہتے ہیں "بال بیکا ہونا" اور ہندی میں "بال بانکا ہونا" (بیکا اور بانکا ہم معنی لفظ ہیں) ویسے عام طور سے محاوروں اور عام کہاوتوں کے استعمال میں ہندی ادیب کمزور ہیں۔ راہل جی کا یہ جملہ لیجیے "سکھوشنکام کا روک بھی اپنے ہاتھ میں نہیں تھا" یہاں خوش مذاقی کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرا محاورہ استعمال کیا جائے "اپنے بس میں نہیں تھا" اُردو کے ادیبوں کو محاروں اور لفظوں کے صحیح استعمال پر زیادہ قابو ہے۔ اُردو کا کوئی ادیب یہ نہیں لکھے گا۔

"امریکہ کی تہ میں پڑکر" وہ کہے گا "امریکہ کی تہ پاکر"

"گہری رقم" کی بجائے وہ کہیگا "بھاری رقم"

"اب تو اوکھل میں سر پڑ چکا تھا" "اب تو اوکھلی پر سر پڑ چکا تھا"

"پچیسوں گھاٹ کا پانی پی چکا تھا" "گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا"

لیکن ہندی میں محاروں اور الفاظ کا اوٹ پٹانگ استعمال بہت عام ہے جس کی مثالیں راہل جی یشپال اور دوسرے ہندی ادیبوں کے یہاں ملیں گی۔

(۸) مرکب الفاظ بنانے کے دو طریقے اُردو میں براہ راست فارسی سے آئے ہیں۔ ایک اضافت اور دوسرے عطف۔ "دل کا درد" اضافت سے "دردِ دل" اور "باغ اور بہار" عطف سے "باغ و بہار" بن جاتا ہے۔ اس طرح "کا" اور "اور" کا لفظ خارج ہو جاتا ہے۔ اساتذہ اضافت اور عطف کو صرف فارسی الفاظ کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اور اب بھی پرانے خیال کے لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن بعض ترقی پسند ادیب اس قاعدہ کو وسعت دے کر عطف و اضافت کو ہندی الفاظ کے ساتھ بھی جائز سمجھتے ہیں۔ اور وہ اپنے جواز میں انشا اور میر کی روایت پیش کرتے ہیں جنھوں نے "دنیا کے چاندنی" اور "رخسار چھبی" کی ترکیب استعمال کی ہیں جن میں ایک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی ہے۔ اضافت خال خال ہندی میں بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ عطف کے بگڑی ہوئی شکل ہے یا

علمت سے ملتی جلتی چیز ہے جو ہندی میں بھی رائج ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ ہر باغ و بہار" "باغ و بہار" ہو جاتا ہے۔

(۹) حالانکہ جملوں کی ترکیب اور الفاظ کی ترتیب کے اصول ہندی اور اُردو میں الگ الگ نہیں ہیں۔ کیونکہ دونوں کی صرف و نحو مشترک ہے پھر بھی دونوں کے عمل میں بڑا فرق ہے۔ اور یہ فرق بہت اہم ہے۔ اُردو میں کسی جملے یا فقرہ میں الفاظ کی نحوی ترتیب کو تبدیل کر دینا بہت بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف اس وقت جائز ہے جب ترتیب الفاظ کو کسی لفظ پر زور دینے یا کسی مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کیلئے بدلا جائے۔ شاعری میں چونکہ نحوی ترتیب الفاظ کو باقی رکھنا ذرا مشکل کام ہے۔ اس لئے اچھے شعر میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو الفاظ کی ترتیب نحوی ترتیب سے قریب رہے۔ اور اس لئے بہترین وہ سمجھے جاتے ہیں جنھیں شاعری کے ساتھ ساتھ الفاظ کی ترتیب ایسی ہو کہ نثر و نظم میں فرق نہ رہ جائے۔ مثلاً

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

اگر اس خیال کو نثر میں بھی ادا کیا جائے تو الفاظ کی ترتیب یہی رہے گی۔ ہندی میں عام طور سے یہ طریقہ رائج ہے کہ الفاظ کی نحوی ترتیب پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ اور شاعری میں خاص طور سے الفاظ کی ترتیب بگاڑ دی جاتی ہے۔

میں اس کی وضاحت ذرا تفصیل سے کرونگا۔ اُردو کا ایک مصرعہ ہے ؏

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے

اس مصرعہ میں الفاظ کی ترتیب بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس کو بہت بڑا عیب سمجھا جائے گا اگر اس مصرعہ کو اس طرح لکھا جائے ؏

گئے ہار زمین سے کاٹنے والے پہاڑ کے

لیکن ہندی میں اس کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ اُردو میں معمولی تعقید بھی ناقابل برداشت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہندی میں کھڑی بولی لکھتے وقت اکثر تعقید کی آخری حدیں چھو لی جاتی ہیں۔ اور اعتراض کا جواب یہ ملتا ہے کہ جناب ہم ہندی لکھ رہے ہیں اُردو نہیں جس کی نوک پلک مغلوں کے دربار میں سنواری گئی ہے۔ مثال کے طور پر ہندی کے بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں کے فقرے اور مصرعے لیجئے۔

"پل پل بھر میں ہی تھی اسے دیکھ لیتی"	(پنڈت گیا پرشاد شکل سہنی)
"بھوک سے سوکھ ہونٹ جب جاتے"	(نرالا)
"مجھے آشیر یہ ہوتا تھا عثمانیہ وشوودیالے کے اس پروفیسر کے اوپر"	(راہل سنکرتیاین)
"توپ، ٹینک، گورے نہ کبھی سکیں ڈرا ؟"	(سمن)

اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہندی کے ایک نوعمر شاعر شد مرجوش نے لکھا ہے ؎

"میرے پاس نہیں پونجی ہے"
جن کے پاس نہیں اپنی بھوجی ہے"

اور اُردو کے مشہور افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک جب ہندی لکھتے ہیں تو وہ بھی اس تکنیک سے کام لیتے ہیں۔ ان کا ایک مصرعہ ہے ؏

"کام رہے کرتے اس پہ پہر"

اُردو میں الفاظ کی ترتیب اس طرح ہو گی:۔

"پل بھر میں ہی اسے دیکھ لیتی تھی"
"جب بھوک سے ہونٹ سوکھ جاتے تھے"
"عثمانیہ وشودیالے کے اس پروفیسر پر مجھے آشیر یہ ہوتا"
"توپ، ٹینک، گورے نہ کبھی ڈرا سکیں"

"میرے پاس پونجی نہیں ہے"
"بیک پر اپنی بیوی نہیں ہے"
"اس پر ہم کام کرتے رہے"

اور اگر شعری ضرورت کے لئے کہیں ترتیب بدل جائے گی تو اس حد تک اس پر صحیح ترتیب کا دھوکہ ہو اور وہ کانوں کو ناگوار نہ گذرے۔
الفاظ کی نحوی ترتیب بدل دینے کی ایک اور مثال دیوگی سری کے ہاں ملتی ہے جو عام طور سے برج بھاشا میں لکھتے ہیں۔

"کا در تو جیوت مرت دن میں بار ہزار"

اُردو میں "بار ہزار" کے بجائے "ہزار بار" لکھا جاتا ہے۔
ہندی تحریروں میں عام ہے لیے عام لیکن انتہائی اہم الفاظ بڑا اکھڑا اکھڑا اور بھدا ہوتا ہے جیسے "کا، کی، کو، میں، نہ، نہیں، بھی، ہی وغیرہ۔ میں ہندی کے بہت بڑے ادیب پنڈت راہل سنکرتیائن کے یہاں سے مثال دینے پر اکتفا کرونگا۔ یہ راہل جی کی نئی کتاب "روس میں پچیس ماس" کے چند جملے ہیں۔

"انت میں وہ لکھنؤ میں چلے گئے"
"اس کو ایک لڑکی ہوئی تھی"
"ایک گھر تھا جس میں ہی ان کی بیوی ساس اور سالی رہتی تھی"
"ساتھ ہی ان کے پاس میں شیشوں کے گلدستوں میں شمشاد کی ہری پتیاں تھیں"
"لکھنؤ میں سینہ کا ٹھہرے مینہ تو تھا ہی"

اُردو کے قاعدے کے مطابق ان پانچوں جملوں کے اندر "میں، کو، ہی، میں، اور تو" کا استعمال غلط ہے۔ آخری جملے میں "تو بھی" کے بعد "تو ہی" کے الفاظ زائد ہیں۔ یہاں مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ گلدستوں کے لفظ کی جگہ گلدانوں کا لفظ صحیح ہوتا۔
اُردو میں نہ، اور نہیں کے استعمال میں ایک بڑا لطیف فرق ہے جو ہندی میں باقی نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر چند مصرعے لیجئے۔

"نہیں جائے گی نہ تو س بھوئے"
"جہاں دیانت اور محنت کا ہوتا یوں ایمان نہیں ہے"
(اوپندر ناتھ اشک)

"میں بیٹا ہوں، مجھ میں بل ہے، مجھ میں ہمت"
"کام نہ ملتا، کام نہ ملتا، کام نہ ملتا"
"لکھ نا سکتے، کہہ نہ سکتے"
"جو کوئی کچھ لکھتا اوں کو سہہ نا سکتے"

(سدھر جوشی)

اُردو کے قاعدے کے مطابق اشک کے مصرعوں کے ہر "نہیں" کو "نہ" ہونا چاہئے اور سدھر جوشی کے مصرعوں کے ہر "نہ" یا "نا" کو "نہیں" ہونا چاہئے۔ اُردو میں "کام نہ ملتا" "کام نہیں ملتا" کے معنوں میں کبھی استعمال نہیں ہوگا۔ "ملتا" کے ساتھ "نہ" کا استعمال صرف اس وقت صحیح ہوگا جب ہم یہ کہیں "اگر کام نہ ملتا" "کوشش نہ کرتے اور کام نہ ملتا" "کوشش کرتے تو بھی کام نہ ملتا"
ہندی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسے جملوں میں سے "کے" اور "کر" خارج کر دیتے ہیں جیسے "بن کر" "مل کے" "رہ کے" مثلاً

مشاہدہ

"پاپا میں نے بچپن پھر سے بیٹی بن آیا" (سبھدرا کماری چوہان)

"ہاں سکھی آؤ ہاتھ کھول ہم" (سمترا نندن پنت)

"چودہ رتن کبھی ساگر کو متھ پائے تھے سوراسوروں نے" (اوپندر ناتھ اشک)

"کرایہ دے، ٹیکسی پر سامان رکھ" (راہل سنکرتیاین)

جب یہ جملے اُردو میں لکھے جائیں گے تو یوں ہوں گے :۔

"بچپن بیٹی بن کر آیا"۔ "ہاتھ کھول کر ہم"۔ "کبھی سوراسوروں نے ساگر کو منتھ کر چودہ رتن پائے تھے"۔ "کرایہ دیکر ٹیکسی پر سامان رکھ کر" وغیرہ۔

ہندی کی عبارت میں اکثر و بیشتر "تھا" اور "ہے" کی طرح کے فعل کو بھی خارج کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اُردو میں یہ ممنوع ہے مثلاً

"دو ٹوک کلیجہ کے کرتا، پچھتاتا، بیٹھ پر آتا" (نرالا)

"تڑپنے کے مارے دم گھٹتا" (سدھر جوش)

"تجارت سری کھے بڑھے جا رہے" (اوپندر ناتھ اشک)

اُردو کے قاعدے کے مطابق یہاں ہر فقرے اور مصرعے کے آخر میں "تھا" یا "ہے" کا ہونا ضروری ہے۔ ہندی میں اس کی بالکل ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ان تینوں فقروں کا ہر لفظ ہندی اور اُردو میں مشترک ہے لیکن پھر بھی "تھا" اور "ہے" کے بغیر "آتا" "گھٹتا" اور "جا رہے" کے استعمال نے ان فقروں کو ہندی ادبی اسٹائل دیدیا ہے۔

ہندی کی ایک اور خصوصیت ہے۔ اُردو میں بعض مخصوص مواقع پر بعض ایسے الفاظ میں جو "آ" پر ختم ہوتے ہیں "آ" "اے" میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی لفظ واحد ہی رہتا ہے جمع نہیں بنتا۔ مثلاً "کتا" "کتے" بن جاتا ہے۔ آگرہ اور کلکتہ آگرے اور کلکتے۔ لیکن ہندی میں ایسا نہیں ہوتا۔

"جس نے چوں کی وہیں گئی ہنسیا سے گردن ماری" (سومن)

"جس پر اسے سرِ بازار کوڑا لگانے کی سزا ہوئی تھی"

"اس نے کچھ مرثیہ گائے"

"سرکہ یا سرکہ والی پیاز"

"ہم بچے بھیڑیا کے ہیں"

"دنیا کو کھینچ کر ایران پہنچانے میں بیٹا بیٹی کا بڑا ہاتھ تھا"

"کلکتہ بیٹھے بیٹھے سر درد پیدا ہوا" (راہل سنکرتیاین)

اُردو میں آکر "ہنسیا" ہنسیے، کوڑا، کوڑے۔ مرثیہ۔ مرثیے۔ سرکہ والی، سرکے والی۔ بھیڑیا، بھیڑیئے۔ بیٹا، بیٹے۔ اور کلکتہ، کلکتے ہو جائے گا۔ پھر عبارت یوں ہو جائے گی جیسے مثال کے طور پر

"اس نے کچھ مرثیے گائے"۔ "ہم بچے بھیڑیئے کے ہیں" وغیرہ

پھر ہندی اور اُردو میں دو لفظی یا سہ لفظی فعل کے استعمال میں بھی فرق ہے۔ اُردو میں ایسے فعل کے لفظوں کو الگ الگ کر کے انکے درمیان دوسرے الفاظ ٹھونس دینا عام طور سے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہندی میں یہ عام طور سے رائج ہے جسکی وجہ سے اُردو کا معیار سے بڑی بھدی اور بھونڈی تعقید پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر

"دیکھتا اسی سے لسے چاؤ سے چکور رہے" (گوپال شرن سنگھ)

"اور بھی تم نے کیا ہے کچھ کبھی"
"پاکے سکے ہی پڑھائے ہیں ابھی" (منتلی شرن گپت)
"بچھے چھوڑ کر منسوب اب ان چرنوں کو تاکون" (ماکھن لال چترویدی)
"بہتہ میرا تجھے متی کہے گی"
"سما جس میں چکا سو بار ہوں میں" (رام دھاری سنگھ دنکر)

اُردو میں "دیکھتا ہے" "کیا ہے" "ادڑ سما چکا ہوں" کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں گے اور ان کے لفظوں کے بیچ میں دوسرے الفاظ نہیں بھرے جائیں گے۔ صرف ابتدائی اور درمیانی دور میں کہیں کہیں یہ خامی ملتی ہے۔ لیکن اسے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خود حالی نے انیسویں صدی تک اسے استعمال کیا ہے۔

"نیندیں اچاٹ دیتی ہیں تیری کہانیاں ہیں"

لیکن اب یہ بالکل متروک ہیں۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ صرف فارسی الفاظ کی آمیزش ہندی کو اردو نہیں بنا دیتی بلکہ دونوں کے اسٹائل میں واضح فرق ہے۔ سمن کا ایک مصرعہ ہے۔

یہاں نہ محنت کش کی روٹی چھین او سکھا پائے"

اس ایک مصرعہ میں جس کے تمام الفاظ اُردو میں مشترک ہیں ہندی ادبی روپ کی کئی خصوصیات ایک ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ لفظوں کی ترتیب، نہیں کے بجائے نہ کے استعمال اور کر کے لئے چھین کے استعمال نے اس مصرعہ کو خالص ہندی مصرعہ بنا دیا ہے۔ اسے کوئی اُردو کا مصرع نہیں کہہ سکے گا۔

اُردو سے مختلف لفظوں کا یہ استعمال اور ترتیب ہندی میں من مانی چیز نہیں ہے اس کی وجہ اُردو اور ہندی کی نشو ونما باہمی فرق ہے۔ ہندی کے ادبی اسٹائل کے کچھ اصول برج بھاشا اور اودھی کی روایت سے آئے ہیں۔ جن کے بعض نحوی قاعدے کھڑی بولی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ میں وضاحت صرف ایک مثال سے کروں گا۔ کبیر، میرا اور گردھر کے تین مصرع ہیں

"مورکھ کو سمجھاوتے گیان گانٹھ کا جائے"
"رام کی دیوانی میرو درد نہ جانے کوئے"
"دلی شہر سہاونا اور میرے کچھن نیر"

ابتدائی دور کی اُردو میں "جائے، جانے اور میرے" کے الفاظ کا استعمال اس طرح ہوتا ہے۔ درمیانی دور میں پہنچتے پہنچتے ان میں "ہے" کا اضافہ ہو گیا — جائے ہے — جانے ہے — برسے ہے — اور انیسویں صدی تک اس کا استعمال ہوا ہے۔ غالب کی ایک غزل میں اس کا نمونہ ملے گا۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

میرے خاندان میں جو آگرہ اور بھرت پور سے تعلق رکھتا ہے ابھی تک کرے ہے اور جائے ہے بولا جاتا ہے لیکن ادب میں یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے۔ اٹھارویں صدی سے نئی تبدیلی شروع ہوئی اور "جائے ہے" "جاتا ہے" ہو گیا "جانے ہے" "جانتا ہے" اور "برسے ہے" سے برستا ہے ہو گیا۔ اور انیسویں صدی کے آخر تک یہی معیاری زبان قرار پا گئی۔ یہ دراصل کھڑی بولی کا انداز ہے۔ ہندی میں "جائے، جانے، برسے" نے جانے، جانتا، برستا کی شکل ضرور اختیار کر لی لیکن تھا یا ہے کے اضافہ

کے بغیر۔ اسی لئے "آج تک" میں جاتا، وہ جاتا، او ریاں ریستان کے قسم کی عبارت استعمال ہوتی ہے۔ ایک اور فائدہ یہ ہے کہ جیسے ہی میرا کے مصرعے

"رام کی دیوانی میرا درد نہ جانے کوئے"

میں جانے کا لفظ جاتا ہی جاتا ہے۔ ویسے ہی نہ کو نہیں میں تبدیل ہوجانا چاہئے۔ لیکن ہندی میں کھڑی بولی کا لفظ جاتا تو آگیا لیکن نہ کا لفظ برج اور اودھی قاعدہ کے مطابق ہی رہا۔ اسی لئے ہندی ادبی اسٹائل میں اس قسم کے جملوں کا استعمال عام ہے۔ کام نہ تھا، میں چلا جا رہا، وہ گاتا، وہ دوائیں چلاتیں، مانا نہیں رہتیں، اور ہیں، ہے، گا، تھے، کے لفظ غائب ہوجاتے ہیں۔

جب ہندی کے شاعر اور ادیب سنسکرت آمیز زبان لکھتے ہیں یا برج بھاشا اور اودھی کو استعمال کرتے ہیں تو ان کا حسن بیان، طرز ادا اپنے شباب پر ہوتا ہے لیکن کھڑی بولی کے استعمال میں اُردو ادیب ان سے آگے نکل جاتا ہے۔ اس کی وجہ کھڑی بولی کی ۵۰۰ برس کی ادبی روایت ہے جسے اُردو والوں نے اپنا ورثہ بنایا ہے۔

(۱۰) اُردو اور ہندی میں نثر کی اصناف مشترک ہوگئی ہیں۔ مثلاً کہانی، ناول، رپورتاژ، تنقید، مضمون نگاری، اور انشاپردازی لیکن شاعری کی اصناف ابھی تک مختلف ہیں۔ ان کے عروض کے قاعدے بھی مختلف ہیں۔ دونوں کے پاس شاعری میں اپنے اپنے جواز کے بہترین جواہر پارے ہیں۔ اور ہمیں چاہیئے کہ اپنے تعصب اور اندھے پن کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک کو بھی ضائع نہ ہونے دیں ورنہ ہمارے ادبی خزانہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ مثلاً اردو کی ایک انتہائی حسین اور مقبول عام صنف غزل ہے۔ ہندی میں بھی غزل لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے بہترین نمونے اُردو ہی کے پاس ہیں میر، غالب، ذوق، اقبال، وغیرہ کے ہزاروں اشعار ہیں۔ جو لوگوں کی زبان پر ضرب المثل کی طرح چڑھے ہوئے ہیں۔ رباعی اور مثنوی بھی اردو کی مخصوص اصناف ہیں جن کی جگہ کوئی دوسری صنف نہیں لے سکتی۔ ہندی میں بچن نے رباعی کی صنف کو ہندی غزل میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں انہیں خاصی کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

(۱۱) اُردو اور ہندی میں ٹکنیکل اصطلاحیں بالکل الگ الگ ہیں۔ اور دونوں کے پاس اصطلاحی الفاظ کے تقریباً مکمل سیٹ موجود ہیں۔ ہندی یہ اصطلاحیں زیادہ تر سنسکرت اور اُردو زیادہ تر عربی اور فارسی سے حاصل کرتی رہی ہے۔ دراصل ٹکنیکل اصطلاحوں کے ترجمہ کرنے والوں نے خود اپنی مادری اور قومی زبان کی طرف انتہائی حقارت کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی کہ خود ہماری اپنی زبان اور اس کی بولیوں کے خزانوں میں کیسے کیسے جواہرات موجود ہیں۔ انھوں نے انگریزی سے الفاظ سیکھے۔ اور پھر سنسکرت، عربی اور فارسی سے ان کے مترادف الفاظ لے کر یا بعض اوقات نئے الفاظ گھڑ کر ہماری زبان کو بوجھل کر دیا۔

یہ ہے وہ مختصراً وہ فرق و اختلاف جو اُردو اور ہندی کے ادبی روپ اور اسٹائیلوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ فرق ایسا نہیں ہے کہ ہندی اور اُردو کے درمیان ایسی خلیج حائل ہوجائے جو پاٹی ہی نہ جاسکے۔ اس کے بعد بھی دونوں اسٹائیلوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ اور بعض اوقات ان کا امتزاج بڑے سلیقہ اور خوبی سے ہوجاتا ہے۔ اور فرق کا پتہ نہیں چلتا۔ ہندی کی مشہور شاعرہ سبھدرا کماری چوہان کی ایک نظم میں اس کی مثال ملجائے گی۔

میں بچپن کو بلا رہی تھی بول اٹھی بٹیا میری
نندن بن سی پھول اٹھی ہے چھوٹی سی کٹیا میری
ماں او، کہہ کر بلا رہی تھی مٹی کھا کر آئی تھی
کچھ منہ میں کچھ لئے ہاتھ میں، مجھے کھلانے آئی تھی

شاہراہ

پاپا میں نے بچپن پھر سے، بچپن بیٹی بن آیا
اس کی بھولی صورت دیکھ کے مجھ میں نوجیون آیا
میں بھی اس کے ساتھ کھیلتی، کھاتی ہوں تتلاتی ہوں
مل کر اس کے ساتھ سوئم میں بچی بچی بن جاتی ہوں

لیکن یہ امتزاج صرف شاعری، افسانہ نگاری اور صحافت کی معمولی سطح تک ممکن ہے۔ دوسری ادبی اور علمی اصناف میں اس کا امکان ابھی ممکن نہیں ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہم بعض اوقات غیر ضروری طور سے سنسکرت اور عربی فارسی کے الفاظ استعمال کر کے اپنی زبان کو بوجھل بنا لیتے ہیں۔ بہت سے عوام عام الفاظ کا سہارا لئے بغیر روزمرہ میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے ادیب ہیں جو بول چال کی زبان پر اتنا عبور نہیں رکھتے کہ اسے اپنے ادب میں خوبصورتی کے ساتھ برت سکیں اس لئے ہم اپنی جہالت کو چھپانے کیلئے سنسکرت اور عربی فارسی کے الفاظ استعمال کر کے رعب ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے اگر کوشش کی جائے تو دوسری اصناف میں بھی ایسی زبان کا استعمال ممکن ہے جس میں ہندی اور اردو کا امتزاج ہو۔ پنڈت سندر لال نے بھارت کے دھان کا ترجمہ ایسی اچھی اور تازہ زبان میں کیا ہے جو آسانی کے ساتھ ہندی اور اردو والوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اگر آپ ان کی زبان کا تقابل دھان کے دوسرے ہندی ترجموں سے کریں تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ بڑی حد تک علم زبان کی کمی اور تعصب ہندی اور اردو کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع کر رہے ہیں۔ میں نے رجنی پام دت کی کتاب India Today کے ہندی اور اردو ترجموں کی زبان کا تقابل کر کے دیکھا ہے۔ ہندی ترجمہ ڈاکٹر رام بلاس شرما اور اردو ترجمہ خود میں نے کیا۔ ان دونوں کے تقابل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی ایسی زبان میں ممکن ہے جو اردو اور ہندی والوں کے لئے آسان ہو اور جس میں دونوں ادبی اسٹائیلوں کا امتزاج ہو۔ لیکن یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب مترجم اور ادیب کو ہندی اور اردو دونوں آتی ہوں یہ زبان نہ تو وہ ہوگی جسے "پاکیزہ اردو" کہا جاتا ہے اور نہ وہ "شدھ ہندی" سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی کوششیں کسی حد تک بھدی اور بھونڈی ہوں گی۔ لیکن آہستہ آہستہ اور رچاؤ پیدا ہو جائے گا۔ اور ایک حسین اور پاکیزہ اسٹائل ترقی کرے گا۔ اگر ادیب کو دونوں اسٹائیلوں پر عبور حاصل ہو اور وہ لکھتے وقت روزمرہ یا بول چال کی زبان کے قریب رہنے کی کوشش کرے تو مجھے یہ یقین ہے کہ بہت جلد دونوں... اسٹائیلوں کا امتزاج ایک حسین اور پاکیزہ زبان کا روپ اختیار کرے گا۔

دراصل جو چیز دونوں کے امتزاج میں حائل ہو رہی ہے وہ ہمارے ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال ہے۔ وہ طاقتیں جو بھارت اور پاکستان کے فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کی ذمہ دار ہیں ابھی کمزور نہیں پڑی ہیں اور اپنی کارستانیوں میں مصروف ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے زہریلے اثرات بعض ایسی جماعتوں اور اداروں یا ان کے افراد میں سرایت کر گئے ہیں جو اپنے آپ کو جمہوری یا غیر مذہبی جماعتیں اور ادارہ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ہندی کا سوال سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھتا جا رہا ہے۔

اس وقت بھارت میں بہت بڑے پیمانے پر ایک نئی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پرانے عام فہم اور زبانوں پر چڑھے ہوئے الفاظ خارج کئے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ مردہ یا مصنوعی الفاظ لائے جا رہے ہیں۔ اس کوشش کے ذمہ دار فرقہ پرست اور رجعت پرست عناصر قوم پرستی اور وطنی اتحاد کی آڑ لے رہے ہیں۔

ان بے ہودہ کوششوں کے اصل نوعیت کا اندازہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم یہ جان لیں کہ ہندوستانی علاقہ میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ کس قسم کی ہے۔ یہاں مجھے دیہاتی بولیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بلکہ میرے پیش نظر وہ زبان ہے جو شہروں میں بولی جاتی ہے اور جسے مختلف دیہاتوں سے آنے والے کسان بھی شہر میں پہنچ کر بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض ہندوستانی زبان جو اودھی، برج، بندیل کھنڈی، بھوجپوری وغیرہ علاقوں کے لوگوں کے درمیان بھی تبادلہ خیال کا ذریعہ بنی ہے۔

خلاصہ

اگر کوئی شخص دہلی سے ریل میں بیٹھ کر بنارس جائے تو اسے ہر اسٹیشن پر اخبار اور کتابیں بیچنے والوں کی آواز سنائی دیگی۔

"اردو ہندی کتابیں، اردو ہندی اخبار، تازہ خبریں پڑھئے"

یہ الہ آباد کے دو رکشا چلانے والوں کے تین جملے ہیں جو انھوں نے میرے دوست ہندی کے مشہور شاعر شیل جی کے سامنے بولے تھے۔

"سالا بڑا جاہل ہے" "نمائش ہو رہی ہے" "غبارہ اڑایا ہے"

اب میں کچھ جملے پیش کرتا ہوں جو میں نے گونڈہ اور بلرام پور کے درمیان ایک موٹر لاری میں سفر کرتے ہوئے اپنی ڈائری میں لکھ لئے تھے ان کے بولنے والے دیہاتی ہیں۔ جو گاؤں سے شہر میں آتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی اودھی کی بولی میں اردو کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

"لاری چلاؤ مسافر پورے ہو گئے" "جلدت نا ہیں" "دو لی تین جوان بلائے لیو" "تو امکان بنائیں ہیں" "تکا جا (تقاضہ) کرتے رہے" "کرجو (قرض) معاف نہ ہوئیہے" "معافی دیو صاحب گلتی (غلطی) ہوئے گئی" "کھبر (خبر) بیٹھے دیو"

اب کچھ برہمن عورتوں کے جملے سنئے جو جھانسی سے لکھنؤ جا رہی تھیں۔

"بھابی بیماری ہی ایسی ہے" "اگر ہم گھبرا گئے تو مریض کا کیا حال ہوگا" "دوا سے کچھ فائدہ بھی تو ہو"

کانپور ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کی آپس کی گفتگو کے کچھ جملے یہ ہیں۔

"محنت مزدوری کرتے ہیں" "قسمت کی بات ہے" "برش تو ہے نہیں" "صاف کیا کرے گا، اپنا سر؟" "یوپی میں شان و شوکت میں لکھنؤ بڑھا ہوا ہے" "اس شہر کا جواب نہیں" "آپ کیا سوال جواب کر رہے ہیں" "ضرورت آپڑی ہے" "بڑے ضروری کام سے جا رہا ہوں" "صحت خراب ہو گئی ہے" "چہرہ اتر گیا ہے" "بالکل غلط ہے" "بڑا عقلمند ہے" "بے شعور ہے" "اس کی آواز میں کیا پسند نہیں آیا" "اس کی آواز میں درد ہے" "میں دعوے سے کہتا ہوں" "کوشش کر رہا ہوں" "بڑا محنتی آدمی ہے" "انسانیت نہیں رہ گئی"

اب بارہ بنکی کے کچھ جملے سنئے

"رشوت کھاتے ہیں" "چہرہ پر رونق آگئی" "کیا حال چال ہے" "آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں" "میں خود اٹھاؤں گا"

ٹونڈلہ ریلوے اسٹیشن پر یہ جملے سنائی دیئے۔

"بہت زبان چلا رہا ہے" "اب کیا شامت آئی ہے؟" "بڑا عزت والا بنا پھرتا ہے" "خیال نہیں رہا" "یاد کیجئے" "شاید آگرہ میں دیکھا تھا" "ذرا سی زحمت ہوگی" "نہیں آئیے تشریف رکھئے" "دیکھئے کیسا مزاج ہے"

یہ جملے خود ہندی کے شاعر شیل جی کا ہے۔

"دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گئے پھر ایسا محسوس ہوا تھکے ہوئے ہیں"

ان جملوں سے اچھا خاصا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی علاقہ میں لوگ کیسی زبان بولتے ہیں۔ اور یہی وہ زبان ہے جو بھارت کے دوسرے علاقے میں عام لوگ سیکھتے اور بولتے ہیں جن کی مادری زبان اردو یا ہندی نہیں ہے۔ میں نے گاندھی جی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، اور سبھاش چندر بوس کے منہ سے یہی زبان سنی ہے۔ اس کے بعد اگر آپ ٹنڈن جی کی زبان سنیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ بالکل نئی زبان ہے جو ہندوستانی علاقہ میں کہیں نہیں بولی جاتی۔ مگر آج اس کو ہندی کہہ کر رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یہ اُردو زبان کا شعر ہے۔ لیکن اسے ہندی زبان کا شعر بھی سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ اس زبان میں ہے جو دہلی اور اترپردیش میں عام طور سے بولی جاتی ہے۔ اس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو عوام کی زبان پر چڑھا ہوا نہ ہو۔ لیکن ٹنڈن جی کی زبان میں اسے یوں ہونا چاہیے۔

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے مکھ پر شوبھا
وہ سمجھتے ہیں کہ روگی کی دشا اچھی ہے

اس کے بعد بھی اس میں الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ترکیب اردو ہے۔ ٹنڈن جی کی زبان میں الفاظ کی ترتیب اور جملوں کی ترکیب بھی بدل جائیگی۔

لیکن ٹنڈن جی کا رجحان لنگڑا ہو رہا ہے اور ایک بالکل نئے قسم کی زبان بنائی جا رہی ہے۔ اور زبردستی رائج کی جا رہی ہے۔ اب لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر پاخانہ۔ سنڈاس یا ٹٹی کے الفاظ نہیں ملیں گے جو عام طور سے رائج ہیں۔ اب پاخانہ "شوچ آسے" ہو گیا ہے۔ کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر اسے "شوچ گرہ" لکھا گیا ہے۔ یہ لکھنے کے بجائے کہ "صرف پہلے اور ڈیوڑھے درجے کے مسافروں کے لئے" اب آپ کو یہ عبارت لکھی ہوئی ملے گی کہ "کیول پرتھم، دوتیہ ماتھا مدھم شرینی کے یاتریوں کے لئے" ڈاکخانوں میں مہر کا لفظ "مدرانگ" بن گیا ہے اور تاریخ کا لفظ "دنانک"۔ چنانچہ ہندی میں چھپے ہوئے منی آرڈر فاموں پر "تاریخ کی مہر" کے بجائے "دنانک مدرانگ" لکھا ہوا ملے گا حالانکہ تاریخ اور مہر کے الفاظ ہندی لغات میں اور بے شمار کتابوں میں مل جائیں گے۔ آل انڈیا ریڈیو ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی معاف نہیں کرتا۔ پنڈت جی اپنی تقریر ایک زبان میں کرتے ہیں لیکن جب خبروں کے وقت اس کا خلاصہ دیا جاتا ہے تو بالکل دوسری زبان استعمال کی جاتی ہے۔ سیدھے سادے معمولی بول چال کے الفاظ سنسکرت الفاظ میں تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ یہ مصنوعی زبان کتابوں میں بھی لکھی جا رہی ہے۔ چنانچہ "سنیچر" کا معمولی لفظ "شنیشچر" اور جوان کا لفظ "ترن" بن جاتا ہے۔

اس پالیسی سے ہماری زبان کو کتنا شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ چاہے اسے ہندی کے نام سے یاد کیا جائے یا اردو کے نام سے اس کا پوری طرح اندازہ نہیں کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ چند الفاظ کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً یہ پالیسی زبان سے اس کی قوتِ اظہار اور قوتِ بیان چھین لیتی ہے اور اسے اپاہج بنا کر رکھ دیتی ہے۔

الفاظ میں بھی ایک طرح کی زندگی ہوتی ہے۔ کہیں صدیوں میں جا کر ان کے استعمال کا ڈھنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور اس لئے انھیں کپڑوں کی طرح تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کی وضاحت چند مثالوں سے ہو جائے گی۔

ہماری زبان میں پانی کے لئے تین لفظ رائج ہیں۔ ایک پانی جو پراکرت ہے۔ دوسرے جل جو سنسکرت ہے اور تیسرے آب جو فارسی ہے۔ آب کا لفظ اکیلا کبھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس سے صرف مرکب الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ جیسے پنجاب، آب پاشی، آبیانہ، آبکاری آبشار وغیرہ۔ جل کا لفظ بھی مرکب الفاظ بنانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے جل پری، جل ترنگ، گنگا جل وغیرہ لیکن پانی کا لفظ تنہا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے محاورہ بھی بنائے جاتے ہیں۔ جیسے "شرم سے پانی پانی ہونا" "سر سے پانی اونچا ہونا، سر سے پانی گذر جانا، پانی مرنا، پانی اتر جانا، پانی ہارنا، پانی جیتنا، پتا پانی کرنا، پانی پھر جانا، پانی چرانا، ایک پانی کی کسر ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر پانی کے لفظ کی جگہ جل کا لفظ رکھ دیا جائے تو صرف ایک لفظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ ایک درجن سے زیادہ محاوروں کا خون ہے کیونکہ ہندی میں بھی "شرم سے جل جل ہونا" اور "سر سے جل گذر جانا" استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ہوا کے لفظ سے کوئی چالیس محاورہ بنے ہیں اس لئے "وایو" "بہار" یا "پہون" کا بدل نہیں ہو سکتے۔ "زبان" کے لفظ سے تقریباً ڈیڑھ سو محاورہ بنے ہیں۔ اگر اس لفظ کو ترک کر کے صرف "بھاشا" یا "جیبھ" کا لفظ استعمال کیا جائے تو ہماری زبان ڈیڑھ سو محاوروں، اظہار و بیان کے ڈیڑھ سو طریقوں سے محروم ہو جائے گی۔ بہار کا لفظ صرف بہار کے موسم میں نہیں بلکہ اس طرح بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ "آج تم پر بڑی بہار ہے" میر کا مصرعہ ہے "پی کر شراب شگفتہ ہوا ہے اس تو گل پہ بہار ہے" آج کل یہ کہنا بڑی مضحکہ خیز بات ہو گی کہ "آج تم پر بڑا بسنت ہے" اس کے علاوہ بہار کا رنگ سرخ سمجھا جاتا ہے۔ اور بسنت کا زعفرانی یا بسنتی۔

اس طرح "پرشن" "سوال" کا اور "اتر" "جواب" کا بدل نہیں ہے۔ جس طرح ہم یہ بولتے ہیں کہ "کیا سوال جواب کر رہے ہو" یا "اس شہر کا جواب نہیں ہے" یہ نہیں بولا جا سکتا کہ "کیا پرشن اتر کر رہے ہو" یا "اس شہر کا اتر نہیں ہے" اسی طرح "سماچار" کا لفظ ہے جس کے وہی معنی ہیں جو "خبر" کے ہیں۔ لیکن خبر کے لفظ کا استعمال دوسری طرح بھی کیا جاتا ہے۔ مثلاً "ہم بیمار پڑے تھے تم نے خبر بھی نہ لی"۔ یا "آنے دو اس بدمعاش کو ابھی اس کی خبر لیتا ہوں۔" اس کی جگہ سماچار یوں نہیں کہا جا سکتا۔ بے خبر سے بے خبری بنایا جاتا ہے۔ لیکن سماچار سے بے سماچار سے بے سماچاری نہیں بنایا جا سکتا۔ پھر "بچہ" کی طرح کے الفاظ بھی ہیں جو بڑی آسانی سے بالک کے لفظ سے تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ پھر بھی بالک بچہ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہم بچہ سے جتنے الفاظ بناتے ہیں۔ بالک سے نہیں بنا سکتے۔ بچپن کے لئے بالپن کہہ سکتے ہیں لیکن بچپنا اور بچکانہ کا مفہوم ادا کرنے کیلئے، بالک سے لفظ نہیں بنتا۔ اس کے علاوہ لفظوں کی جذباتی قدر و قیمت بھی ہوتی اور وہ بہت اہم ہے۔ بعض اوقات بعض تاریخی واقعات کسی لفظ کی جذباتی قدر بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً انقلاب کا لفظ ہے اتنا ہی عام فہم کرانتی کا لفظ بھی ہے۔ لیکن چونکہ اپنی تحریک آزادی کے گذشتہ بیس سال سے ہم "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ استعمال کر رہے ہیں اس لئے انقلاب کا لفظ ہمارے جذبات کی جتنی گہری تہوں کو متاثر کرتا ہے "کرانتی" کا لفظ نہیں کر سکتا۔ میں ہزاروں لفظوں کی فہرست مرتب کر سکتا ہوں جو اس وقت تعصب اور تنگ نظری کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں جس کی بدولت ہماری زبان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ چونکہ محاورہ لفظ کے اس استعمال کو کہتے ہیں جہاں اس کے لغوی معنی باقی نہیں رہ جاتے اور نئے معنی اختیار کر لیتا ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہئے کہ کسی زبان کے لفظوں کے خزانے میں جتنے الفاظ کا اضافہ ہو جاتا ہے جتنے محاورہ اس زبان میں ہوتے ہیں اور اسی طرح زبان زیادہ بامعنی زیادہ موثر زیادہ رسیلی اور حسین بن جاتی ہے۔ اور محاورے ایک دن میں نہیں بنا کرتے اور نہ افراد محاورے بناتے ہیں۔ ایک محاورے کی تخلیق میں صدیوں کی محنت اور کوشش صرف ہوتی ہے۔ ایک لفظ کا صحیح اور فصیح و بلیغ استعمال کہیں صدیوں میں جا کر رائج ہوتا ہے۔ اور زبان کے لئے الفاظ انسانی اعضا کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ الفاظ درخت کے برگ و بار کی طرح ہوتے ہیں۔ زندہ اور سانس لیتی ہوئی چیز۔ اس لئے نہ تو یہ ممکن ہے کہ انسان کے اعضا کو کاٹ کر دوسرے اعضا لگا دئے جائیں یا درخت کے پھل پھول توڑ کر اس میں دوسرے پھل پھول لٹکا دئے جائیں۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی زبان کی صدیوں سے رائج الفاظ کو بدل کر نئے الفاظ رکھ دیئے جائیں۔ اس لئے الفاظ کو تبدیل کرنے کے رجعت پرست رجحان کے خلاف جدوجہد کرنا صرف اُردو ادیبوں ہی کا نہیں بلکہ ہندی ادیبوں کا بھی فرض ہے۔ جدوجہد ہندی اور اُردو کا اتحاد و امتزاج کے رجحان کو تقویت پہنچائے گی۔ ہماری جدوجہد یہ ہونی چاہئے کہ الفاظ کے وہ دونوں سیٹ جو ہندی اور اُردو میں رائج ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں باقی رکھا جائے۔ اس سے ہماری زبان کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ آسمان اور فلک کے ساتھ آکاش اور گگن کا بھی زندہ رہنا ضروری ہے۔ ہوا کے ساتھ وایو اور پون کو بھی چلنے دیجئے۔ اس کے ساتھ ان دونوں طرح کے الفاظ کو استعمال کرنے کی بھی کوشش ہونی چاہئے۔ ہندی کے الفاظ میں اپنا حسن ہے۔ اور اگر ہمیں ان پر قابو ہو تو ہم زیادہ بہتر اردو لکھ سکتے ہیں۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں "دکھ" کے لفظ کو اس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے کہ اس کی جگہ فارسی اور عربی کا کوئی لفظ نہیں لے سکتے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

میں نے اپنے ایک مصرعے میں عربی کا لفظ "بطن" استعمال کیا ہے ؂

"خاک کے بطن میں ان جنی کونپلیں ناچتی ہیں"

لیکن نظم شائع ہو جانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ اس مصرعے میں بطن کے لفظ سے زیادہ مناسب اور خوبصورت لفظ کوکھ ہوگا

"خاک کی کوکھ میں ان جنی کونپلیں ناچتی ہیں"

پھر "ان جنی" کا لفظ جو خالص ہندی ترکیب سے بنا ہے، اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کے لئے اُردو میں "ناپیدا" بھی استعمال

کیا جا سکتا ہے لیکن "ان جنی" کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ چیز جو ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اور دوسرے معنی کاجل لگی ہوئی آنکھوں یا کاجل لگی ہوئی عورت کے ہیں۔ اس لئے کونپلوں کے ساتھ "ان جنی" کا لفظ لطف دیتا ہے وہ "ناپید" کا لفظ نہیں دیتا۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں نئے الفاظ لینے سے نہیں جھجکنا چاہئے۔ زندگی کی نئی حقیقتیں نئے الفاظ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہ کبھی تو کسی دوسری زبان سے مستعار لے جاتے ہیں اور کبھی اپنی ہی زبان سے بنائے جاتے ہیں۔ دنیا کی کوئی زندہ زبان نئے الفاظ کی یورش سے نہیں بچ سکتی اور بچنے کی کوشش اس زبان کی موت کا سامان فراہم کرے گی۔ لیکن اس سلسلے میں اس اصول کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہر زبان کا اپنا صوتی نظام اور اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اگر الفاظ زبان کے صوتی نظام اور مزاج کے خلاف ہوں تو زبان انھیں ہضم نہیں کر سکے گی۔ اس لئے جب بیرونی زبانوں سے الفاظ آتے ہیں تو وہ بے اوقات اپنی شکل بدل لیتے ہیں۔ مثلاً ہم نے اُردو میں "رومانس" کے لفظ کو "رومانی" بنا کر لے لیا ہے۔ اور اسے رومانی اور رومانیت کی طرح کے الفاظ بھی بنانے لگے ہیں۔ سنسکرت، انگریزی، اور عربی کا تلفظ ہماری زبان کے مزاج اور صوتی نظام کے ہے۔ اس لئے ان زبانوں کے الفاظ ہندی اور اُردو کے صوتی نظام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے ہماری زبان تت سم کے بجائے تدبھو کی طرف زیادہ جھکی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "سینشور" "سنیچر" ہو گیا۔ "دھولیہ" "دھول" بن گیا۔ "یمنا" "جمنا" ہو گئی۔ "کشیتر" "کھیت" ہو گیا۔ "ہست" "ہاتھ" بن گیا۔ "ن" "نا" میں تبدیل ہو گیا۔ اور عربی کا "عین" الف کی آواز دینے لگا۔ "کیفیّت" "کیفیت" ہو گیا۔ "اصطبل" "اصطبل" بن گیا۔ اس لئے آج ہر وہ کوشش رجعت پرستی کے برابر ہے جو ہماری زبان کے صوتی نظام کو خراب کرتی ہے اور سنسکرت یا عربی اور فارسی کے تلفظ کو استعمال کرنے پر اصرار کرتی ہے۔ نئے الفاظ کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں پرانے الفاظ کو چھوڑنے پر بھی تیار رہنا چاہئے۔ درخت اپنی پتیاں اور پھول گرا کر نئی پتیاں اور نئے پھول پیدا کرتے ہیں۔ زبان بھی ایک زندہ چیز ہے اس میں بھی الفاظ مرتے ہیں۔ متروک ہوتے رہتے ہیں اور نئے الفاظ آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس چیز کو زبان کے فطری ارتقا اور نشو ونما کے عمل کے سپرد کر دینا چاہئے۔ آدمی کی فطری موت اور قتل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چونکہ آدمی کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ آدمی کو قتل کر دے چونکہ بعض الفاظ متروک ہو جاتے ہیں، مر جاتے ہیں اس لئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جان بوجھ کر الفاظ کو قتل کرنے لگے۔

چونکہ کھڑی بولی کی ترقی اور نشو ونما کی تاریخ جس نے اسے ہندوستانی قوم کی قومی زبان کا درجہ دیا ہے بڑی حد تک اُردو ادب کی ترقی اور نشو ونما کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور آج ہندوستانی علاقے کی بول چال کی زبان ٹنڈن جی کی ہندی کے مقابلہ میں مری اُردو سے زیادہ قریب ہے اس لئے جدید ہندوستانی یا جدید ہندی کی ترقی کے لئے اُردو کا تحفظ بڑا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہندی ادیبوں کو خاص طور سے اُردو کی حفاظت کی دعوت دیتا ہوں۔

آج ہندوستانی زبان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُردو اور ہندی کا اشتراک، امتزاج اور اتحاد کیسے حاصل کیا جائے۔ ہمیں اس سمت میں ابھی سے کوشش کرنی چاہئے لیکن مکمل طور سے یہ امتزاج اور اتحاد صرف اس وقت ممکن ہوگا۔ جب ہندوستانی قوم کی تشکیل مکمل ہو جائے گی۔ جب ہندوستانی قوم پوری طرح سے متحد ہو جائے گی۔ اس کے لئے ہندوستانی علاقے کی صنعتی ترقی بھی ضروری ہے اور ایک ایسے جمہوری نظام کا قیام بھی ضروری ہے جو فرقہ پرستی ماضی پرستی اور رجعت پرستی کی طاقتوں کو نہ ابھرنے دے۔ اس عمل سے شہروں اور گاؤں کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ کم ہوگی اور ہندوستانی علاقہ کی بولیاں نہ قومی زبان کے حلقۂ اثر میں آئیں گی اور ان بولیوں کے بہترین عناصر قومی زبان میں جذب ہو جائیں گے اور ایک زیادہ حسین اور اثر انگیز زبان بنے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندی اور اُردو کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ بھی کم ہوگی۔ اور ایک مشترک ادبی انداز اور مشترک رسم الخط کے لئے فضا سازگار ہوگی۔ میرے نزدیک مشترک رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ اور دیوناگری ہونا چاہئے۔ لیکن مشترک رسم الخط زبردستی رائج نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہندوستانی قوم کا ایک حصہ اُردو رسم الخط کے استعمال پر اصرار کرتا ہے تو اسے اس کا حق اور

آزادی دینی پڑے گی اور اس کے استعمال کے لئے آسانیاں فراہم کرنی پڑیں گی ۔ یہ سوال نہ تو زیادہ سائنٹفک رسم الخط کی بنیاد پر طے کیا جاسکتا ہے نہ ریاست اور حکومت کے نظم ونسق کی آسانیوں کی بنیاد پر اور نہ اکثریت کے ووٹ کے ذریعہ سے ۔ اس کیلئے معقول سیاسی اور جمہوری فضا پیدا کرنا اور لوگوں کو علمی اور تہذیبی بنیادوں پر جذباتی طور سے آمادہ کرنا ضروری ہے ۔ رسم الخط کے سلسلے میں تہذیبی روایات کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے ۔ اس لئے جب تک تہذیبی اور قومی اتحاد کا مسئلہ حل نہیں ہوگا اس وقت تک رسم الخط کا مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا ۔

رسم الخط سے بھی زیادہ مشکل مشترک ادبی انداز یا اسٹائل کا سوال ہے ۔ اُردو اور ہندی میں دو متوازی روایات کا سلسلہ ہے جو گذشتہ پانچ سو برس سے دو الگ الگ دھاروں کی شکل میں بہہ رہا ہے ۔ اس گنگا اور جمنا کو اب تک کوئی سنگم نصیب نہیں ہوا ہے ۔ اس لئے دونوں روایات کو کسی قانون کے ذریعہ سے یا جبر کرکے ایک دن میں نہیں ملایا جاسکتا ۔ اس کیلئے بھی معقول سیاسی اور جمہوری فضا پیدا کرنا ضروری ہے ۔ تقریباً پچھلے ڈیڑھ دو سو برس سے یہ ہو رہا ہے کہ ہندوستانی قوم کے ایک گروہ کو ادبی اسٹائل یعنی ہندی کی تعلیم دی جارہی ہے اور دوسرے گروہ کو دوسرے ادبی اسٹائل یعنی اُردو کی تعلیم دی جارہی ہے ۔ اور اُردو والے ہندی سے اور ہندی والے اُردو سے ناواقف رکھے جارہے ہیں اس کی وجہ سے دونوں کے درمیان اجنبیت اور باہمی رقابت کا جذبہ پیدا ہوا ہے اس لئے دونوں روایات کو متحد کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کو دونوں اسٹائل سکھائے جائیں ۔ اُردو اور ہندی کی تعلیم ایک ساتھ دی جائے ۔ تلسی داس کی شاعری پڑھنے والے کو غالب کی تخیل کی بلندی سے آشنا کیا جائے اور غالب کی شاعری پر سر دھننے والے کے دل پر تلسی داس کا جادو ڈالا جائے ۔ صرف علم اور واقفیت سے باہمی احترام کا جذبہ پیدا ہوگا ۔ اُردو یا ہندی کی کسی ایک اسٹائل کو کچل دینے کی کوشش نہ محض یہ کہ امتزاج اور اتحاد کے عمل میں روڑے اٹکائے گی بلکہ ہماری زبان کی مزید ترقی اور نشو ونما میں حائل ہوگی ۔

اس لئے میں اس بات کو دہرانا چاہتا ہوں جس پر پہلی تقریر میں زور دے چکا ہوں ۔

—— ترقی پسند اور جمہوری عناصر کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ ہندی اور اُردو دونوں اسٹائیلوں کا تحفظ کریں اور انہیں پوری طرح ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کریں ۔ جب تک دونوں اسٹائیلوں کو آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہوں گے اس وقت تک دونوں کا امتزاج ناممکن ہے ۔

—— ترقی پسند اور جمہوری عناصر کی یہ بھی کوشش ہونی چاہئے کہ ہندوستانی علاقے کی مختلف بولیوں مثلاً اودھی اور برج بھاشا وغیرہ کے ادب کی حفاظت کریں اور اُردو اور ہندی کو ان بولیوں کے قریب لے جائیں صرف اس طرح ہماری قومی زبان ان بولیوں کے بہترین عناصر کو جذب کرسکے گی ۔

—— ترقی پسند اور جمہوری عناصر کا فرض ہے کہ وہ روزمرہ بول چال کی زبان کی حفاظت کریں اور اسے اس کے اپنے صوتی نظام اور مزاج کے مطابق ترقی دیں جو سنسکرت فارسی اور عربی کے صوتی نظام اور مزاج سے بالکل مختلف ہے ۔

—— ہماری قومی زبان کا نام ہندی یا ہندوستانی ہونا چاہئے ۔ میں ہندوستانی کو ترجیح دیتا ہوں ۔ یہ زبان فی الحال دونوں رسم الخط دونوں لپی میں لکھی جانی چاہئے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک مشترک رسم الخط اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس کے لئے میرے نزدیک دیوناگری رسم الخط سب سے زیادہ مناسب ہوگا ۔ اس رسم الخط کو جبری طور سے نافذ کرنے کی کوشش رجعت پرستی اور جمہور دشمنی کے مترادف ہوگی ۔

اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حسب ذیل اقدامات ضروری ہیں ۔

۱ ۔ تعلیمی اداروں میں کلاسیکی ادب سے لیکر جدید ادب تک مشترک نصاب تیار کرنا چاہئے ۔ طلبا کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ

شاہراہ

ابتدائی درجوں سے لے کر اعلیٰ تک ہندی یا اُردو جس اسکول اور جس رسم الخط میں چاہیں تعلیم حاصل کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ انتظام ہونا چاہیئے کہ اُردو کے طلبا کو دیوناگری رسم الخط سکھا دیا جائے۔ ہندی کے طلباء کے لئے اُردو رسم الخط کا سیکھنا ضروری قرار دیا جائے۔ اس سے ایک مشترک رسم الخط اختیار کرنے کے لئے زمین ہموار ہوگی۔

۲۔ نظم و نسق کے سلسلے میں تمام سرکاری اداروں اور میونسپلٹیوں کے ریکارڈ دیوناگری رسم الخط میں رکھے جائیں۔ لیکن عوام کے لئے جتنے سرکاری اعلانات اور مطبوعات ہوں وہ دونوں رسم الخط یعنی دیوناگری اور اُردو میں شائع کئے جائیں۔ عوام کو اس کا حق حاصل ہو کہ وہ مجلس قانون ساز، عدالت اور سرکاری اداروں کو مخاطب کرنے کے لئے اور درخواست دینے کے لئے ہندی یا اُردو جس اسلوب اور جس رسم الخط کو چاہیں استعمال کریں اور سرکاری دستاویزوں کی نقلیں جس رسم الخط میں چاہیں حاصل کریں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اُردو میں کسی نقل کے حاصل کرنے کے لئے انھیں مزید جنس یا رقم نہ ادا کرنی پڑے گی۔ ورنہ یہ ایک قسم کے جزیہ کی حیثیت اختیار کرے گا۔

۳۔ اپنے روزانہ کاروبار میں عوام کو اردو یا ہندی کسی ایک یا دونوں کے استعمال کا حق ہونا چاہیئے۔ وہ جس اسٹائل اور رسم الخط میں چاہیں اپنی کتابیں شائع کریں، اپنے اخبارات اور رسائل نکالیں اور حکومت ان دونوں میں سے کسی ایک کو خاص مراعات یا ترجیح نہ دے۔ انعامات اور مقابلوں کے سلسلے میں ہندی اور اُردو ادیبوں اور مطبوعات کو مساوی حقوق ملنے چاہئیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں شائع کرنے کیلئے اردو ادیبوں کی خاص طور سے ہمت افزائی کرنی چاہیئے۔

۴۔ جہاں تک ٹکنیکل اصطلاحات کا تعلق ہے فی الحال ہندی اور اُردو کے دونوں سٹ باقی رہنے چاہئیں۔ کچھ دنوں کے بعد عوام کی پسند اور زبان کا مذاق خود اس کا فیصلہ کرے گا کہ کونسی اصطلاحات باقی رہیں گی اور کونسی متروک ہو جائیں گی۔ اور پھر اس طرح معیاری اصطلاحات رائج ہو جائیں گی۔ مثلاً میرا خیال یہ ہے کہ "دستور" کا لفظ متروک ہو جائے گا اور "ودھان" کا لفظ مقبولیت حاصل کرے گا۔ "پراروپ" کا لفظ مر جائے گا اور "مسودہ" یا "مسودہ" کا لفظ زندہ رہے گا۔ اس کے علاوہ اس وقت جو ٹکنیکل اصطلاحات ہمارے پاس ہیں ان پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ الفاظ جو بڑھئی، لوہار، سونار، ٹھکرا اور دوسرے دستکار اور کارخانوں کے مزدور اور گاؤں کے کسان استعمال کرتے ہیں انھیں جمع کر لینا چاہیئے۔ کارخانوں کے مزدوروں نے اپنے روزمرہ کے استعمال کے لئے اپنی اصطلاحیں بنالی ہیں۔ انھوں نے بعض انگریزی لفظوں کو ہندوستانی بنا لیا ہے یا بعض نئے الفاظ بنائے ہیں۔ مثلاً بمبئی کے سوتی کارخانوں کے مزدور common man کے لئے "سوائی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جو پوری طرح مفہوم کو ادا بھی کرتا ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ یہ اس طریقہ سے بنایا گیا ہے جیسے ہم نے head master کے لئے ڈیوڑھے کا لفظ بنایا ہے۔ کسانوں، مزدوروں اور دستکاروں کے پاس اصطلاحات کا ایک ایسا خزانہ ملے گا جسے انگریزی فارسی اور سنسکرت میں ڈھونڈھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہم لوگوں کے ہونٹوں اور زبان سے لفظ چن کر انھیں اپنی لغت اور رشید کورشن کی زینت بنا سکتے ہیں۔ سائنس کی اصطلاحات کے لئے ہمیں زیادہ سے زیادہ انگریزی کا سہارا لینا چاہیئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور حکومت ہند کے اداروں کے ترجمہ زیادہ تر ناکارہ اور مہمل ہیں۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن کا ترجمہ کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جدید فارسی اور تاجیک زبان میں یہ اصطلاحیں اس حد تک انگریزی اور فرانسیسی اور روسی زبانوں سے لی گئیں ہیں کہ انھوں نے نوڈل پوائنٹ کو "نوڈال" نکال کر بدستور باقی رکھا ہے phenomenal کو امید دلاتری بنالیا ہے اور میٹریلزم اور آئیڈیلزم کا ترجمہ مادیت اور معنویت کرنے کے بجائے وہ انھیں "ماٹیریالزم" اور "آئیڈیالزم" کہتے ہیں۔

اس سوال پر سب سے زیادہ مناسب رائے ڈاکٹر تارا چند کی ہے جن کی انگریزی کتاب ہندوستان زبان کا مسئلہ کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

سائنسوں کو ان کی ادبی اور لسانی ضروریات کے مطابق حسب ذیل گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) علم الحساب کی سائنسیں جن کو ریاضی کہتے ہیں اور جن میں اصطلاحات کی ضرورت تو ہے لیکن بہت سے عام الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی

۲ - فطری سائنسیں جیسے کیمسٹری، فزکس، منعالوجی، بوٹنی، فزیالوجی، اناٹمی، جیالوجی، جغرافیہ وغیرہ میں اصطلاحات زیادہ ہوتی ہیں لیکن کچھ بیان، اور عبارت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳ - انسانوں سے متعلق سائنسیں جیسے انتھروپالوجی (علم الانسان)، سوشیالوجی (سماجیات) معاشیات، فلسفہ، سیاست، علم قانون نفسیات وغیرہ جن میں عام زبان اور عبارت اور زیادہ ضرورت پیش آتی ہے۔

۴ - تاریخ، سوانح نگاری، سفرنامے کی طرح کے موضوعات جن میں اصطلاحات سے زیادہ بیان اور عبارت کی ضرورت پیش آتی ہے

۵ - خالص ادب جس میں شاعری، ڈرامہ، افسانہ نگاری، وغیرہ شامل ہیں - ان میں بیان، عبارت اور انداز تحریر ہی سب کچھ ہے۔

پہلے دو گروہوں کے لئے سب سے زیادہ عملی حل یہ ہے کہ ان کی اصطلاحات زیادہ سے زیادہ انگریزی سے لی جائیں ۔ صرف اسما فرری سے کہ قاعدہ بنائے جا سکتے ہیں۔ (ہماری زبان میں بیرونی الفاظ کو ہند کرنے کا طریقہ پہلے سے رائج ہے جبکہ تیسرے گروہ کے سلسلے میں انگریزی زبان سے اصطلاحیں حاصل کرنا ذرا مشکل کام ہے - یہاں یہ ممکن ہے کہ کلاسیکی زبانوں مثلاً سنسکرت اور عربی سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ آس پاس کی زبانوں اور تدبھو عناصر میں بھی جستجو کی جائے تو اطمینان بخش نتائج برآمد ہو سکتے ہیں - چوتھے گروہ کے لئے خود ہندوستانی زبان کے وسائل کو ٹٹولنا چاہئے اور جو کمی رہ جائے اسے ہندوستان کی کلاسیکی اور دوسری جدید بیرونی زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر پورا کر لینا چاہئے ۔

خالص ادب کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کچھ سخت اصول مرتب کرلئے جائیں تخلیقی ادب پیدا کرنے والوں کو کسی خالص زبان کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔ جب فرقہ وارانہ دیوانگی نہ ہو تو خود عوام کا مطالبہ فیصلہ کن ہو گا ۔ اور ادیب عوام سے جتنا قریب ہوگا اس کی زبان اتنی ہی مشترک بول چال کی زبان سے قریب ہوگی ۔

(۵) اگر سارے بھارت کے عوام کی مرضی سے ہندوستانی مرکزی حکومت کی سرکاری زبان بنائی جائے تو جن طریقوں کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں وہی مرکزی حکومت کے کام میں بھی برتے جائیں گے - پھر بھی ہندوستان کی تمام قوموں کو اپنی زبان استعمال کرنے کا حق حاصل ہوگا -

(۶) بھارت کے غیر ہندوستانی علاقوں میں لوگوں کو اس کی مکمل آزادی ہوگی وہ اپنی تعلیم اعلیٰ درجوں تک اپنی ہی زبان میں حاصل کریں اور اپنی زبان کو سرکاری اور تہذیبی کاموں میں استعمال کریں ۔ لیکن ان علاقوں میں ہندوستانی ایک اختیاری زبان ہوگی اور لوگوں کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ چاہے ہندی انداز میں تعلیم حاصل کریں چاہے اُردو انداز میں ۔ جہاں ہندوستانی بولنے والوں کی کافی تعداد ہوگی وہاں ان کی زبان اور تہذیب کی پوری حفاظت کی جائے گی ۔ یہی رویہ ہندوستانی علاقے میں دوسری قوموں کے ساتھ ہوگا

(۷) حکومت کو ایک منصوبہ بنانا چاہئے کہ اُردو کو کلاسیکی اور جدید ادب کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کر دیا جائے تاکہ جب ایک رسم الخط اختیار کرنے کی منزل آئے تو کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔

ان عملی اقدامات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی فضا کے بہتر ہونے اور ہندی اور اُردو والوں کے درمیان باہمی اعتماد پیدا ہونے سے اس کا امکان ہو جاتا ہے کہ ایک نسل کے بعد مشترک انداز تحریر پیدا ہو جاتے اور ہماری زبان متحد ہو کر ایک رسم الخط اختیار کرے ۔ اس کے بجائے اگر امتزاج اور مزید ترقی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور پورا سوال فرقہ وارانہ شکل اختیار کرے گا ۔

چیکوسلواکیا سے ہندوستان تک

دنیا کی عوامی جمہوریتوں کے باشندوں کو اور بالخصوص وہاں کے نوجوانوں اور طالبعلموں کو ہمارے ملک ہمارے عوام ہماری تہذیب سے جو دلچسپی ہے اس کا تذکرہ ہم نے اکثر وہاں سے سیر کر کے واپس آنے والوں کی زبانی سنا ہے۔ ان بیانات کو کسی نے مانا اور کسی نے "ہمسفری" کا الزام دیکر اپنے کو فریب دے لیا۔ ہمکو مدت سے تلاش تھی کہ ہم اپنے پڑھنے والوں کو اوپر بیان کئے ہوئے دعووں کا کوئی ثبوت راست دے سکیں۔ چنانچہ ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ——— ذیل میں ہم ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کے اردو زبان میں دو خط درج کر رہے ہیں جو پراہا یونیورسٹی کی اس طالبعلم نے لکھے ہیں۔ سردار جعفری کو شکریہ کے ساتھ ہم ان کو یہاں قارئین کی دلچسپی کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ ان خطوط میں ہمکو زبان اور املے کی غلطیاں بھی نظر آئیں گی لیکن ہم ان کو یوں نظر انداز کر سکتے ہیں کہ تین سال میں اس سے زیادہ غیر ملکی زبان کوئی کیا سیکھ سکتا ہے۔ پہلے اور دوسرے خط میں تقریباً ایک سال کا وقفہ ہے۔ حصول علم و زبان کی یہ ترقی بھی قابل توجہ اور ستائش ہے۔ (ادارہ)

محترمی اور عزیز دوست سلطنہ!

میں نہایت خوش ہوں کہ آپ سے خطوط تبدیل کر سکتی ہوں بہت دنوں سے میں خواہش کرتی رہتی ہوں کہ India میں کوئی میری دوست ہو کیونکہ بھارت سے مجھے بڑا عشق ہے۔ اس کا ادب تہذیب و تمدن میرے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ آپ تصور کر نہیں سکتے کس طرح آپ کو مشکور ہوں کہ مجھے لکھنا چاہتے ہیں۔ صرف تھوڑی بہت ذکر کرتی ہوں کہ آپ کا وقت میرے چٹھیوں سے کھراب نہ کروں۔

پہلے تو مجھے معروف کرنا چاہئے تاکہ آپ کو معلوم ہوئیں دراصل کون ہوں۔ میں ۱۸ سال کی ہوں۔ یونیورسٹی میں اردو اور بنگالی پہلے سال پڑھتی ہوں۔ حقیقتاً دونوں زبانوں پڑھتے ہوئے ۳ سال گذرے۔ middle school [illegible] میں یہ میرا hobby تھا۔ مجھے پڑھنے میں بڑا شوق ہے۔ خاص طور پر سیاست، تاریخ، ادب وغیرہ۔ لیکن ایک بات اس میں مشکل ہے۔ میں نے ہمکو اچھے marxist کتابیں نہیں ملتے Bourgeois تاریخ کے متعلق کتابوں کا یہاں سیلاب ہے۔ لیکن ان میں اتنے بے وقوفی جھوٹ لکھے ہوئے ہیں کہ ان سے پڑھنا ناممکن ہے۔ خاص طور پر [illegible] جارحانہ بھارت میں انگریزی مصنفوں سے تعریف کیا ہے ہم یہ پڑھ کر ہمیشہ غصے میں آتے ہیں۔ اب سارے تاریخ کو ادب کو بھی نئے marxist نقطۂ نظر سے [illegible] کرنا چاہئے۔ بھارت میں کوئی [illegible] ملے ہیں جو صحیح طریقہ میں تاریخ سمجھاتے ہیں؟ جیسے ہماری university میں ایک ایسا scientific arch[illegible] بنیاد ڈالی جس میں ایک دوسرے کو ہمارے [illegible] جستجو research میں مدد کرتے ہیں ایک دوسرے کا کام تنقید کرتا ہے۔ ایک میرے دوستوں سے Gandhiji marxist نقطۂ نظر سے Role سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے تقریر کے بعد بہت تیز بحث اٹھا۔ لیکن ان میں بہت مسئلے حل ہوئے۔ مجھے اب بھی میرے تقریر کے لئے کوئی مضمون اختیار کرنا چاہئے میرا دل بہت چاہتا ہے آپ کے شوہر کے اشعار کے متعلق کوئی مضمون لکھنا یا تقریر کرنا۔ کیونکہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہوتے ہیں۔ میں نے ایک مزاجاً فیصلہ کی کہ بھارتی جدید poetry خاص طور پر آپ کی شوہر کی poetry کے متعلق میرے [illegible] کروں گی۔ اگر وہ اعتراض نہ کرسکیا

مشاعرہ

ایک اور نہایت اہم موضوع ہے جس کے بارے میں سب ہمارے لوگوں کو معلومات پہنچانا چاہئے۔ یہ بھارتی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ ہے۔ لیکن یہ بہت مشکل موضوع ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی کتاب اس کے متعلق نہیں ہے۔ مہربانی کرکے آپ ہمکو کچھ کمیونسٹ پارٹی کے متعلق لکھ سکیں؟ ہمکو معلوم ہے اس کا پروگرام جو India Today میں چھپا ہو۔ For Lasting peace ... جو میں جو اس مضمون پر لکھا ہے ہمکو بھی معلوم ہے۔ ہم سب تعمیرات دیکھے ہیں۔ موجودہ چناؤ میں اس کی حرکتیں پر اس کی جدوجہد کانگریس کے خلاف۔ لیکن ہمکو کوئی علم نہیں ہے۔ مختلف ... کے بارے میں جو صرف پچھلے سال میں ہٹا ہوتے۔ یا ہمکو مکمل طور سے واضح نہیں کس رویہ کمیونسٹ پارٹی کا مختلف سیاسی، اخلاقی، معیشی مسئلوں سے

پڑھنے کے علاوہ مجھے ناچنے میں اور گانے میں بڑا شوق ہے۔ ہمارے ملک میں بے شمار گروپ ہیں جنہوں میں جوان لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور ناچنے گانے یا ... سیکھتے ہیں۔ تقریب ہر کارخانہ میں، ہر سکول اور ... میں کوئی ایسا گروپ ہے۔ ہمارے ... گروپ ہیں۔ ہر سال ان گروپوں میں مقابلہ ہے اور سب سے بہترین کو ... ملتے ہیں مثلاً ... Bulgaria Poland دوسرے قوم کی جمہوریتوں میں بھیجے ہوتے ہیں یا بالآخر USSR میں بھی۔ ہم سب گانے بہت پسند کرتے ہیں۔ جب کبھی دو تین لوگ ملتے ہیں تو کچھ بات چیت کے بعد وہ سے گانے لگتے ہیں۔ اپنے ملک میں ضرور ایسا ہی ہونا چاہئے۔ ہمارے پاس بھی ایک ایسا Singing class ہے جس میں ہم صرف گیت گانے کی کوشش کرتے۔ پھر ہم کارخانوں میں اور دیہات میں جانے چاہتے ہیں۔ ہمارے کسانوں اور مزدوروں کے واسطے کوئی ... perform کرنا۔ لیکن ... بہت مشکل ہیں۔ ان کا ترانہ ہمارے لئے ایسا غیر ملکی ہے۔ لیکن مجھے بے حد پسند ہوتے ہیں۔ آپ بھی گانے پسند کرتے ہیں؟

ایک لڑکی ہمارے ... لوک گیتوں کے بارے میں ہمارے ... تقریر کرنا چاہتی ہے۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے۔ کیونکہ میں سوچتی ہوں کہ لوک گیت عوام کی زندگی کی سب سے اچھی عکس ہے۔

میں لکھ رہتی ہوں اور بالکل نہیں سوچتی ہوں اگر آپ تنگ نہ جائیں یا نہیں۔ معاف کیجئے کہ میرا خط اتنا طویل ہے۔ اچھا تو اب میں ختم کرونگی اور بہت امید کرتی ہوں کہ آپ مجھے بھی لکھینگے۔ صرف ایک اور بات معاف کیجئے کہ میں اتنی بے شمار غلطیوں کرتی ہوں۔ مہربانی کرکے اگر آپ کوئی چیز چاہتے ہیں کہ میں آپ کو یہاں سے بھیجوں تو لکھئے میں یہ ضرور بھیجوں گی۔ لکھئے آپ کے لئے سب سے دلچسپ ہے کیا۔ ہمارے ملک کے بارے میں ہمارے ادب کے بارے میں جان چاہتے ہیں۔ اور میں آپ کو بتانے کی کوشش کروں گی۔

آپکی دوست ... ملینہ

محترمی رفیق!

آپ کا خط پاکر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اس کا ترجمہ کرکے بہت سے دوستوں کو دکھایا۔ سب پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ اور بات بات پر بحث ہوئی۔ اب تو قریب قریب میرے سب دوست اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مجھ سے آپ کے بارے میں اور دوسرے ادیبوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں جو کچھ جانتی ہوں ان کو سمجھا دیتی ہوں۔ لیکن بہت سے مسائل ایسے ہیں جو مجھ پر اب تک واضح نہیں، مثلاً اشتراکی حقیقت نگاری کا سوال۔ آپ لکھتے ہیں: "اشتراکی حقیقت پسندی کا نعرہ استعمال نہیں کرتے ہیں کیونکہ ہندوستان کے حالت اس کے مناسب نہیں ہیں . . . . انقلابی حقیقت پسندی غیر کمیونسٹ ادیبوں کے لئے قابل قبول ہے ... "

مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ اگر آپ صرف عنوان "اشتراکی حقیقت نگاری" استعمال کرنے سے انکار کرکے اس کے اصولوں کو "انقلابی حقیقت نگاری" نام دیکر استعمال کرتے ہیں یا انقلابی حقیقت پسندی کے اصول اشتراکی حقیقت پسندی کے اصولوں سے مختلف ہیں؟ کس بات میں مختلف ہیں؟ مجھے اردو ترقی پسند ادب کے مقصد تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ مثلاً آپ کی نظم "نئی شاعری" سے جو میں نے "خون کی لکیر" میں پڑھی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل اشتراکی حقیقت پسندی کا ایک شاعرانہ اظہار ہے۔ کیونکہ اس میں اشتراکی حقیقت پسندی کے

شاہراہ

معاف کیجئے کہ میں یہ رائے رکھتی ہوں ممکن ہے کہ وہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ میں پہلے تو ہندوستانی کسانوں اور عام لوگوں کی ذہنیت نہیں جانتی ہوں دوسرے اردو ادب بھی اچھی طرح نہیں جانتی ہوں۔ تو مہربانی کرکے میری رائے کی تصحیح کر دیجئے۔

پھر میں کلاسکی ادب خاص طور پر کلاسکی شاعری کے ہیئت کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ میں غالب کے کچھ غزلوں کے علاوہ اردو کلاسکی ادب سے روشناس نہیں ہوں۔ صرف کسی انگریزی کتاب میں پڑھا کہ پرانے شاعر (نظیر کے علاوہ) بادشاہوں کے دربار میں رہتے تھے اور عام لوگوں کو ہرگز نہیں جانتے تھے۔ صرف اونچے طبقوں کے لئے اپنے اشعار لکھتے تھے۔ موضوعات کی کمی کے باعث وہ ہیئت پر زور دیتے تھے۔ نتیجہ ہوا کہ ان کے اشعار بہت ہیئت پسند ہونے لگے تو میں صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ یہ رواج (خاص طور پر ہیئت کا رواج) جدید ادیبوں پر برا اثر ڈالتا ہے۔

کیا کوئی ایسا اردو شاعر بھی ہے جو لوک گیتوں کی ہیئت لیکر اپنے اشعار میں استعمال کرے؟ (روسی انقلاب شاعروں اور ادیبوں Isakovsky, Gorky, Damyan Bedny وغیرہ کی طرح؟) کیونکہ لوک گیتوں کی ہیئت لوگوں کو ضرور زیادہ قابل فہم ہوگی۔ یا کیا کوئی ایسا شاعر ہو جو خود مزدور یا کسان ہو؟ مجھے ہندوستانی لوک گیتوں سے واقفیت کرنے کا بے انتہا اشتیاق ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں ان میں لوگوں کی زندگی احساسات اور خیالات سب سے اچھی طرح عکس پاتے ہیں اور جب مجھے ہندوستان کی عوام براہ راست جان نہ سکتی ہوں تو کم سے کم ان کی ذہنیت کا اظہار لوک گیت جاننا چاہتی ہوں۔

(یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں ادیبوں کی حالت بہت خراب ہے کہ ان کو پیسے کماتے کماتے بیوی بچوں کو پالتے پالتے بہت کم وقت باقی رہتا ہے کہ دیہات میں جائیں وہاں کسانوں کے ساتھ کام کریں اور ان کی زندگی سے واقف ہوں۔ لیکن جب میں گورکی کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسے ادیب ہو سکتے ہیں۔)

خط بہت لمبا ہو گیا ہے۔ مجھے بہت شرم آتی ہے کہ آپ کا وقت خراب کرتی ہوں۔ معاف کیجئے۔ شاید آپ خفا ہوں گے کہ میں اردو شاعری میں خامیاں دیکھتی ہوں۔ لیکن ضرور یہ اس لئے ہے کہ میں اس کو کم جانتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اردو شاعری کو جاننے میں اور میری رائے کی تصحیح میں مدد کریں گے۔

مجھے اب تک آپ کا پارسل نہیں ملا۔ میں بہت خوش ہوں گی جب مجھے یہ سب رسالے پڑھنے کا موقع ملے گا۔ اس کے لئے بہت مشکور ہوں۔ مہربانی کرکے مجھے آپ کی کوئی تنقیدی مضامین بھیج دیجئے۔ میں نے صرف "دار و رسن" پڑھی اور مجھے نہایت پسند آئی۔ اور جب یہ آپ کے لئے بڑا تکلیف نہ ہوگی تو نظیر کی کچھ اشعار بھی بھیج دیجئے۔ مجھے ان کو بڑے عرصے سے پڑھنے کا اشتیاق ہے۔ کیونکہ میں نے سنی کہ وہ عام لوگوں کے لئے لکھتا تھا۔ معاف کیجئے کہ میں آپ کو اتنا دق دیتی ہوں۔ آپ تصور کر نہیں سکتے ہیں کس طرح میں خوش ہوں کہ آپ نے مجھے خطوط لکھنے سے انکار نہیں کیا۔ مجھے صرف بڑی افسوس ہے کہ آپ کو کوئی چیک ادب کے ترجمے بھیج نہیں سکتی ہوں۔ کیونکہ انگریزی میں کوئی دستیاب نہیں۔ لیکن اگر روسی ترجموں میں آپ کوئی چیک ناول یا شعر پڑھنا چاہتے ہیں تو میں بڑی شوق سے آپ کو بھیج دوں گی۔ اب ہم ایک نوچیک کی کہانی کا ترجمہ اردو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ختم ہونے کے بعد آپ کو جھٹ پٹ بھیج دوں گی۔ میں نے آپ کو Ordinary mail میں ایک رسالہ بھیجا جس میں آپ کے اشعار کے ترجمے ہیں۔

اپنی بیوی کو میرا بے حد سلام کیجئے۔

- ملینہ ہیشمانووا۔

سیوٹا سے لندن تک

ذیل کے یہ خطوط ایک ہندوستانی طالب علم صمد نے دوران سفر میں اور لندن پہنچکر اپنی بہن زہرا کو ۱۹۵۲ء میں لکھے تھے۔ ان کے علاوہ صمد نے اور بھی خطوط لکھے ہیں جن کو ہم وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہیں گے۔ ان خطوط کے پڑھنے سے صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب قوموں کی رہنمائی غلط ہاتھوں سے ہوتی ہے تو کس طرح قومیں بے دست و پا ہوجاتی ہیں۔ (ادارہ)

۸ اکتوبر ۱۹۵۲ء

بوقت ۹ بجے شب سیوٹا

زہرا بہن! آج دوپہر کے تین بجے ہمارا جہاز سیوٹا پہنچا۔ یہ جبل الطارق کے شہر کے بالکل مقابل ہے اور یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ جہاز سیوٹا تیل لینے کی خاطر ٹھہرا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی (ٹھیک ۸ بجے شب) کہ جہاز نے لنگر اٹھایا۔

میں کیا بتاؤں کہ یہ چھوٹا سا شہر کتنا خوبصورت ہے اور پھر یہاں کے رہنے والے اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔ میری رائے میں کوئی بھی غیر شادی شدہ مرد جو یہاں ایک ہفتہ قیام کرے بغیر شادی کے نہیں رہ سکتا۔ اس قدر حسن چاروں طرف ہے کہ انسان کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔ کاش کہ آپ سب عزیز بھی میرے ساتھ ہوتے اور یہاں کا مزہ اٹھاتے۔ ان تین چار گھنٹوں میں آپ سب لوگ بہت ہی یاد آتے رہے۔

سیوٹا چھوڑتے وقت بہت ہی دل دکھا۔ اگر حالات نے اجازت دی تو میں انگلستان سے اس شہر کی سیاحت کرنے ضرور آؤں گا۔ اس شہر نے میرا دل موہ لیا ہے۔

مگر یہاں کی ایک چیز برابر آنکھوں میں کھٹک رہی تھی ـــ یہاں کی پولیس! شہر کا کونہ کونہ چپہ چپہ۔ کوئی ہوٹل یا ریسٹوران ایسا نہیں ہے جہاں کئی کئی پولیس والے کھڑے یا بیٹھے نظر نہ آئیں اور پھر جا بجا فرانکو کی تصاویر جنہیں دیکھ کر ہر باضمیر انسان کا خون کھولنے لگتا ہے۔ مجھے فرانکو کی منحوس شکل دیکھ کر [illegible] کی دلکش صورت یاد آگئی۔ میں نے اپنے مختصر سے قیام میں فرانکو کا خوب مذاق اڑایا۔ جہاں اس کا منحوس فوٹو دیکھا مالک دکان یا ریستوران سے پوچھا

"یہ کون انسان ہے؟"

جو لوگ انگریزی بولتے اور سمجھتے تھے وہ بہت مؤدبانہ جواب دیتے تھے

"Our leader" ہمارا رہنما

Couldn't you find a better man "کیا تمہیں کوئی اس سے بہتر آدمی نہیں ملا تھا؟"

حیرت اور خوف سے لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے اور میں آگے بڑھ جاتا۔ اتفاق سے میں جب یہاں کے خاص بازار میں پہنچا تو فوج کا ایک بڑا جلوس نکل رہا تھا۔ آگے بینڈ بجتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے تقریباً دو سو سپاہی مع افسران مارچ کر رہے تھے۔ جب جلوس ایک مقام پر منتشر ہوا تو میں نے کئی ایک فوجیوں کو اشارہ کر کے بلایا اور ان کے فوجی نشانوں کو چھوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

نہایت اچھا فدیہ۔ منی بولا۔ اگر آپ نے ڈرھوں میں شرکت کی تو ہفتے میں چھ سات پونڈ کما لینا کوئی بات نہیں۔

یہاں میں عین الیکشن کے زمانہ میں پہنچا۔ یوں الیکشن کا روز تھا لیکن ظاہراً کوئی ایسی چیز دیکھنے میں نہیں آتی تھی جس سے پتہ چلے کہ عنقریب ایک اہم ۔۔۔ ملنے والا ہے۔ کہیں کہیں لوگوں نے اپنی کھڑکیوں پر بہت چھوٹے چھوٹے پوسٹر لگا رکھے تھے جن میں اس حلقے کے کسی ممبر کی موافقت تھی۔ ان پوسٹروں پر ایسی عبارت ہوتی۔

"Vote for .... (Conservative)" جس علاقے میں رہتا ہوں اس کے حامیوں کا پوسٹر یہ تھا۔

Vote ORBACH For Peace and Service" (Labour)

اور ہاں امیدوار کا نام تھا۔ ایک شخص سے چلی والی رات کو میں اپنی مالکہ مکان کے ہمراہ مزدور پارٹی کی میٹنگ میں گیا جو محلے کے ایک بڑے ہال میں ہوئی تھی۔ مقرر اچھا خاصا مقرر تھا، بہت جوشیلی تقریر تھی۔ اس کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ہم کسی سے کوئی تجارتی وعدے نہیں کرتے جیسا کہ چرچل کی پارٹی وعدے کر رہی ہے۔ ہمارے ماضی کے کارناموں کو نظر میں رکھ کر ہمیں ووٹ دیجئے۔ قیمتیں بڑھی ہیں یا اسلئے بڑھی ہیں کیونکہ اسلحہ بندی کا پروگرام بغیر اس کے پورا نہیں ہو سکتا۔ ایران سے ہٹنا ہی مناسب تھا کیونکہ امریکہ نے ہمارا پورا ساتھ نہیں دیا۔ مگر مصر سے نہیں ہٹیں گے۔ تقریر کے بعد سوالات ہوئے میں نے یہ سوال کیا۔

"اسلحہ بندی اگر ضروری ہے تو کیا بڑی طاقتوں میں جنگ کے خلاف کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا؟"

جواب: "یہ ہمارے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس کی کنجی کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔"

میرا دوسرا سوال یہ تھا

"کسی دوسرے ملک میں فوجیں رکھنا اور اس پر اصرار کرنا تو صریحاً ناانصافی ہے۔ مزدور حکومت کس طرح جائز سمجھتی ہے؟"

جواب: "امن عالم کے لئے یہ نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہم محض سابقہ کے عہدنامہ پر عمل کر رہے ہیں۔"

اسی شب کو اسی ہال میں کنزرویٹو پارٹی (Conservative Party) کی میٹنگ ہوئی۔ امیدوار کی ساری تقریر عورتوں کا ووٹ حاصل کرنے کے لئے تھی، مختلف کنٹرولوں کی مذمت تھی۔ اس میٹنگ میں میرا سوال یہ تھا۔

"اگر چرچل کی حکومت ہوئی تو اس کا ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک پر جن سے آپ کے ملک کے گہرے سیاسی اور تجارتی تعلقات ہیں اچھا اثر پڑیگا یا برا؟"

جواب: "ہمارے تعلقات حسب دستور خوشگوار رہیں گے۔"

یہاں کے ایک عام آدمی کو سیاست سے قطعاً دلچسپی نہیں حالانکہ ہر شخص اخبار خریدتا اور پڑھتا ہے۔ مگر میں نے آج تک ٹرینوں میں کسی کو سوائے آخری صفحہ کے جس میں کھیل کود وغیرہ اسی قسم کی دوسری چیزیں ہوتی ہیں کچھ اور پڑھتے نہیں دیکھا۔ پہلا صفحہ جس میں خبریں ہوتی ہیں کوئی نہیں پڑھتا صرف سرخیاں دیکھ لی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کا عام آدمی دنیا کے حالات سے ہمیشہ بے خبر رہتا ہے اور یار لوگوں کو اس کی بے خبری سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔ یہاں کے آدمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بے حد ایماندار، محنتی اور نظم تربیت یافتہ ہے۔ ڈسپلن کا آپ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ الیکشن کی رات کو نتیجہ سننے کیلئے ایک بہت بڑا مجمع پکاڈلی سرکس میں اخبار کے دفتر کے سامنے جمع ہو گیا۔ جب پگڈنڈی پر کھڑے ہونے کی جگہ نہیں رہی تو سڑک پر اتر آیا مگر اس طرح کہ بسوں اور موٹروں کے چلنے کے لئے برابر جگہ رہے۔ کوئی شور و غل نہ تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بت کھڑے ہیں!

بچوں کا یہاں لوگ بہت خیال رکھتے ہیں۔ معمولی سے معمولی انسان بھی نہایت اچھے کپڑے اور کھلونے بڑی سے بڑی قربانی کر کے بچوں کو مہیا کرتا ہے۔ صبح کو اکثر آپ کو بچے اپنی گڑیاں اور کھلونے پرام میں بٹھائے ہوا خوری کرتے نظر پڑیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص بچوں کو دیکھے اور مسکرائے نہیں۔ مگر بوڑھوں کی زندگی یہاں ناخوشگوار ہے۔ اکثر و بیشتر اولاد ہو جانے کے بعد اولاد اپنے والدین کے لئے تقریباً بالکل اجنبی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کسی بڈھے کا ذرا بھی خیال کریں اور اس سے گپ شپ کریں جیسا کہ میں اکثر اپنی مالکہ مکان سے کرتا ہوں تو وہ بے حد ممنون ہوتی ہے۔ کل پرسوں ایک رنگ ساز میرے کمرے میں رنگ کرنے آیا۔ میں نے اسے کافی پیش کی، بڑا خوش ہوا، باتیں کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ اس کا لڑکا پچھلے کرسمس سے اس سے ملنے نہیں آیا۔ ممکن ہے اس کرسمس کو پھر آئے۔ ہماری مالکہ مکان کی لڑکیاں دو سال سے اس سے ملنے نہیں آئیں!

شاہراہ

یہاں کے موٹر چلانے والے پیدل چلنے والوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اکثر خود رک جاتے ہیں اور پیدل چلنے والوں کو اشارہ کر کے گذر جانے دیتے ہیں۔ بس یا ٹرام میں اگر کوئی بوڑھا انسان آئے تو لوگ اس کا بڑا خیال کرتے ہیں اور فوراً جگہ دیتے ہیں۔

یہاں کے آدمی کی خصوصیات کو دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"ایماندار اور ہمدرد"

اب سنئے ہمارے کالج کا حال۔ مجھے یہاں کی دو چیزیں پسند ہیں۔ لائبریری اور ریسٹورانٹ۔ جہاں نہایت واجبی قیمت پر بہت اچھا کھانا مل سکتا ہے۔ لائبریری میں ریسرچ کے طلبا کے لئے خصوصاً بہت اچھا انتظام ہے۔ آپ کو آتے ہی ایک چھوٹی سی الماری مل جاتی ہے۔ جس کی ایک چابی آپ کے پاس رہتی ہے۔ اور دوسری لائبریری میں۔ اگر آپ کوئی کتاب اپنے پاس رکھنا چاہیں تو فارم پر جس میں علاوہ مصنف کے نام اور کتاب کے نام اور نمبر کے آپ کی الماری کی چابی کا نمبر بھی ہوتا ہے، لکھ دیجئے۔ اگر آپ کے دوران استعمال میں کسی اور کو کتاب کی ضرورت ہوئی تو اگر آپ غیر حاضر ہیں تو لاکر (Locker) سے وہ کتاب نکال کر اسے دیدی جائے گی، ورنہ اس کی اطلاع کے لئے ایک پرچہ اس میں رکھ دیا جائے گا۔ پڑھنے کے لئے بہت بڑے بڑے ہال ہیں جن میں مکمل خاموشی رہتی ہے۔ چنانچہ بے تحاشہ پڑھنے اور کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہماری (Reference Library) میں دو لاکھ سے اوپر کتابیں ہیں۔ معاشیات کے مضمون پر ہیں اگر آپ کو کوئی کتاب درکار ہے جو لائبریری میں نہیں ہے تو آپ ایک فارم پر اندراج کر دیجئے جس میں آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ وہ کتاب آپ کی رائے میں کیوں ضروری ہے۔ دوسرے دن وہ کتاب خرید لی جائیں گی اور تیسرے روز آپ کے لاکر میں رکھی ملے گی!!

یہاں کے طریقہ تعلیم کا مقصد طالب علم میں تحقیقات اور تجسس کا شوق پیدا کرنا ہے۔ پڑھانا نہیں، جیسا کہ ہمارے یہاں کے کالجوں اور اسکولوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جتنے لیکچر میں نے سنے ان سے یہ اندازہ ہوا کہ استاد کا مقصد مضمون کو پیش کرنا تھا پڑھانا نہیں۔

لڑکیاں ہمارے کالج میں بے حد ہیں، تقریباً ۴۰ فی صدی مگر وہ زیادہ تر انڈر گریجویٹ درجہ کی ہیں، پوسٹ گریجویٹ میں بہت کم ہیں۔

تھوڑے دن ہوئے میں ڈاکٹر حیدر سے ملنے گیا تھا۔ بچارے بڑے خلوص سے ملے مگر ان سے بہت ہی کم گفتگو ہو سکی کیونکہ دوران گفتگو میں وہ برابر ہندوستان اور خصوصاً علیگڈھ کو یاد کر کے روتے رہے۔ تقسیم ہند کا ان پر بہت اثر ہے ہر تین چار منٹ بعد وہ دہراتے "تم نے میرے ملک کا کیا کر دیا" (what have you done to my country) اور بیر بری طرح روتے۔ علی گڈھ کے ہر ہر آدمی کا جسے وہ جانتے تھے ذکر کرتے اور اس کے متعلق دریافت کرتے کہ وہ خوش ہے یا نہیں۔ کے معلوم تھا کہ ان کے دل میں حب الوطنی اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگرچہ ہر لال کا ان کے دل میں بے حد احترام ہے، اتنی ہی نفرت انہیں تقسیم ملک سے ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کا اصل وطن پاکستان میں ہے علیگڈھ کی ایک ایک اینٹ کا حال انہوں نے پوچھا انہیں اس بات کا انتہائی صدمہ ہے کہ اپنی بیماری کی وجہ سے (ان پر فالج گرا تھا جس کے بعد وہ چل پھر نہیں سکتے) غالباً مرنے سے پہلے وہ ہندوستان کو نہیں دیکھ پائیں گے۔ انہوں نے مجھ سے بیحد اصرار سے کہا ہے کہ میرا یہ فرض ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد ہندوستان جاؤں اور ملک کی خدمت کروں اور انگلستان میں ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی نہ ٹھیروں۔ مسلمانوں کی حالت کے متعلق انہوں نے بہت سے سوالات کئے۔ رو کر انہوں نے یہ پوچھا "انہیں حقارت کی نظر سے تو نہیں دیکھا جاتا؟ وہ اچھوت تو نہیں سمجھے جاتے؟" ان کا کوئی ہندو دوست تھا جو ہر عید پر ان کو کارڈ بھیجا کرتا تھا تقسیم کے بعد سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کا ذکر کر کے وہ بہت روئے اور کہنے لگے۔

"تم نے میرے ملک کا کیا حال کر دیا"

ان کی بیوی اور لڑکی ان کا بیحد خیال رکھتی ہیں اور ان سے بہت محبت اور احترام سے پیش آتی ہیں۔

میرے دل پر ڈاکٹر حیدر کی ملاقات کا بہت ہی گہرا اثر پڑا۔ اور میں کئی مرتبہ دوران گفتگو میں رو پڑا۔

London School of Economics & Political Science

(بقیہ "مجسمہ" از رضیہ سجاد ظہیر سلسلہ صفحہ ۱۲۶) ہوئی۔ عمانی نے کواڑ کے پیچھے سے پوچھا: "کون ہے؟"

"میں ہوں اللہ دیا۔"

"آ بیٹے!" دروازہ کھل گیا اور پھر بند ہو گیا۔ اللہ دیا اندر آ گیا اور آتے ہی اپلوں کے دھوئیں سے کھانسنے لگا چولہے کے پاس بیٹھ کر اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی مگر کچھ بولا نہیں، عمانی نے غور سے اس کی طرف غور سے دیکھا اور آہستہ سے بولیں: "چائے بنا دوں۔ بیٹے کا ہ جگرا تر جاوے گی؟"

"بنا دو۔" اس نے بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

عمانی گرم پانی کی تپیلی میں چائے کی پتی ڈالتے ہوئے بولیں "آج فخرو کے واں خوب ماتم ہوا۔ ایسا ماتم برسوں سے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔"

اللہ دیا چپ رہا پھر آہستہ سے بولا "میر صاحب گئے تھے؟"

"ہوں گئے تھے مگر بیٹے اس آنے جانے سے کچھ کام نہ بننے کا ہے مولا ہی جانیں کیا بات چیت ہووے ہے؟" پھر ذرا رک کر بولیں: "میں نے تو مجو بیٹے سے ساتویں ہی کو کہہ دیا تھا ــــ تو تو ہوا ں تھا؟"

اللہ دیئے نے سر ہلایا ــــ "تو میں نے تو کہہ دیا کہ دونوں باتیں نہ چل سکیں ہیں یا تو اپنے مقدمے ہی سیدھے کر والو یا مولا ہی کا کام کروالو گے نہ چل سکے ہے کہ دودھ بھی پیا اور پوست بھی پیا، قسم کس کی کھاؤں؟"

اتنے میں پانی ابلنے لگی عمانی نے تپیلی اتار کر اس میں دودھ ملایا، متھار کے پیالے میں انڈیلا اور شکر ملا کر اللہ دیئے کی طرف بڑھاتے ہوئے آہستہ سے بولیں: "تو پھر تو کیا کہے ہے؟"

"کہنا کیا ہے علم جاوے گا بس!"

"کہاں تک؟"

"جہاں تک ہمارے دم میں دم ہے!"

"پولیس لگی ہے؟"

"بتیری ہی ــــ گڑھیا کے پاس لال پگڑیاں ہی لال پگڑیاں دکھ رہی ہیں۔ لگے ہے ٹیسو کا کھیت اگ آیا!" وہ ذرا ہنسا۔

"تو کیسے آیا؟"

"مرشدہ آپا کے حاطے میں تو ہو کے، ستر فوا دھر پھر گیا ہے میر صاحب کے واں!" عمانی خاموش ہو گئیں۔ اللہ دیا جانے کو کھڑا ہوا۔ انہوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولیں: "بیٹے آپ بل سو ہزار بل۔ کسی کی آس مت دیکھو، تم لوگ! بس مولا کا نام لے کر جو کچھ کرنا ہو خود ہی کیجیو!"

"وہ تو کیا ہی جاوے گا!" اللہ دیئے نے جواب دیا۔ پھر ذرا رک کے بولا "کل رات ہم لوگ گئے تھے درخواست لیکے!"

"کہاں؟"

"جنٹ صاحب کے واں!"

"پھر؟"

"ابجی وہ بات تک نہ کرنا۔ دروازے سے چپراسیوں نے کہہ دیا کہ صاحب نہ ملنے کے ہیں اور مجھ سے کہا کہ تم بہت ادھر ادھر شیخی بگھارتے پھرو ہو جب وارنٹ نکلے گا اور حوالات میں بھیجا جاوے گا تب . . . . !"

باہر کسی کے ڈنڈا ٹیکنے اور کواڑ بھڑبھڑانے کی آواز آئی۔ اللہ دیئے نے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا لیکن عمانی نے فوراً سے پیچھے کی طرف کھینچ لیا اور کونے میں دھکیل کے خود دراز میں سے جھانکیں۔ مشرق سے ہلکی ہلکی سفیدی نے بھی جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تین چار پولیس والوں کے سامنے کھڑے

دکھائی دیئے۔ حامی نے ہاتھ سے اللہ دیئے کو دوسری طرف اشارہ کر دیا چشم زدن میں وہ بکری کی پیٹھ پر پاؤں رکھ کر دیوار کود گیا اور مردوں کے ہاتھ سے ہوتا ہوا مرشدہ باپ کے احاطے سے نکل کر امام باڑے کی حد میں داخل ہو گیا۔

حامی نے پھر دراز میں سے دیکھا پولیس والوں کے پیچھے اور آس پاس کئی محلے والے جمع ہو گئے تھے اور زور زور سے بحث ہو رہی تھی۔

"ہم نے اسے ادھر آتے دیکھا تھا ہم اس گھر کی تلاشی لیویں گے۔"

"ابھی ہوش میں آ۔ تھو یہ سلوان اپنے ڈنڈ بیٹھک چھوڑ کر پولیس اور حامی کے دروازے کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔

"کس بیاکے پوت میں دم ہے کہ یہ دہلیز لانگے گا۔"

"میاں خیریت چاہتے ہو تو سیدھے سے چلے جاؤ۔ اس گھر میں کون آ سکتا ہے۔ کچھ سیندھی پی گئے ہو کیا؟"

"خبردار جو ایسی بات منہ سے نکالی۔ یہاں بچ نہیں گے۔"

لالہ جی کا لڑکا اوّکا کان جیوڑ لپیٹے ہاتھ میں لوٹا لئے بھیڑ میں شامل ہوتے ہوئے بولا۔

حامی اطمینان سے اپنے آنگن میں لوٹ آئیں اور اپنی بکری کو گلے لگا کے پیار کرنے لگیں: "اری واہ ری میری سیڑھی ——— نے بھوسہ کھا ... بچی ..."

دسویں تاریخ کی صبح آ گئی لیکن صورت حال بالکل نہیں بدلی۔ رات بھر تعزیوں نے حسب معمول گشت کی اور پولیس کے سپاہی بندوقوں سنگینیں پڑھائے ان کے ساتھ ساتھ گھومتے رہے۔ پانچ بجتے بجتے تعزیے بڑے امام باڑے کے صحن میں واپس پہنچ گئے اور الوداع پڑھی جانے لگی۔ علم باڑے کے دالانوں میں عورتوں کا ہجوم کھچا کھچ بھرا تھا اور بستی کے تقریباً سارے گھر خالی ہو گئے تھے۔ یکایک صحن کے دوسرے کونے سے علم اٹھنے لگا۔ مجو شاہ نیچے سے علم کو پکڑے تھا۔ پھریرا بار بار جھکتا اور بار بار سیدھا ہو جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے علم آ کر تعزیے سے لگ گیا۔ مجو شاہ نے اپنے ہونٹ بھینچے اور زور سے پکارا: "اجی نیم تلے والے میر صاحب! کہاں ہو؟"

نیم تلے والے میر صاحب بھیڑ میں سے کہیں سے بولے: "ہاں بھیئے ——— گے ہوں گا۔"

"میر صاحب آج تو ذرا دو مرثیہ پڑھیو ——— جا دیں ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو ——— آوے ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو۔"

"وہ تو پہلی تاریخ کو پڑھا جاوے ہے آج پڑھنے کا نہ ہے۔"

"اجی تم پڑھ دو تھوڑا سا ——— میری خاطر سے۔"

نیم تلے والے میر صاحب نے مرثیہ شروع کیا۔ علم اور تازیے آہستہ آہستہ کربلا کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے پیچھے ماتم کرنے والے تھے اور پیچھے مجمع کے ساتھ لالہ جی اور ان کے عزیز رشتہ دار شربت کی مٹکیاں اور بالٹیاں اٹھائے ہوئے اور ان کے پیچھے عورتوں کا ہجوم ——— جو تھوڑی دور چلا اور پھر امام باڑے کو واپس لوٹ کر صحن میں اکٹھا ہو گیا ———

"دیکھیو اب کیا ہو وے ہے۔"

"اب مولا ہی کوئی معجزہ دکھا دیں۔"

"اللہ مالک ہے ان لوگوں کی جانوں کا ——— بندوقیں سب پولیس والوں کے پاس ہیں۔"

"اجی تو ایسے بندوق نہ چلا سکتے! اب ایسا اندھیر نہ ہے۔"

"اجی گے نہ کہو! حکومت کا نشہ برا ہو وے ہے۔"

"امام ضامن کی ضمانت میں دیا سب کو۔"

"آخر ہو گا کیا؟"

شاہراہ

"چھوڑو ـــ ذرا دوڑو تو میرا پوت ـــ دیکھو تعزیے کہاں تک پہونچے ـــ کیا ہو رہا ہے" وہ ایک ذرا بڑے بچے تعزیوں کی طرف دوڑنے ـــ

مجمع علم اور تعزیے لئے آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ نالہ آگیا جو گڑھیا کہلاتا تھا اور جس کے ناکے پر پولیس کا پہرہ تھا۔ اطراف میں بہت سے درخت اور بہت سی جھاڑیاں تھیں۔ اتنی گھنی کہ اکثر چور اس میں چھپ جاتے یا اپنی بندوق یا چھریاں پھینک دیتے تھے تو پتہ نہیں چل سکتا۔ ان جھاڑیوں کے بیچ میں سے ایک پتلا سا راستہ نکلتا تھا اور اسی راستہ پر گڑھیا کے بالکل قریب دو طرف تار کے کھمبے تھے، درمیان میں لگے ہوئے دو تار صبح کی دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک مری ہوئی چمگادڑ تاروں میں پھنس کر لٹکی ہوئی، فضا کے بھیانک پن کو بڑھا رہی تھی۔ بستی کی طرف سے تعزیے اور علم اور ان کے پیچھے پیچھے لوگوں کا ہجوم پتلے سے راستہ پر ہو لیا اور تار کی طرف بڑھنے لگا، جیسے جیسے ہجوم آگے بڑھتا جاتا تھا علم ہراول کی طرح دو ما آگے ہوتا جاتا تھا، اور زمین پر جوشاہ کے گھسٹتے ہوئے پاؤں کی لکیر بنتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ علم تار کے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور باقی علم اور تعزیے تقریباً سو گز پیچھے رہ گئے۔

جوشاہ ایک منٹ کے لئے رکا اور نظریں اٹھا کر تاروں کو دیکھا، دو کھمبے اور ان کے درمیان کھچے ہوئے پتلے پتلے تار۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، پھر تلخی، پھر ٹھنڈی سانس، پھر اس کے لب بھنچ گئے، ایک لحظہ کو نظر جھکی، پھر اٹھی ـــ اب کی بار علم کے پھریرے پر جا کے رکی۔ وہاں سے پھر تار پر گئی، اور واپس لوٹ کر پولیس افسر کی نگاہوں سے مل گئی۔

"تار کاٹ دو" اسنے زور سے کہا۔

اتنے میں مجمع آگیا سب تعزیے اور علم آ کر بڑے علم کے پیچھے رک گئے۔

"تار نہیں کٹے گا علم کو جھکا کے لے جاؤ" پولیس افسر نے جواب دیا۔

"علم نہیں جھکے گا" پھر اسنے مڑ کر زور سے مجمع کو آواز دی "سب علم اور تعزیے رکھ دو، جب تک بڑا علم نہیں جاوے گا، ہم لوگ یہیں رہیں گے۔"

تمام تعزیے تابوت کندھوں پر سے اتار کے زمین پر رکھ دیئے گئے، علم درختوں سے لگا کر کھڑے کر دیئے گئے، چشم زدن میں بڑے امام باڑے میں خبر پہنچ گئی کہ سب تعزیے اور علم رک گئے ہیں، تار نہیں کاٹا گیا، ساری بستی میں ہراس پھیل گئی! کیونکہ امید کے خلاف سب کو نہ جانے کیوں کچھ یقین سا تھا کہ جب تعزیے پہنچیں گے تو تار کاٹ دیا جائے گا، یا ممکن ہے کوئی معجزہ ہو اور تار خود ہی ٹوٹ جائے۔

جب شام کے چار بج گئے ـــ فاقہ شکنی کا وقت آگیا۔ لیکن کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تو عورتوں کا ایک جم غفیر بستی سے نکل کر گڑھیا کی طرف چلا۔ ان کے سروں پر دریاں اور بستر تھے، گودوں میں بچے، بڑے بچوں کے ہاتھوں میں کھانے کی پوٹلیاں، لالٹین، دواؤں کی شیشیاں، نوحے مرثیوں کی بیاضیں، طرح طرح کے ڈبے، بعض کے ہاتھوں میں مٹی کے کھلونے اور کپڑے کی گڑیاں بھی تھیں۔ لالہ جی کی طرف سے سب کو شربت تقسیم کیا گیا۔ فاقہ شکنی ہوئی، بچوں کو بہلانے کے لئے گڑ چنے تقسیم کئے گئے۔ لالٹینیں روشن کی گئیں۔ مجلس شروع ہوئی ـــ گڑھیا پر نگر آباد ہو گیا۔

حانی اپنی بکری دوہ کے اٹھ ہی رہی تھیں کہ ان کے کان میں ماتم کی آواز آنے لگی۔ انہوں نے گھبرا کے مرشد آپا کی کھڑکی کھٹکھٹائی "مرشدہ اے مرشدہ" مرشدہ آپا شاید پہلے سے ہی سن رہی تھیں، جواب میں بولیں "ہاں، ہاں ـــ عورتوں کے ماتم کی آواز آ رہی ہے کی"

"کیا عورتیں بھی وہاں چلی گئیں؟"

"لگے تو ایسا ہی ہے"

حانی نے چبوترے کے سامنے کا دروازہ کھولا۔ لالہ جی کا سب سے چھوٹا لڑکا سر پر ایک بستر رکھے، ہاتھ میں جلتی لالٹین لٹکائے تیز تیز چلتا ہوا سامنے سے گذرا۔ انہوں نے گھبرا کے اسے آواز دی۔ "منوہر ـــ اے بھیئے منو ـــ ذرا سن تو"

وہ رک گیا۔

"تم کیا معاملہ ہے۔ کیا عورتیں بھی ہوں چلی گئیں؟"

"کب کی" منوہر نے جواب دیا۔ "باجی بھی وہیں، نانی بھی وہیں اب دادی بھی جا رہی ہیں۔ انہی کا سامان تو لے کے جا رہا ہوں۔" اور وہ چلنے لگا

"ارے تو ٹھہر تو بیٹے میں بھی چلوں ہوں، ذرا تھم۔"

"تو جلدی کرو۔ ابھی مجھے لوٹ کر شکرے جانی ہے۔ یاروں نے کیا ہے اور شربت بنوا دیں گے۔ جب تک تعزیے نہ اٹھتے ۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔"

"اے ہے تو کر دوں ہوں جلدی ۔۔ تو جھری تلے دم لے ۔۔ ریل تو نہ چھوٹی جا رہی۔" صافی جلدی سے اندر آئیں، الگنی پر سے چادر کھینچی، بکس دھڑام سے بند کیا، پیچھے کے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور جوتیاں پہن رہی تھیں کہ مرشدہ آپا نے اپنی طرف کی کھڑکی کھولی۔

"صافی ۔۔ اے صافی ۔۔ اے تم کہاں جا رہی ہو گی۔"

"مولا کے دربار میں۔" صافی نے مختصر سا جواب دیتے ہوئے جلدی سے گھڑے میں پانی ڈالا اور چادر اوڑھنے لگیں۔ مرشدہ آپا حیران رہ گئیں "یہ بیوہ ۔۔ دستوں چلا ہوں نٹوں میں کہاں جاؤ گی ۔۔ اے کیا باؤلی ہوئی ہو ۔۔ واں پہ وہ کان رہے گا۔"

"میرے مولا اور ان کے مولا دونہ ہیں۔"

چادر اوڑھ کر وہ باہر نکلیں، تالا دیا اور منوہر کے پیچھے ہو لیں پھر چلتے چلتے پکارا "مرشدہ! میری مرغیوں کو دانہ دیجیو، لکڑیوں کی بخاری میں دانے کی کونڈی رکھی ہے، اور جو ٹھے کنے جو مٹکا ہے اس میں بھوسی ہے، اتو رہ کو ڈال دیجیو ۔۔ اے ذرا تھم کے چل بیٹے تو تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوا ہے ۔۔ چلتی تو چلوں گی۔ پہنچنے تو نہ لگا لوں گی پیروں میں۔"

"ارے چادریں دو چادریں" اللہ دیا دوڑتا ہوا عورتوں کے اس گروہ میں پہنچا جہاں اسکی ماں بہن بیٹھی تھیں۔

"اے ہے۔ کیوں؟ اب کیا آفت ٹوٹی؟" اس کی ماں نے ہول کھاتے ہوئے پوچھا۔

"اب وہ بھی ہو کہ پوچھے ہی جاؤ ہو ۔۔۔ جبر بھی ہے نیم تلے دالی صافی بھی آ پہنچیں۔"

"اے ہے" بے ساختہ سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ جلدی سے اللہ دیے کی ماں نے دو چادریں گرمڑ بنا کے اس کے حوالے کیں۔ پاس ہی دری پر بیٹھی ہوئی شبراتی کی بہو نے بھی گھبرا کے اپنی کھیس بڑھا دی اور محمود خالہ بھی اپنی مونگیا رنگ کی کالی گوٹ والی دوہرے کے پکیس ہو گے بھی لیتا جا بیٹے! کہیو بالکل پاک صاف ہے، نماز بھی پڑھ سکتی ہیں اس پہ۔ میرے پاس گوموت کا ٹنٹا نہ ہے۔"

تین پاس پاس لگے ہوئے درختوں میں چادریں باندھ کر صافی کے لئے آڑ کر دی گئی۔ اندر صافی نے اپنی دری منوہر کی مدد سے بچھائی، تکیہ رکھا اور تکیہ پر بیٹھ کر نوحے مرثیوں کی بیاضیں نکال رہی تھیں کہ عورتوں کی بھیڑ صافی کے خیمہ میں داخل ہوئی شروع ہو گئی جب سب بیٹھ گئیں تو صافی سے مرثیہ پڑھنے کی درخواست کی گئی۔ صافی جب کبھی ۔۔۔ پڑھتی تھیں تو ان کے داہنے ہاتھ پر مرشدہ آپا اور بائیں پہ شفو خالہ بیٹھتی تھیں۔ اکیلی تو وہ بالکل پڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ نہ اب آواز میں اتنی طاقت رہ گئی تھی نہ کلیجے میں دم! انہوں نے ادھر ادھر دیکھا ۔۔ نہ مرشدہ آپا تھیں نہ شفو خالہ! انہوں نے ایک پل کو سر جھکایا، کچھ سوچا، پھر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ہی اللہ دیے کی بہن نوری بیٹھی تھی۔

"آ نوری ۔۔ تجھے تو پڑھنا آوے ہے نا؟ آ میرا ساتھ دے۔"

نوری بوکھلا کے رہ گئی: "وہ مرثیہ کیسے پڑھے گی! مرثیہ تو سیدانیاں پڑھیں ہیں!"

اسکی ماں نے اسے فخریہ انداز میں پیچھے سے آگے کو دھکیلا۔

"اور لسے بھی آوے ہے پڑھنا۔" شبراتی کی ماں نے اپنی بہو کو آگے کرتے ہوئے اطلاع دی۔ "لا ونڈے کو مجھے دے ۔۔۔ سو گیا ہے"

"ہاں سو گیا" سشبراتی کی بہو نے گھونگھٹ کے اندر سے جواب دیا۔ پھر اس نے لڑکے کو ماں کی گود میں دے دیا، گھونگھٹ ٹھیک کیا اور ممانی کے داہنے ہاتھ پر جا بیٹھی۔ نوری بائیں پر بیٹھی اور ممانی نے مرثیہ شروع کیا۔

تعزیوں کو گزرے ہوئے تیسرا دن بھی ختم ہو رہا تھا۔ تیرھویں تاریخ کا پورا چاند اپنی اداس کرنیں اس جھونپڑے سے قافلے پر برسا رہا تھا جو گھنے جنگل کے درمیان اپنا ڈیرا ڈالے پڑا تھا۔ بڑے علم کے نیچے اللہ دیا بیٹھا، ایک ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لکڑی لیے سر جھکائے زمین پر یوں ہی کچھ گول اور کچھ چوکور نشانات بنا رہا تھا کہ محمود اور اشرف آئے۔ پہلے انہوں نے ادھر ادھر دیکھا پھر اللہ دیے سے مخاطب ہوئے: "کہ کیا معاملہ ہے؟ استاد کہاں گئے؟"

"بستی گئے ہیں" اس نے سر جھکائے جھکائے جواب دیا۔

"پر بستی کاہے کو گئے ہیں؟" محمود نے پوچھا۔ اس کی پیشانی پر دو ایک بل آ گئے تھے۔ اشرف کی بھی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ اللہ دیا چپ رہا۔

"کل بھی تو گئے تھے بستی؟" اشرف نے کہا "کیوں اللہ دیے؟"

"ہاں گئے تو تھے" اللہ دیے نے آہستہ سے جواب دیا۔

"پر ہم لوگوں میں سے تو کوئی بستی نہ گیا۔ وہ کیوں بار بار بستی جاویں ہیں؟" محمود نے ذرا چڑھ کے جواب دیا "تجھے کچھ معلوم ہے کیوں گئے ہیں؟"

"نہ ۔۔۔ مجھے تو کچھ خبر نہ ہے" اشرف اور محمود ایک منٹ خاموش رہے پھر بولے: "اچھا تو پھر تو چل۔ مجلس شروع کریں۔"

"میں نہ چل سکوں ہوں۔ مجھ سے کہہ گئے ہیں جد تو لی میں لوٹ کر آؤں تو نہیں بیٹھا رہیو، علم کے پاس۔ کھسکیو مت۔"

"اچھا تو ہم لوگ چلے ہیں، تو استاد کو لیکر آئیو۔"

"ہاں" اللہ دیے نے جواب دیا اور پھر سر جھکا کے زمین کریدنے لگا۔ محمود اور اشرف بڑبڑاتے ہوئے ممانی کے خیمے کے نزدیک جا بیٹھے روز کی طرح مجلس ہونے لگی۔

مجلس شروع ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اللہ دیے کو مجو شاہ دور سے آتے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لال رنگ کی گٹھری تھی۔ اس کے نزدیک آ کے انہوں نے گٹھری کو بہت ہی دھیمے سے زمین پر رکھا اور اللہ دیے سے بولے: "تو مجلس میں نہ گیا؟"

"کیسے جاتا ۔۔۔ علم اکیلا ہو جاتا۔ تم بھی تو کہہ گئے تھے کہ بیٹھیں رہیو" وہ مسکرائے مگر بولے کچھ نہیں۔ پھر علم کے نیچے بیٹھ گئے۔

"لے اب تو جا ۔۔۔ میں بیٹھوں گا" پھر ذرا رک کے بولے "کوئی تجھے مجلس میں بلانے آیا تھا؟"

"ہاں! اشرف اور محمود آئے تھے۔"

"مجھے بھی پوچھتے ہوں گے؟"

"ہاں!"

"پھر تو نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا بستی گئے ہیں۔"

"پھر کچھ بولے؟" ۔۔۔ اللہ دیا سیکنڈ بھر چپ رہا پھر بولا "نہیں! کہتے کیا؟" ۔۔۔

استاد مسکرائے: "اللہ دیے! مجھ سے چھپا مت ۔۔۔ میں سب دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ ویسے ۔۔۔ ویسے ٹھیک بھی ہے، آخر لوگ کب تک یہاں پڑے رہیں گے۔ اپنے اپنے گھر ہیں، روزگار ہیں، بال بچے ہیں" پھر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ۔۔۔ سر جھکایا ۔۔۔ پھر ایکدم سے سر اٹھا کے بولے: "اچھا تو تو مجلس میں جا!"

"کیوں؟ تم نہ چلنے کے جو مجلس میں؟ اچھا میں جا کے کسی کو بھیجے دوں ہوں یہاں بیٹھے، تم آ جائیو!"

"نہ رہنے دے" مجو شاہ نے زور سے کہا "میں آج یہاں ہی بیٹھوں گا۔ آج کی رات کہیں نہ جانے کا ہوں، مجلس میں بھی نہیں" ۔۔۔ اللہ دیا حیران

کرن کا منہ تکنے لگا۔ وہ مسکرائے۔ پھر یکایک انہوں نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اللہ دیا ان کے سینے سے لپٹ کر آہستہ آہستہ رونے لگا۔ وہ اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگے: "ارے واہ میرے شیر! یار کیا ہوا ہے؟ کہیں بہادر مرد روتے ہیں بھلا؟" پھر ذرا آہستہ سے بولے: "اللہ دیا۔۔۔ آج محرم کی رات ہے نا؟"

"اللہ دیا بولا: "ہوں۔"

وہ ایک منٹ چپ رہے پھر آہستہ سے بولے: "سوچتا ہوں تو آج کچھ ہو دے گا ضرور۔۔۔ گھبراہٹ۔"

اللہ دیا تعجب سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ "استاد کی بھی باتیں عجب ہیں۔ ان کو نہیں ہو تو اب جنے کیا ہو جائے گا اور کیسے ہو جائے گا؟" وہ پھر مسکرانے بولے: "جا جا، مجلس کر۔۔۔ آواز دیمی ہو گئی، اور۔۔۔ اور۔۔۔ دیکھ تبرک بھرو پر در گڑ کر۔۔۔ چل جا اب۔۔۔ اور دیکھ میرا حصہ مت کھا لیجو۔۔۔ لے آئیو۔ ہاں تو۔" اللہ دیا نمناک آنکھوں کے ساتھ مسکرا پڑا۔

مجلس ختم ہوتے ہوتے بارہ بج گئے۔ اللہ دیا لوٹا تو جوش ملیح آبادی کے نیچے ہی آنے لیٹے تھے لیکن جاگ رہے تھے! اس نے حصہ ان کے ہاتھ میں پکڑایا اور اپنا دری میں لپٹا ہوا بستر کھول کر روز کی طرح ان کے بستر کے نزدیک بچھانے لگا۔ وہ سیدھے ہو بیٹھے: "اللہ دیا! یہاں سو رہے گا تو؟"

"تو اور کہاں؟ ہمیشہ ہی سوتا ہوں روز۔"

"نہ بیٹے، یہاں مت سو۔۔۔ ذرا اور دور بچھا۔ میں پاؤں پھیلاؤں ہوں تو تجھے ذرا اڑچن لگے ہے۔ ادھر بچھا لے بیری کے تلے۔"۔۔۔

اللہ دیئے نے بغیر کچھ کہے سنے اپنا بستر دور گھسیٹ لیا۔

دھیرے دھیرے تقریباً سب لالٹینیں بجھ گئیں اور زمین پر سوتی ہوئی بستی پر سناٹا چھا گیا۔ صرف ممانی کے خیمے میں ایک مدھم سی لالٹین جل رہی تھی۔ مجلس ختم ہوئے دیر ہوئی تھی۔ لیکن ممانی ابھی تک اپنے بستر پر آلتی پالتی مارے ہتھیلی پر چونا اور تمباکو مل مل کر پھانک رہی تھیں۔۔۔ ان کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ سرہانے کی طرف نوری اور پائنتی کو شبراتی کی بہو ننھے کو چادر میں لپیٹے سو رہی تھی۔ آس پاس بھی کئی عورتیں اور بچے نیند کے جادو سے بے ہوش تھے۔ تمباکو پھانک کر ممانی دبے پاؤں باہر نکل آئیں۔۔۔ یہاں سے وہاں تک سب لوگ سو رہے تھے۔ تار کے پاس پہرہ دینے والے پولیس والے تک سو گئے تھے۔۔۔ صرف چاند جاگ رہا تھا! وہ ایک دو منٹ خاموش کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں۔ پھر اندر لوٹ آئیں، وہ ایک منٹ بستر پر بیٹھی رہیں، پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے لیٹ گئیں، ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی بتی نیچے کھسکائی اور چادر کو جھٹکار کے اوڑھ ہی رہی تھیں کہ ایکدم چونک پڑیں: "نوری۔۔۔ اے نوری۔۔۔ اٹھ تو سہی۔۔۔ یہ دھماکے کی آواز کیسی تھی؟"

نوری ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی: "کیسا دھماکہ ممانی؟"

"جانے کیسا تھا۔ ایسا لگے ہے کوئی بڑے اونچے سے کودا۔"

"محمود بھیا کو آواز دوں؟" مرشدہ آپا نے کہا۔

"ارے وہ تو گھوڑے بیچ کے سو رہے ہے! اس کے تو سرہانے ڈھول بھی بجیں تو خبر نہ ہو۔۔۔ منوہر کو پکارو۔" پھر بولیں: "دیکھو سن، کیا ابھی کی بھی کوئی آواز آ رہی ہے۔۔۔ کہ کیا معاملہ ہے! یا اللہ خیر کیجیو۔۔۔ منوہر۔۔۔ اے منوہر بھیئے!" وہ گھبرا کے خود ہی چلا پڑیں۔ ممانی کی آواز سے اللہ دیئے کی آنکھ کھل گئی: "اجی کیا بات ہے؟" وہ وہیں سے چلا پڑا "اجی کیا بات ہے؟"

"بیٹے۔۔۔ ذرا اٹھ کے دیکھ تو، میں نے کسی کے گرنے کی آواز سنی۔ جیسے کوئی اونچے سے دھم سے گرا۔"

"کدھر سے آئی آواز؟"

"ادھر ہی۔۔۔ تار کی طرف سے۔"

اللہ دیئے کی نظریں فوراً تار کی طرف مڑ گئیں اور اس نے دیکھا کہ بڑا ملجگا سا اندھیرے میں دھیرے دھیرے تار کی طرف بڑھ رہا ہے اور کوئی اسے کھینچ

سے بچھائے گھسٹ رہا ہے اور ہر لمحہ کراہنے کی آواز بڑھتی جا رہی ہے۔ اللہ دیا پاگلوں کی طرح مجو شاہ کا بستر ٹٹولنے لگا۔ بستر خالی تھا۔ صرف وہ گٹھڑا کھلی پڑی تھی جو مجو شاہ رات کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ مجلس کے حصہ کی پڑیا ویسی ہی رکھی تھی! اللہ دیا ایکدم چیختا ہوا تار کی طرف بھاگا: "محمود — اشرف — نورا — دوڑیو — معجزہ ہوا — تار کٹ گیا تھا"

ایک دم سے ساری لالٹینیں جل اٹھیں، سب دوڑنے لگے — جب اللہ دیا سب سے آگے دوڑتا ہوا تار کے پاس پہنچا تو مجو شاہ علم لئے تار سے چار پانچ قدم آگے بڑھ چکے تھے! پولیس والوں کے چند سپاہی بھونچک آس پاس کھڑے منہ کھولے ان کو تکے جا رہے تھے اور اللہ دیئے کو دیکھتے ہی مجو شاہ نے ایک کراہ کی آواز بلند کی اور پھر زور سے بولے: "اللہ دیئے! علم کو سنبھال۔ گرنے نہ پائے!"

اللہ دیئے نے ایک ہاتھ سے علم کو پکڑ لیا اور دوسرے سے مجو شاہ کو سہارا دے ہی رہا تھا کہ اور لوگ آپہنچے اور انہوں نے علم کو تھام لیا۔ اللہ دیئے نے مجو شاہ کو سیدھا کیا۔ ان کے منہ سے خون جاری تھا — سانس اکھڑ چلی تھی۔ اللہ دیئے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور دھیمے سے بولے: "اللہ دیئے — تو نے دیکھ لیا — معجزہ پروردگار کا" پھر ان کی آواز دھیمے دھیمے رکتی گئی: "معجزہ — معجزہ — معجزہ پروردگار کا — شکر پالنہار کا —"

بقیہ "بوائے" سلسلہ صفحہ ۶۲ سے آگے

"یس سر"۔
"ون بڑا پیگ وہسکی اینڈ سوڈا"
"یس سر"
"چکن الا کیف"
"یس سر"
"بوائے کتنی دیر لگاتے ہو تم؟"
"بوائے آر یو سلیپنگ؟"
"بوائے پانی لاؤ جلدی جلدی"
"تم لوگ سوتے رہتے ہو کیا؟"
"مجھے تمہاری رپورٹ کرنی پڑے گی......"
"یس سر! یس سر! یس سر!!"

"معاف کرنا بڑے میاں" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور بوڑھے ویٹر کو حیران اور ششدر چھوڑ کر وہ ریستوراں کے سمندر میں خالی میزوں کے جزیروں کے درمیان راستہ بناتا ہوا دروازہ سے باہر نکل گیا۔
مگر جب بوڑھے ویٹر نے میز پر سے مینو کارڈ اٹھایا تو دیکھا وہاں ایک روپیہ "ٹپ" پڑا ہوا ہے۔ اور اس نے سوچا — "نہ جانے کیسے کیسے لوگ اس ریستوراں میں آتے ہیں........"

تاریخ صحافتِ اُردو ـــــ مصنّف :- امداد صابری ۔ قیمت :- تین روپے ۔ ناشر :- امداد صابری چوڑی والان دہلی ۔

آج تک اُردو ادب میں نثر و نظم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اُردو ادب کی بہت سی مستند اور جامع تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن صحافتِ اُردو پر سوائے چند مضامین کے اور کچھ نہیں لکھا گیا تھا اور یہ مضامین بھی بہت سے تشنہ بھی تھے ۔ اس کتاب کی اشد ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ جو اُردو صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ۔ امداد صابری صاحب کی یہ پہلی کوشش ہے جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ (ا) ہندوستان کے زمانہ قدیم سے عہدِ مغلیہ تک کا صحافتی دَور (ب) غدر سے قبل اور بعد کے اخبارات ۔

مصنّف نے زمانہ قدیم یعنی ہندو دَور اور اس کے بعد کے عہد کی خبر رسانی کے ذرائع پر اس زمانے کی تاریخی کتابوں سے کافی روشنی ڈالی ہے ۔ لیکن اس پورے دَور کو اور عہد کے دَور کو کچھ گڈمڈ کر دیا ہے ۔ بہتر ہوتا کہ اس باب کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا جاتا ۔ جبکہ مغلیہ عہد کی تاریخی کتابیں کافی معیار ثابت ہو سکتی تھیں ۔

غدر اور غدر کے بعد کی صحافتی تاریخ کافی محنت سے لکھی گئی ہے اور واقعات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے ۔ جن سے کافی صحافتی مواد ملتا ہے ۔ اخبارات کے نام ، تاریخ اجراء کب بند ہوا ایڈیٹروں کے حالاتِ زندگی اور علمی و صحافتی کارنامے بھی درج کئے گئے ہیں ۔ اخبارات سے ایسے اقتباسات بھی درج ہیں جو اپنے دَور کے تاریخی حالات کی غمازی کرتے ہیں ۔

امداد صابری نے یہ کتاب لکھ کر اُردو ادب کے لئے ایک نیک کام کیا ہے ۔ کتاب کا مطالعہ اُردو ادب اور تاریخ جاننے والے کے لئے از حد ضروری ہے ۔

مشتر فتحپوری

ہفتہ میں ناگری لکھاوٹ ـــــ مصنّف :- شری پاد جوشی ۔ قیمت چار آنے ۔ ناشر :- ہندوستانی پرچار سبھا ۔ وردھا ۔

کتاب کی خوبی کتاب کے نام سے ظاہر ہے ۔ یہ کتاب ان اصحاب کے لئے کافی مفید ثابت ہو سکتی ہے ۔ جو صرف اُردو لکھاوٹ جانتے ہیں اور ہندی پڑھنے لکھنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ مصنّف نے ناگری لکھاوٹ کی علامتوں کو اُردو لکھاوٹ کی علامتوں سے ظاہر کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم ان علامتوں سے ہندی لکھنا کس طرح سیکھ سکتے ہیں ہندی حروف اور اُردو حروف کے تلفظ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور لکھنے کے ڈھنگ کو واضح کیا ہے ۔

یہ کتاب اُن لوگوں کے لئے کافی مددگار ثابت ہو سکتی ہے جو ہندی پڑھنا لکھنا چاہتے ہیں ۔ شری پاد جوشی نے یہ کتاب لکھ کر ہندی سیکھنے کی مشکل کو کافی حد تک آسان کر دیا ہے ۔

کتاب ٹائپ حروف میں ہے ۔ اور طباعت اچھی ہے ۔ اُمید ہے کتاب اُردو جاننے والوں کی ناگری سیکھنے میں یقیناً مدد کرے گی ۔

مشتر فتحپوری

لال کتاب ۔ (مشرقِ وسطیٰ کی شاہکار کہانیاں) ـــــ مترجم :- ضیاء الحسن موسوی ۔ قیمت عہ ۔ صفحات ۱۱۲ ۔ ناشر مرکزِ ادب بشن روڈ کراچی ۔

وہ تین ۔ (بنگالی کہانیاں) ۔ ـــــ مترجم یونس احمر ۔ قیمت عہ ۔ صفحات ۱۱۲ ۔ ناشر مرکزِ ادب مشن روڈ کراچی ۔ (پاکستان)

اُردو ادب میں تراجم کی اہمیت کو کم محسوس کیا گیا ہے اور طبع زاد افسانوں کے مقابلہ میں تراجم کی قدر کو کم تسلیم کیا گیا ہے ۔ حالانکہ اچھے مترجم کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ نہ صرف یہ کہ اُسے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہو جس زبان سے اور جس زبان میں وہ ترجمہ کر رہا ہے ۔ بلکہ اُس کی نظر ناقدانہ ہو ۔ کیونکہ اُسے بے شمار افسانوں میں سے بہتر اور نمائندہ افسانے کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو بغیر ناقدانہ نقطۂ نظر کے ممکن نہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں تخلیقی قوت بھی ہو ۔ جو ترجمے کے لئے اشد ضروری ہے ۔ حالانکہ طبع زاد کہانی پر مترجم کے ۔ بلکہ کچھ فوقیت دی جانی چاہیئے ۔ ہمارے ادب میں کئی زبانوں کے تراجم موجود ہیں ۔ خصوصاً مغربی ممالک کا ادب انگریزی زبان کے ذریعہ بہت حد تک ہمارے ہاں تراجم کی صورت میں موجود ہے ۔ اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے قریبی ممالک کے ادب کے ترجمے بھی اُردو میں پیش کئے جائیں ۔

لال کتاب کے ذریعہ ضیاء الحسن موسوی نے مشرقِ وسطیٰ کے چند منتخب شاہکار افسانوں کو ترجمہ کر کے ہم تک پہنچایا ہے ۔ یہ نظر اس لئے مشرقِ وسطیٰ کے ادبیات کے جدید

رجحانات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ موجودہ عربی ادب کے موضوع اور ہیئت کو سمجھنے کے لئے لال کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ مترجم نے ان افسانوں کو اُردو زبان میں پیش کرنے کا قابلِ تحسین فرض سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے ادیب جاگیردارانہ نظام کی اقدار اور سماجی رشتوں کے خلاف ادب اور زندگی کے جدید رجحانات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ترجمہ سادہ اور سلیس زبان میں کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی خاص کہانی کہیں خواب میں ہنوز ڈاکٹر عبدالسلام عجیلی اور لبنانی کہانی لال کتاب۔ سعید تقی الدین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ لال کتاب میں محمد حسن عسکری کا حرفِ اول اور اختر انصاری اکبرآبادی کا حرفِ آخر شامل ہے۔

وہ تین بنگالی افسانوں کے تراجم پر مشتمل ہے جسے یونس احمر نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یونس احمر کافی عرصہ سے بنگالی ادب کے نمائندہ افسانوں کو اُردو میں پیش کر رہے ہیں اور کچھ ایسا گمان ہونے لگا کہ یہ افسانے اُردو ادب کا ہی حصّہ ہیں۔ طبع زاد افسانے لکھنے کے باعث یونس احمر کے تراجم میں اصل کا گمان ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں جدید بنگالی افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے شامل ہیں یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ اس مجموعہ کے افسانے ان کے شاہکار افسانے ہیں مگر یہ بات صحیح ہے کہ زیرِ نظر افسانے ان کے اچھے افسانوں میں شامل کئے گئے ہیں۔ سمیند بوس، جن کی ادبی نشو و نما میں بنگالی ادب کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کا مطالعہ اُردو ادب کی ترقی کے لئے مدد ثابت ہوگا۔ ادب کو ترقی پسند رجحانات کی پختگی غالباً سب سے زیادہ بنگالی ادب میں موجود ہے۔ جس کا اندازہ "وہ تین" پڑھنے کے بعد بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس مجموعہ کے "وہ تین" بیجات کے بعد اور اٹھارہ سال پہلے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "وہ تین" میں کتاب کی غلطیاں اگر نہ ہوتیں تو پڑھنے والے کی الجھن بہت حد تک دُور ہو جاتی۔

دلیپ تندراستر

ہیروئن کی تلاش۔ مصنف۔ پروفیسر محمد مجیب۔ قیمت دس آنے۔ ناشر مکتبہ جامعہ دہلی

اُردو ادب میں صنفِ ڈراما ابھی زیادہ سے زیادہ ہماری توجہ اور دلچسپی کا محتاج ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے "ہیروئن کی تلاش" ڈراما لکھ کر جس توجہ اور دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ کہاں تک اس کا حق ادا ہوا ہے اس کا اندازہ کتاب پڑھنے ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ ایک شخص جیوتی پرکاش نے ایک ڈراما لکھ مارا ہے جس میں روپ متی کا پارٹ ادا کرنے کے لئے ایک ایکٹریس کی تلاش ہے۔

اس پورے ڈرامے میں اس Suspense اور Conflict کا کہیں پتہ نہیں ہے جس کا ذکر ڈرامے کے آغاز میں کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سارا ڈراما اس موضوع پر ایک سطحی اور انتہا مباحثہ بن جاتا ہے۔ جتنے کردار اسٹیج پر آتے ہیں کاٹھ کے پتلے معلوم ہوتے ہیں اور طوطے کی طرح چند جملوں کی رٹ لگا کر اپنا اثر چھوڑے بغیر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ڈرامے میں حرکت نہیں ہے۔ کردار سماجی حقیقتوں کے پس منظر میں سامنے نہیں آتے۔ اس لئے وہ ہیجانی عمل سے محروم رہتے ہیں اور جیسے پیدا ہوتے ہیں ویسے ہی جاتے ہیں۔ ڈرامے میں تضاد کردار جب تک نظریاتی یا عملی طور پر ایک دوسرے پر وار نہ کریں (کبھی چھپ کر کبھی سامنے آ کر) اس وقت تک ڈرامے میں زندگی پیدا نہیں ہوتی اور نہ واقعات کا ایسا سلسلہ بندھتا ہے جو Suspense پیدا ہو اور ڈرامے میں کشش اور دلچسپی پیدا ہو۔ یہ عنصر "ہیروئن کی تلاش" میں قطعی مفقود ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ڈراما کسی سنجیدہ افادی مقصد کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے۔ مسز ہیرا اور جیوتی پرکاش کی بات چیت سے ڈرامے کے داخلی رجحان کا علم آسانی سے ہو جاتا ہے اس میں غلط عقیدوں پر نظریات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ زندگی میں Suspense پیدا ہوتی ہے Values سے "۔ ناقابلِ اثبات ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم وغیرہ پر بھی غلط اور متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔

ڈراما مجموعی طور پر افادی نقطۂ نظر سے کمزور ہے اور افادی مقصد پورا نہیں کرتا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اسٹیج پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ امید ہے کہ لوگ اسٹیج پر زندگی کو شامل کر کے آئندہ ایک جاندار ڈراما پیش کریں گے اور اس طرح اس صنفِ ادب کو سمجھیں گے۔

انور عظیم

ہمارا کتاب خانہ

ادبیات :-

کتاب	مصنف	قیمت
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	۱۰/-
ترقی پسند ادب	سردار جعفری	۷/-
باغ و بہار (قصہ چہار درویش)	میر امن دہلوی	۲/۴/-
آرائش محفل	شیر علی افسوس	۲/۸/-
۱۹۴۹ء کا بہترین ادب	مرتبہ غلام ربانی تاباں وغیرہ	۴/-
۱۹۵۰ء 〃 〃	مرتبہ سردار جعفری وغیرہ	۵/-
۱۹۵۱ء 〃 〃	ممتاز حسین سردار جعفری	۵/۸/-
گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی	۲/۴/-
افادی ادب	اختر انصاری	۱/۴/-
کلاسیکی ادب	خواجہ احمد فاروقی	۲/۸/-
داستان امیر حمزہ		۳/-
الف لیلہ		۳/-
فسانۂ عجائب		-/۱۵/-
سیر کہسار	رتن ناتھ سرشار	۶/-
فسانۂ آزاد مکمل (چار جلد)	〃	۲۵/-
فسانۂ عجائب	〃	۱/۸/-

سیاسیات :-

کتاب	مصنف	قیمت
ریاست اور انقلاب	لینن	۲/-
جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات	اسرار احمد آزاد	۹/-
شہنشاہیت	مظفر شاہ خاں	۲/-
سرمایہ	م۔ م۔ جوہر	۱/۸
ہندوستان اور آزادی	مسٹر ایمری	۱/۸
امریکی سفارت خانے		۲/-
سماج کا ارتقاء (دو حصے)	کلیم اللہ	۲/۸
سوشلزم	اینگلز	۱/۴
تعمیری پروگرام	مہاتما گاندھی	-/۸/-
تعلیم عامہ		-/۳/-
آنکھوں دیکھا روس		-/۶/-
سوویت یونین سوال و جواب		-/۱۲/-
یوسف استالن		-/۹/-
انقلاب روس	ظ۔ انصاری	۳/-
لینن گراد سے سمرقند	عشرت علی صدیقی	۱/۸/-

کتاب	مصنف	قیمت
ڈگمگاتی دنیا	پنڈت جواہر لال نہرو	۳/-/-
سوویت روس	〃	۱/۱۲/-
نیا ہندوستان (مکمل)	رجنی پام دت	۶/-
مکمل تاریخ آزاد ہند فوج	اسرار احمد آزاد	۵/-
دنیا کی کہانی	پروفیسر محمد مجیب	۲/۸/-
آزاد پختونستان		۱/۱۲/-

ناول :-

کتاب	مصنف	قیمت
طوفان کی کلیاں	کرشن چندر	۲/۴/-
باپ بیٹے	ترجمہ انور عظیم	۵/-
میدان عمل	پریم چند	۶/-
بیوہ	〃	۱/۸/-
پیاری زمین	پرل بک	۲/۶/-
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۲/-
طوفان	شنکر	۳/-
گورا	〃	۲/-
جیون پربھات	〃	۳/-
چندر ناتھ	سرت چندر چیٹرجی	۱/۸/-
دور ہے منزل تیری	〃	۲/۸/-
گھر کی آگ	〃	۲/-
حسرت	〃	۲/-
سماج کا ڈر	〃	۲/۴
رادھا رانی	بنکم چندر چیٹرجی	۱/-
لوک رہسیہ	〃	۱/۴/-
چندر شیکھر	〃	۳/-
راج سنگھ	〃	۲/۸/-
اندرا	〃	۱/۸/-
زہر کا پودا	〃	۲/۸/-
آنند مٹھ	〃	۲/۸/-
جب کھیت جاگے	کرشن چندر	۲/۱۵/-
سپہ سالار سنگھ	راہول	۲/۸/-
شمع	اے۔ آر۔ خاتون	۹/-
تصویر	〃	۴/-
افشاں	〃	۶/۸
ضدی	عصمت چغتائی	۲/-
چوٹیں	〃	۳/-
بھوک	ترجمہ محمود جالندھری	۳/۸
آخری سلام	کرسٹوفر اشروڈ	۴/۸
مرمر اور خون	عزیز احمد	۱/۸
لرزتے آنسو	عادل رشید	۳/-
جب محبت جاگتی ہے	〃	۴/-
عشق پر زور نہیں	〃	۳/۸
آنسو	جمنا داس اختر	۲/۱۲/-
آگ	〃	۱/۱۲/-
بردہ فروش	〃	۱/۱۲/-
جلن	〃	۲/-
گرمی	〃	۲/-
پائل	〃	۳/۸
اور خدا دیکھتا رہا	〃	۲/-
کشمیری بیٹی	〃	۳/-
چندر کلا	〃	۲/-
رادھا الزبتھ	〃	۲/۴/-
انور	فیاض علی	۶/۸
شمیم	〃	۶/۸
خانم	عظیم بیگ چغتائی	۴/-
خاک پروانہ	پریم چند	۲/۴
نرگس	ایم۔ اسلم	۲/۸
آتش خاموش	صالحہ عابد حسین	۵/-
بیوی	شوکت تھانوی	۲/۱۲/-
غزالہ	〃	۵/-
جوڑ توڑ	〃	۴/-
انشاء اللہ	〃	۳/-
آزادی کے بعد	ہاورڈ فاسٹ	۵/۸/-

مکتبہ شاہراہ دہلی ۶

کتاب	مصنف	قیمت
ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ	ایل اسٹونس	۱/۱۲/-
چینی گاؤں	شیئن جی	۳/۱۲/-
سیب کا درخت	گالز وردی	۱/-
قومی	محمد احسن فاروقی	۲/۸/-
میری بھابی	پروفیسر محمد مجیب احمد	۲/۸/-
باپ بیٹے	ترجمہ محمود جالندھری	۱/۸/-
تنہائی کا کنواں	"	۱/۸/-
تاجکر	ترجمہ نذر الاسلام	۲/-
نجم السحر	نسیم انہونوی	۵/-
کہکشاں	"	۵/-
انوکھی کہانی	"	۲/-
طرز زندگی	"	۲/۸
شبنم	"	۲/-
شگفتہ	"	۲/-
اڑن طشتری	خان محبوب طرزی	۲/۸/-
دو دیوانے	"	۲/۸/-
سیتی	"	۲/-
زبیدہ	"	۲/۸/-
برق تبسم	شوکت تھانوی	۲/-
مسکراہٹیں	"	۱/۸/-
گرگٹ	"	۱/۸/-
شیطان کی ڈائری	"	۱/۸/-
انشا	رئیس احمد جعفری	۲/-
درد	"	۱/۸
جواری	"	۱/-
طوفان	"	۲/۸/-
تماشا	"	۲/۸/-
اغوا	کوثر چاندپوری	۳/-
جلن	کرشن گوپال عابد	۲/-
پریڈ گراؤنڈ	ہنس راج رہبر	۲/۴

افسانے :-

کتاب	مصنف	قیمت
شہر کے سائے تلے	ٹیگور	۱/۸/-
ٹیگور کی کہانیاں	"	۱/۸/-
گورڈنر	"	۲/۸/-
اسرتیں	"	-/۱۲/-
منوا ایک کہانی ہے	"	-/۱۲/-
شعلۂ امن	ٹیگور	-/۱۲/-
خونی سماج	"	-/۱۲/-
وطن پرست	"	-/۱۲/-
آزادی کا دیوتا	"	-/۱۲/-
نجات	"	-/۱۲/-
شعلۂ آب	"	-/۱۲/-
سنگ [illegible]	[illegible]	-/۱۲/-
شعلۂ الفت	[illegible]	-/۱۲/-
بھولا ناتھ		-/۱۲/-
راز دروازہ	"	-/۱۲/-
میرا بہترین افسانہ	محمد حسن عسکری	۲/-
قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے	"	۲/-
چغد	سعادت حسن منٹو	۳/-
خالی بوتلیں خالی ڈبے	"	۳/-
سیاہ حاشیے	"	۲/-
لذت سنگ	"	۲/-
بادشاہت کا خاتمہ	"	۳/-
دھواں	"	۳/-
مینا بازار	"	۲/۴/-
سڑک کے کنارے	"	۲/-
پردے کے پیچھے	"	۲/۸/-
منٹو کے فحش افسانے	"	۲/۸/-
ریزہ و مینا	شاہد احمد	۵/-
جب بندھن ٹوٹے	تاجور سامری	۳/-
سحر بنگال	طاہرہ دیوی شیرازی	۲/-
ہم لوگ	ہنس راج رہبر	۲/۸/-
گیت اور انگارے	ویندر اسر	۲/-
بال و پر	کنہیا لال کپور	۲/۸/-

نظم :-

کتاب	مصنف	قیمت
مکمل شرح دیوان غالب	عبدالباری آسی	۳/۸/-
شرح دیوان غالب	جوش ملسیانی	۵/-
بانگ درا	اقبال	۴/۸/-
بال جبریل	"	۴/۸/-
ضرب کلیم	اقبال	۲/۸/-
ارمغان حجاز	"	۲/۸/-
شرح بانگ درا		۲/۸/-
مسدس حالی	حالی	-/۸/-
لسان العصر	ملا واحدی	۳/-
دیوان ذوق		۲/-
دیوان خواجہ میر درد		۱/۸/-
دیوان اثر	مرتبہ عبدالحق	۱/۸/-
دیوان تاباں	"	۲/-
کلیات نظیر اکبر آبادی		-/۱۲/-
نئی دنیا کو سلام	سردار جعفری	۳/-
پتھر کی دیوار	"	۲/۸
امن کا ستارہ	"	۱/۴
دست صبا	فیض احمد فیض	۲/۴
جنگ و آہنگ	عرش ملسیانی	۲/-
شکست زنداں	غلام ربانی تاباں	۳/-
فروزاں	معین احسن جذبی	۳/-
آہنگ	مجاز لکھنوی	۲/۸/-
جرس	وامق جونپوری	۳/۴/-
پشتو لوک گیت	فارغ بخاری	۲/۸/-
شاہنامۂ اسلام مکمل	حفیظ جالندھری	۸/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۳/۸/-
شعلۂ طور	جگر مراد آبادی	۵/-
ستاروں سے ذروں تک	جگن ناتھ آزاد	۲/۱۲/-
الاؤ	نریش کمار شاد	۲/۴/-
چراغ طور	بہزاد لکھنوی	۱/۸/-
موج نور	"	۱/۴/-
موج طہور	"	۱/۸/-
رقص دوام	صفیر احمد صوفی	۱/۱۲/-
میراجی کی نظمیں	میراجی	۲/۸/-
تغیر زندگی	سیفی	۱/۸/-
رباعیات انیس	انیس	۲/۸/-
رباعیات آسی	آسی	۱/۸/-
رباعیات عمر خیام	"	-/۱۲/-
مثنوی میر حسن	شمس الحق	۱/۸/-
مثنوی گلزار نسیم		-/۱۲/-
ہماری شاعری	پروفیسر مسعود حسین رضوی	۴/-

پتہ

مکتبہ شاہراہ دہلی ۶

PLUS A
LITTLE EXTRA
مزید طاقت
جن لوگوں کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں نمایاں حصہ لینا پڑتا ہے۔ انھیں عام انسانوں سے زیادہ اپنی طاقت کو بحال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھی صحت مند غذا کے ساتھ ساتھ اگر وہ شباب آور کا استعمال بھی کریں۔ تو یہ نہ صرف ان کی کھوئی ہوئی طاقت کو بحال کریگا۔ بلکہ جسم میں نئی طاقت اور نئی اُمنگ بھی پیدا کریگا۔
شباب آور
نہ صرف ایک زبردست ٹانک ہے۔ بلکہ ایک بہترین خوراک بھی ہے۔ معدہ میں داخل ہوتے ہی یہ نہ صرف نڈھال اعضا میں جوانی کی نئی اُمنگ پیدا کرتا ہے۔ بلکہ دل و دماغ اور جگر کی کمزوریاں بھی مستقل طور پر اس سے دور ہوجاتی ہیں۔ قیمت پانچ روپے
جوانی قائم رکھنے کے لئے رسالہ ہمدردِ نوجوان اور ہمدردِ شباب مفت طلب فرمائیں
ہمدرد دواخانہ۔ دہلی

Regd No. P-164

(ناول) قیمت چار روپے چار آنے